حسن بن صباح تو بھیس بدل کر نکل گیا لیکن وہ لڑکی جسے وہ اپنے ساتھ مرو سے لایا تھا اور سب کو بتایا کہ یہ اُس کی بہن ہے اور اس کا نام فاطمہ رکھا تھا' وہ ایک بڑے ہی بے رحم شکنجے میں آ گئی تھی۔ سلطان ملک شاہ نے اسے بھی حسن بن صباح کے ساتھ اپنے دارالسلطنت سے نکال دیا تھا۔ حسن بن صباح تو وہاں وزیرِاعظم بننے گیا تھا اور اس لڑکی کو اس نے اس مقصد کے لئے استعمال کیا تھا لیکن اسی لڑکی کی زبان نے اُس کا وزیرِاعظم بننے کا خواب چکنا چور کر دیا۔

اس لڑکی کا اصل نام شمونہ تھا — احمد بن عطاش کے آدمیوں نے ایک قافلہ لوٹا تھا اور دیگر مال و دولت کے ساتھ چند ایک لڑکیوں کو بھی پکڑ لائے تھے جن میں تین چار گیارہ سے چودہ سال عمر تک کی تھیں۔ انہیں شاہ در لے آئے تھے جہاں انہیں شہزادیوں کی طرح رکھا گیا اور انہیں اپنے مذموم مقاصد کے مطابق تربیت دی گئی تھی۔ انہیں بڑی محنت سے یہ تربیت دی گئی تھی کہ جس آدمی سے کام نکلوانا ہو اُس کے لئے کس طرح ایک بڑا ہی حسین سراب بنا جاتا ہے۔ انہیں ذہن نشین کرایا گیا تھا کہ اپنے جسموں کو کس طرح بچا کر رکھنا اور اپنے جال میں پھانسے ہوئے آدمی پر نشہ بن کر طاری ہو جانا ہے۔

شمونہ انہی لڑکیوں میں سے تھی۔ وہ بارہ تیرہ سال کی عمر میں قافلے سے اغوا ہوئی تھی۔ اب اُس کی عمر بیس سال سے تجاوز کر گئی تھی۔ اُس نے کامیابی سے سلطان ملک شاہ کے مشیرِ خاص احتشام مدنی کو مسحور کر لیا تھا۔ یہ اُس کا پہلا شکار تھا۔ وہ اس معزز اور باوقار شخصیت پر طلسم ہوشربا بن کر طاری ہو گئی اور اپنا دامن بھی بچا کے رکھا تھا لیکن حسن بن صباح نے یہ نہیں سوچا تھا کہ یہ نازک اندام لڑکی ہے' ایک جابر سلطان کو انگلیوں پر نچا سکتی ہے مگر یہی انگلیاں جابر سلطان کے شکنجے میں آ گئیں تو یہ ایک لمحے کے لئے بھی برداشت نہیں کرے گی اور تمام راز اُگل دے گی۔

حسن بن صباح اتنا کچا آدمی نہیں تھا کہ اُسے یہ احساس بھی نہ ہوتا کہ کمزور دل لڑکی ایذا رسانی برداشت نہیں کر سکے گی۔ وہ بے رحم انسان تھا۔ اُس کے جذبات اتنے نازک اور رومانی نہیں تھے کہ کسی کو اذیت میں دیکھ کر اُس کے دل میں ہمدردی پیدا ہوتی۔ اُس نے شمونہ جیسی ہر لڑکی کو اور اپنے گروہ کے تمام آدمیوں کو بتا رکھا تھا کہ اپنی جان دے دینا راز نہ دینا۔ اگر راز دے کر آؤ گے تو اس کے عوض تمہاری جان لے لی جائے گی'

حسن بن صباح نے شمونہ کی جان اپنے ہاتھوں لینی تھی لیکن اُسے مہلت نہ ملی۔ امیرِ شہر ابو مسلم رازی کے حکم سے کوتوالی کے آدمیوں نے چھاپہ مارا۔ اگر اُسے پہلے اطلاع نہ مل چکی ہوتی تو وہ گرفتار ہو جاتا۔ وہ بروقت فرار ہو گیا تھا لیکن شمونہ کی قسمت کا فیصلہ سنا گیا تھا۔

"اس بدبخت لڑکی نے تھوڑا سا نقصان نہیں پہنچایا" — اُس نے فرار سے کچھ دیر پہلے اپنے دو خاص مصاحبوں سے کہا تھا — "اسے خلجان پہنچا دینا۔ میں وہاں پہنچ چکا ہوں گا۔ اسے میں تمام لڑکیوں کے سامنے ایسی بُری موت دوں گا جو ان لڑکیوں کے لئے باعثِ عبرت ہو گی۔ لڑکیوں کو بتاؤں گا کہ اس کا جرم کیا ہے۔ اسے ابھی کسی گھر میں قید میں رکھو۔ پانچ چھ دنوں بعد اسے یہاں سے نکالنا۔ ابھی کوتوال کے جاسوس میرے گھر کے اردگرد گھوم پھر رہے ہوں گے..... اگر یہ لڑکی اپنا حوصلہ ذرا مضبوط رکھتی تو میں وزیرِاعظم بن جاتا"۔

شمونہ کو انہی آدمیوں میں ایک کے گھر رکھا گیا اور اسے کہا گیا کہ وہ باہر نہ نکلے اور چھت پر بھی نہ جائے۔ اُسے وجہ یہ بتائی گئی کہ امیرِ شہر نے اُس کی اور حسن بن صباح کی گرفتاری کا حکم دے رکھا ہے۔

○

شمونہ کو ذرا سا بھی شبہ نہ ہوا کہ اُس کی زندگی کے دن گنے جا چکے ہیں۔ وہ اپنے آپ کو اس گھر میں مہمان سمجھنے لگی۔ اُس کے ساتھ بڑے ہی معزز مہمانوں جیسا سلوک روا رکھا گیا اور اُسے الگ کمرہ دے دیا گیا۔ اُسے معلوم نہیں تھا کہ وہ اس کمرے کی قیدی اور چند دنوں کی مہمان ہے۔

اس گھر میں ایک آدمی اور اُس کی دو بیویاں تھیں اور ایک ادھیڑ عمر نوکرانی تھی۔ شام کے کھانے کے بعد شمونہ اپنے کمرے میں چلی گئی۔ گھر کا آدمی ایک بیوی کو ساتھ لے کر اپنے کمرے میں چلا گیا۔ کچھ دیر بعد دوسری بیوی شمونہ کے کمرے میں چلی گئی۔ اُس نے پوچھا کہ مرو میں کیا ہوا تھا..... شمونہ نے اسے سارا واقعہ سنا دیا۔

"کیا تمہارے آقا نے تمہیں معاف کر دیا ہے؟" — عورت نے پوچھا۔

"میں کچھ نہیں کہہ سکتی" — شمونہ نے کہا — "یہ بتا سکتی ہوں کہ اُس نے مرو سے یہاں تک میرے ساتھ کوئی بات نہیں کی۔ صرف ایک بار اُس نے کہا تھا کہ تم نے

میرا ہی نہیں اپنی جماعت کا مستقبل تباہ کر رہا ہے..... میں نے اُسے پہلے بھی کہا تھا' ایک بار پھر کہا کہ میں مجبور ہو گئی تھی" — اُس نے اپنے ایک ہاتھ کی انگلیاں دکھا کر کہا —

"یہ نشان دیکھو۔ یہ انگلیاں لوہے کے شکنجے میں جکڑ دی گئی تھیں اور شکنجہ آہستہ آہستہ بند کیا جا رہا تھا۔ میری انگلیوں کی ہڈیاں چٹخنے اور پھر ٹوٹنے لگی تھیں۔ شکنجے کو اور زیادہ کسا جا رہا تھا اور مجھ پر غشی طاری ہو رہی تھی....."

"اب میری سُن لڑکی!" — عورت نے کہا — "آگے مت سنا۔ میں تیرے درد کو اپنے دل میں محسوس کرتی ہوں..... تُو اپنے ماں باپ کے پاس کیوں نہیں جاتی؟"

"کہاں ہیں وہ؟" — شمونہ نے کہا — "کون ہیں وہ؟..... مجھے یاد نہیں۔ خواب کی طرح یاد ہے کہ ایک قافلہ جا رہا تھا۔ اسے ڈاکوؤں نے روک کر لوٹ لیا تھا۔ میرے ماں باپ شاید مارے گئے تھے۔ وہ مجھے یاد نہیں آتے۔ یاد آئیں بھی تو مجھے ان کی جدائی کا ذرا سا بھی افسوس نہیں ہوتا۔ ان سے جدا ہوئے صدیاں تو نہیں گزریں' چھ سات سال ہی گزرے ہیں۔ مجھے ڈاکو اپنے ساتھ لے آئے تھے"۔

"تجھے معلوم نہیں" — عورت نے کہا — "تجھے ایسی چیزیں پلائی اور کھلائی جاتی رہی ہیں کہ تیرے دماغ سے خون کے رشتے دُھل گئے ہیں' اور میں جانتی ہوں تیری تربیت کس پیار سے ان لوگوں نے کی ہے۔ تُو نہیں جانتی"۔

یہ حسن بن صباح اور احمد بن عطاش کا وہ طریقۂ کار تھا جسے آج کی صدی میں برین واشنگ کا نام دیا گیا ہے۔

"تم اتنی دلچسپی سے یہ باتیں کیوں پوچھ رہی ہو؟" — شمونہ نے پوچھا — "کیا تمہیں مجھ سے ہمدردی ہے؟"

"ہاں لڑکی!" — عورت نے کہا — "مجھے تجھ سے ہمدردی ہے۔ میرا خاوند انہی لوگوں میں سے ہے۔ یہ لوگ میری چھوٹی بہن کو ورغلا کر لے گئے ہیں۔ بہت حسین لڑکی ہے۔ میں اُسے اس جال سے نہیں نکال سکی' تجھے نکال سکتی ہوں لیکن تُو اب ان لوگوں کے نہیں بلکہ موت کے جال میں آگئی ہے"۔

"موت کے جال میں؟"

"ہاں لڑکی!" — عورت نے کہا — "تیری زندگی چار نہیں تو پانچ دن رہ گئی ہے"۔

"یہ کیسے؟"

"حسن بن صباح کسی کو معاف نہیں کیا کرتا" — عورت نے کہا — "میں جانتی ہوں تُو نے کس مجبوری کے تحت راز مَرو کے کوتوال کو دے دیا تھا لیکن یہ لوگ کہتے ہیں کہ تجھے اپنی جان دے دینی چاہئے تھی' راز نہ دیتی۔ حسن بن صباح کہہ گیا ہے کہ تجھے الموت پہنچا دیا جائے۔ حسن بن صباح وہاں پہنچ جائے گا پھر تمہیں تم جیسی لڑکیوں کے سامنے بڑے ہی اذیت ناک طریقے سے قتل کیا جائے گا تاکہ لڑکیوں کو عبرت حاصل ہو"۔

شمونہ کو غشی آنے لگی۔

"میں ابھی مرنا نہیں چاہتی" — شمونہ نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا۔

"اور چاہتی میں بھی یہی ہوں کہ تُو زندہ رہے" — عورت نے کہا — "اگر میری یہ خواہش نہ ہوتی تو میں تمہارے پاس آتی ہی نہ"۔

"لیکن میں کروں کیا؟" — شمونہ نے پوچھا — "کہاں جا پناہ لوں"۔

"میں تمہیں یہاں سے نکال سکتی ہوں"۔

"کیا تم اس کی کچھ اُجرت لوگی؟"

"نہیں!" — عورت نے جواب دیا — "میرے لئے یہی اُجرت بڑی کافی ہوگی کہ تُو یہاں سے نکل جائے اور زندہ رہے۔ مجھ سے کچھ اور نہ پوچھنا' نہ کسی کو یہ بتانا کہ میں نے تمہیں یہاں سے نکالا ہے۔ صرف اتنا بتا دیتی ہوں کہ تجھے دیکھ کر مجھے اپنی بہن یاد آگئی ہے۔ تُو معصوم لڑکی ہے۔ خدا کرے تُو کسی گھر میں آباد ہو جائے"۔

"مجھے نکال تو دوگی" — شمونہ نے پوچھا — "میں جاؤں گی کہاں؟"

"رات ابھی زیادہ نہیں گزری" — عورت نے کہا — "میں تجھے راستہ بتا دوں گی۔ یہ راستہ تجھے امیرِ شہر ابو مسلم رازی کے گھر پہنچا دے گا۔ دروازے پر دستک دینا۔ دربان روکے تو کہنا کہ میں مظلوم لڑکی ہوں اور امیرِ شہر کے آگے فریاد کرنے آئی ہوں... تجھے کوئی نہیں روکے گا۔ امیرِ شہر خدا کا نیک بندہ ہے۔ وہ تجھے فوراً اندر بلا لے گا۔ اُسے ہر بات صحیح صحیح بتا دینا اور یہ مت کہنا کہ میں نے تجھے یہاں سے نکالا ہے' یہ کہنا کہ تو خود یہاں سے بھاگی ہے"۔

"پھر وہ کیا کرے گا؟"

نو! جو کچھ بھی کرے گا تیرے لئے اچھا ہی کرے گا؟" —— عورت نے کہا —— "ہو سکتا ہے وہ تجھے کسی نیک آدمی کے سپرد کر دے ..... میں تجھے میلی سی ایک چادر دیتی ہوں۔ اس میں اپنے آپ کو ڈھانپ لینا۔ کوئی آدمی آگے آجائے تو ذرا نہ جانا‘ بڑی دلیری سے چلتی جانا۔ تُو ہوشیار لڑکی ہے۔ تجھے تربیت بھی ایسی ہی دی گئی ہے۔ اس کے مطابق اپنی عقل استعمال کرنا۔ سب ٹھیک ہو جائے گا..... اٹھو"۔

○

اس عورت کا خاوند دوسرے کمرے میں گہری نیند سو گیا تھا۔ یہ لوگ شراب اور حشیش کے عادی تھے۔ ان میں نشے کی علت حسن بن صباح نے پیدا کی تھی۔ اس اتنی بڑی حویلی کا مالک اپنی ایک جواں سال بیوی کو ساتھ لئے‘ نشے میں بدمست حقیقی دنیا سے بے خبر سو گیا تھا۔

اسی حویلی کے ایک کمرے میں اُس کی پرانی بیوی شمونہ کو چادر میں لپیٹ کر حویلی کی ڈیوڑھی میں لے گئی تھی۔ شمونہ کو اُس نے امیرِ شہر کے گھر کا راستہ سمجھا دیا تھا۔ اُس نے شمونہ سے یہ بھی کہا تھا کہ وہ راستے سے بھٹک جائے تو کسی سے پوچھ لے۔ اُس نے شمونہ کو یقین دلایا تھا کہ ابو مسلم رازی سے لوگ اتنے ڈرتے ہیں کہ اکیلی دکیلی عورت پر کوئی ہاتھ نہیں اٹھا سکتا۔

اُس نے شمونہ کو حویلی سے نکال دیا۔ شمونہ گلی کا موڑ مڑ گئی تو اس عورت نے حویلی کا دروازہ بند کیا اور اپنے کمرے میں جا کر سو گئی۔ وہ مسرور اور مطمئن تھی کہ اُس نے ایک نوخیز لڑکی کو گناہوں کی بڑی ہی خطرناک دنیا سے نکال دیا تھا۔

شمونہ امیرِ شہر ابو مسلم رازی کے گھر تک پہنچ گئی۔ باہر دو دربان کھڑے تھے۔ انہوں نے اسے روکا اور پوچھا کہ وہ کون ہے اور کیوں آئی ہے۔

"مجھے فوراً امیرِ شہر تک پہنچا دو" —— شمونہ نے بڑی پختہ آواز میں کہا —— "دیر لگاؤ گے تو پچھتاؤ گے"۔

"آخر بات کیا ہے!" —— ایک دربان نے پوچھا۔

"انہیں اتنا ہی کہہ دو کہ ایک مظلوم لڑکی کہیں سے بھاگ کر آئی ہے" —— شمونہ نے کہا —— "اور یہ بھی کہنا کہ وہ راز کی ایک بات بتائے گی"۔

تاریخ بتاتی ہے کہ ابو مسلم رازی پکا مردِ مومن تھا۔ اسلام کے دینی نظریات اور

عقیدے جو رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اپنی اُمت کو دے گئے تھے‘ ان کی پاسبانی ابو مسلم رازی کی زندگی کا بہت بڑا نصب العین تھا۔ جس وقت شہر نیند کی آغوش میں مدہوش ہو گیا تھا‘ اُس وقت رازی دین کی ایک کتاب کھولے ہوئے مطالعہ میں مصروف تھا۔

دربان نے اُس کے کمرے کے دروازے پر ہلکی سی دستک دی۔ دربان کو ایسا ڈر نہیں تھا کہ امیرِ شہر خفا ہو گا اور اُسے ڈانٹے گا کہ رات کے اس وقت اُسے نہیں آنا چاہئے تھا۔ اُس نے حکمنامہ جاری کر رکھا تھا کہ کوئی مظلوم شخص رات کے کسی بھی وقت اُسے ملنے آئے تو اسے جگا لیا جائے۔ اُس رات دربان کی دستک پر اُس نے دربان کو اندر بلا لیا۔ دربان سے اس نے صرف یہ الفاظ سنے کہ ایک لڑکی آئی ہے تو اُس نے کہا کہ اسے فوراً اندر بھیج دو۔

چند لمحوں بعد ایک بڑی ہی حسین اور پُرکشش جسم والی نوخیز لڑکی اُس کے سامنے کھڑی تھی۔ ابو مسلم رازی نے اسے بٹھا لیا۔

"کیا ظلم ہُوا ہے تجھ پر جو تُو اس وقت میرے پاس آئی ہے؟" —— ابو مسلم رازی نے پوچھا۔

"بات ذرا لمبی ہے" —— شمونہ نے کہا —— "کیا امیرِ شہر کے دل میں اتنا درد ہے کہ اتنی لمبی بات سنے گا؟"

"ہاں لڑکی!" —— ابو مسلم رازی نے کہا —— "ہم دونوں کے درمیان اللہ کی ذات موجود ہے۔ میں اللہ کے ہاتھ میں پابند اور مجبور ہوں کہ اللہ کے ہر اُس بندے کی پوری بات سنوں جس پر ظلم کیا گیا ہے۔ تم بولو‘ میں سنوں گا..... امیرِ شہر نہیں سنے گا تو وہ اللہ کو کیا جواب دے گا"۔

"مجھے ڈاکوؤں نے تین چار سال پہلے ایک قافلے کو لوٹتے ہوئے میرے ماں باپ سے چھینا اور مجھے اغوا کر کے لے گئے تھے" —— شمونہ نے کہا —— "مجھ پر کوئی ظلم نہیں ہُوا‘ تشدد نہیں ہُوا‘ زیادتی نہیں ہوئی۔ ظلم یہ ہُوا ہے کہ مجھے یاد ہی نہیں رہا کہ میرے ماں باپ کون تھے۔ میں اغوا کے وقت دودھ پیتی بچی تو نہ تھی۔ مجھے اغوا کرنے والوں نے ایک خوبصورت فضا دی اور ایسے شاہانہ ماحول میں میری تربیت کی کہ میں شہزادی بن گئی لیکن یہ تربیت ویسی نہیں تھی جیسی بچوں کو دی جاتی ہے۔ میری ذات میں ابلیسی

اوصاف پیدا کئے گئے۔ ایسا نہیں ہوا کہ میرے آقا میرے جسم کے ساتھ کھیلتے رہے اور مجھے ہوس کاری کے لئے استعمال کرتے بلکہ انہوں نے تربیت یہ دی کہ اپنے جسم کو مردوں سے کس طرح بچا کر رکھنا ہے"۔

"کون ہے وہ؟" — ابو مسلم رازی نے پوچھا — "کہاں ہے وہ؟"

"کیا آپ نے حسن بن صباح کا نام نہیں سنا؟" — شمونہ نے کہا — "میں اس کے ساتھ سلطان ملک شاہ کے زیرِ سایہ رہ چکی ہوں"۔

"وہ گیا کہاں؟" — ابو مسلم رازی نے پوچھا۔

"یہ میں نہیں بتا سکتی" — شمونہ نے جواب دیا — "میں اپنے متعلق سب کچھ بتا سکتی ہوں"۔

شمونہ نے ابو مسلم رازی کو تفصیل سے بتایا کہ وہ کس طرح اغوا ہوئی تھی اور پھر اُسے پہلے شاہ در پھر خلجان لے جا کر کس طرح کی تربیت دی گئی تھی۔ یہ بھی بتایا کہ اُس جیسی اور لڑکیوں کو بھی اسی قسم کی تربیت دی جاتی ہے۔ پھر اُس نے بتایا کہ وہ حسن بن صباح کے ساتھ مرو گئی تو وہاں اسے حسن نے کس طرح استعمال کیا تھا۔

ابو مسلم رازی گہری سوچ میں کھو گیا۔ کچھ دیر بعد اُس نے سوچ سے بیدار ہو کر شمونہ سے پوچھا کہ وہ کیا چاہتی ہے۔

"سب سے پہلے تو میں پناہ چاہتی ہوں" — شمونہ نے کہا — "اگر آپ نے مجھے پناہ نہ دی تو یہ لوگ مجھے قتل کر دیں گے"۔

"تم میری پناہ میں ہو لڑکی!" — ابو مسلم رازی نے کہا۔

"میں اپنی ذات میں بہت بڑا خطرہ محسوس کر رہی ہوں" — شمونہ نے کہا — "میرے اندر، میرے دل اور میرے دماغ میں ابلیسیت کے سوا کچھ بھی نہیں۔ میں آپ کو صاف الفاظ میں بتا رہی ہوں کہ میں ایک ناگن ہوں اور ڈسنا میری سرشت ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ میں آپ کو ہی ڈس لوں۔ میں انسان کے روپ میں آنا چاہتی ہوں۔ یوں محسوس ہوتا ہے جیسے میری ذات میں کوئی انسانی جذبات ہیں ہی نہیں..... کیا آپ ایسا بندوبست کر سکتے ہیں کہ میری ایسی تربیت ہو جائے جس سے میں انسانوں کے روپ میں آ جاؤں؟"

"کیوں نہیں ہو سکتا" — ابو مسلم رازی نے کہا — "میں فوری طور پر کسی بھلے

آدمی کے ساتھ تمہاری شادی کروا دوں گا"۔

"نہیں!" — شمونہ نے تڑپ کر کہا — "کسی بھلے آدمی پر یہ ظلم نہ کرنا۔ میں ابھی کسی کی بیوی بننے کے قابل نہیں۔ بیوی وفادار ہوتی ہے لیکن میں فریب کاری کے سوا کچھ بھی نہیں جانتی۔ مجھے پہلے انسان بنائیں"۔

"تم آج رات آرام کرو" — ابو مسلم رازی نے کہا — "میں کل تمہارا کچھ بندوبست کر دوں گا"۔

ابو مسلم رازی نے شمونہ کو زنان خانے میں بھجوا دیا۔

○

اس شہر کے مضافات میں ایک آدمی رہتا تھا جو مذہب میں ڈوبا ہوا تھا اور تقریباً تارک الدنیا تھا۔ اُس کی عمر تقریباً چالیس برس ہو گئی تھی۔ اُس کے متعلق مشہور تھا کہ اُس نے شادی نہیں کی تھی، اور یہ بھی مشہور تھا کہ وہ عورت کے وجود کو پسند ہی نہیں کرتا تھا۔ معلوم نہیں کس عمر میں اُس کے دل میں مذہب سے لگاؤ پیدا ہوا تھا۔ وہ زیادہ تر عبادت اور کتابوں میں مگن رہتا تھا۔

اُس کے متعلق یہ بھی مشہور تھا کہ وہ کئی فرقے بدل چکا ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ صحیح عقیدے کی تلاش میں بھٹک رہا تھا۔ اُس وقت تک مسلمان 72 فرقوں میں بٹ چکے تھے اور یہ شخص ان 72 فرقوں میں بھٹک رہا تھا۔ اب لوگ کہتے تھے کہ وہ سنی عقیدے کو قبول کر چکا ہے لیکن یقین کے ساتھ کہنا مشکل تھا کہ وہ کس عقیدے کو قبول کئے ہوئے ہے۔

وہ علم روحانیت میں بھی سر کھپاتا رہتا تھا۔ بعض لوگ کہتے تھے کہ وہ روحوں کو جانتا ہے اور جنات کو حاضر کر لیتا ہے۔ بہرحال لوگوں کے لئے وہ پراسرار سی شخصیت بنا ہوا تھا۔ اُس کے معتقد اُس کے پاس جاتے رہتے اور وہ انہیں درس دیا کرتا تھا۔ وہ زیادہ تر زور اس پر دیتا تھا کہ عورت ایک حسین فریب ہے اور عورت گناہوں کی علامت ہے۔

ابو مسلم رازی اس بزرگ سے بہت متاثر تھا۔ اس کا نام نور اللہ تھا۔ ابو مسلم رازی اکثر اُس کے ہاں جاتا تھا۔ شمونہ نے جب ابو مسلم رازی سے یہ کہا کہ وہ بھٹکی ہوئی ایک لڑکی ہے اور جب تک دینی تربیت کے ذریعے اس کی ذات سے ابلیسیت نہیں نکالی جاتی اُس وقت تک وہ کسی کی بیوی نہیں بنے گی، رازی کو نور اللہ یاد آیا تھا۔

اگلے روز کا سورج ابھی طلوع ہوا ہی تھا کہ ابو مسلم رازی نے شمونہ کو بلوا لیا۔ شمونہ آئی تو وہاں ایک ادھیڑ عمر آدمی بیٹھا تھا۔ اُس کی داڑھی ابھی بالکل سیاہ تھی۔ چہرے پر نور، سر پر سبز دستار اور اُس نے سبز رنگ کا چغہ زیب تن کر رکھا تھا۔ اُس کی آنکھوں میں ایک خاص قسم کی چمک تھی۔ اُس کے ہاتھ میں تسبیح تھی۔

امیرِ شہر ابو مسلم رازی نے اسے فجر کی نماز کے کچھ دیر بعد بلوا لیا تھا اور اسے بتایا تھا کہ باطنیہ فرقے کی ایک لڑکی اس کے پاس آئی ہے جو خود محسوس کرتی ہے کہ اُس کے وجود میں ابلیس حلول کر آیا ہے۔ ابو مسلم رازی نے نور اللہ کو شمونہ کے متعلق تمام تر باتیں بتائی تھیں جو نور اللہ انہماک سے سنتا رہا تھا لیکن ابو مسلم نے جب یہ کہا کہ اس لڑکی کی تربیت کرنا ہے تو نور اللہ پریشان اور بے چین ہو گیا۔

"کیا میں کچھ دیر کے لئے اس کے پاس آیا کروں گا؟" — نور اللہ نے پوچھا۔

"نہیں!" — ابو مسلم رازی نے کہا — "میں یہ لڑکی ایک امانت کے طور پر آپ کے حوالے کر رہا ہوں۔ یہ ہر وقت آپ کے زیرِ سایہ اور زیرِ تربیت رہے گی"۔

"میرے متعلق شاید آپ ایک بات نہیں جانتے!" — نور اللہ نے کہا — "میں آج تک عورت کے سائے سے بھی دور رہا ہوں اور میں نے شادی بھی نہیں کی۔ آپ اس لڑکی کو میرے حوالے کرنے کی بجائے اپنے پاس رکھیں، میں ہر روز یہاں آ جایا کروں گا"۔

"میں آپ کا احترام کرتا ہوں" — ابو مسلم رازی نے کہا — "اس احترام کی وجہ یہ ہے کہ آپ مذہب کے رنگ میں رنگے ہوئے انسان ہیں اور آپ کو اپنے نفس پر پورا قابو حاصل ہو گا۔ میں نہیں سمجھ سکا کہ آپ کس بنا پر عورت کے وجود سے گھبراتے ہیں۔ میں آپ کو بتانا چاہتا ہوں کہ ایک اور باطنی فرقہ بن چکا ہے جو لڑکیوں کو اپنی تبلیغ اور تشہیر کے لئے استعمال کر رہا ہے۔ میں حکومت کی سطح پر اس کے انسداد کا کچھ بندوبست تو ضرور کروں گا لیکن میں نے اس کے ساتھ ہی یہ بھی سوچا ہے کہ اس لڑکی جیسی گمراہ کی ہوئی لڑکیوں کو آپ جیسے عالموں کے حوالے کر کے ان کی صحیح تربیت کی جائے۔ آپ اس لڑکی سے بسم اللہ کریں اور اسے اپنے ساتھ لے جائیں"۔

یہ حکمِ حاکم تھا جس کے آگے نور اللہ بول نہ سکا۔ ابو مسلم رازی نے شمونہ کو بلایا اور اسے کہا کہ وہ کچھ دن نور اللہ کے ساتھ رہے گی۔

"تم نے وہاں مہمان بن کے نہیں رہنا" — ابو مسلم رازی نے شمونہ سے کہا — "کھانا پکانا، گھر میں جھاڑو دینا، اپنے اور ان کے کپڑے دھونا اور گھر کے دیگر کام تم نے کرنے ہیں۔ تم ان کی بیوی نہیں ہو گی بلکہ نوکرانی ہو گی اور تم ان کی خدمت کرو گی۔ جب تم خود کہو گی کہ تمہاری ذات سے ابلیسی اثرات دھل گئے ہیں تو کسی کے ساتھ تمہاری شادی کرا دی جائے گی"۔

ابو مسلم رازی نے نور اللہ سے کہا کہ وہ لڑکی کو ساتھ لے جائے۔ نور اللہ اُسے ساتھ لے گیا۔

O

اپنے ہاں لے جا کر نور اللہ نے شمونہ سے پوچھا کہ یہ کیا معاملہ ہے کہ وہ سمجھتی ہے کہ اُس کی ذات میں شیطان حلول کر آیا ہے یا یہ کہ اُس پر شیطان غالب ہے۔ شمونہ نے اُسے اپنی زندگی کی اُس وقت تک کی روداد سنا ڈالی۔

"اپنا ماضی مار ڈالو" — نور اللہ نے کہا۔

"یہ کیسے ہو گا؟"

"اپنے آپ کو مٹی میں ملا دو" — نور اللہ نے کہا — "یہ بھول جاؤ کہ تمہارا رہن سہن شہزادیوں جیسا رہا تھا۔ اس گھر میں جھاڑو دو۔ میں نے یہیں چھوٹی سی مسجد بنا رکھی ہے۔ اسے صاف ستھرا رکھو۔ دھیان ہر وقت اللہ کی ذات پر رکھو اور اپنے دماغ میں اس حقیقت کو بٹھا لو کہ تم نے ایک نہ ایک دن اس مٹی میں مل کر مٹی ہو جانا ہے۔ اپنی نفسانی خواہشات کو اور جنسی جذبات کو کچل ڈالو"۔

اس طرح نور اللہ نے اس کی تعلیم و تربیت شروع کر دی۔ نور اللہ کے ہاں جب اس کے معتقد اور مرید آتے تھے، اُس وقت شمونہ کمرے میں چلی جاتی تھی۔ رات کو سونے سے پہلے نور اللہ شمونہ کو اپنے سامنے بٹھاتا اور اسے مذہب کے سبق دیتا تھا۔ اس کے بعد وہ شمونہ کو الگ کمرے میں بھیج کر اسے کہتا کہ اندر سے دروازہ بند کر لے۔ صبح اذان کے وقت وہ شمونہ کے دروازے پر دستک دیتا اور اسے جگا کر نماز پڑھاتا تھا۔

دن گزرتے چلے گئے۔ نور اللہ نے محسوس کیا کہ اُس کے دل میں عورت کی جو بیزاری یا نفرت تھی وہ کم ہوتی جا رہی ہے۔ شمونہ نے محسوس کیا کہ اُس کے استاد کا رویہ تبدیل ہوتا جا رہا ہے۔ اس رویے میں کچھ ایسا تاثر تھا جیسے نور اللہ نے اُسے قبول کر

لیا ہو۔

ایک روز شمونہ گھر کے سارے کاموں سے فارغ ہو کر ایسی تھکن سی محسوس کرنے لگی جیسے اُسے نیند آ رہی ہو۔ وہ لیٹ گئی۔ نور اللہ کہیں باہر چلا گیا تھا۔ واپس آیا تو شمونہ کو نہ دیکھ کر اُس کے کمرے کے دروازے میں جا کھڑا ہوا۔ شمونہ بڑی گہری نیند سوئی ہوئی تھی۔ وہ پیٹھ کے بل پڑی تھی۔ اُس کے سر سے اوڑھنی سرک گئی تھی۔ اُس کے چند ایک بال اُس کے گورے چٹے گالوں پر آ گئے تھے۔ اُس کا شباب بے نقاب تھا۔

نور اللہ کا ایک قدم دہلیز کے اندر چلا گیا تھا۔ اُس نے وہ قدم پیچھے کو اٹھایا لیکن اُس کی ذات سے ہی ایک قوت بیدار ہوئی جس نے اُسے پیچھے ہٹنے سے روک دیا اور اُس نے دوسرا پاؤں اٹھا کر دہلیز کے اندر کر دیا۔ نور اللہ کمرے میں داخل ہو گیا لیکن ایک ہی قدم آگے بڑھا کر رک گیا۔

شمونہ کوئی خواب دیکھ رہی تھی۔ نہ جانے کیا خواب تھا کہ اُس کے ہونٹوں پر تبسم آ گیا۔ نور اللہ کچھ دیر شمونہ کے تبسم کو دیکھتا رہا۔ اُس نے ایک قدم اور آگے بڑھایا۔ شمونہ کا تبسم ایسی مسکراہٹ کی صورت اختیار کر گیا جس سے اُس کے دانت ذرا ذرا سے نظر آنے لگے۔ اس مسکراہٹ نے شمونہ کے حسن میں طلسماتی سا تاثر پیدا کر دیا۔

نور اللہ ایک دو قدم اور آگے چلا گیا اور پھر رک گیا۔ اُس کے آگے بڑھنے اور رُکنے میں اُس کے اپنے ارادے اور اختیار کا کوئی دخل نہیں تھا۔ اُس نے آنکھیں بند کر لیں۔ یہ ایک ایسی حرکت تھی جو اُس نے اپنے ارادے سے کی تھی جس کا مطلب یہ تھا کہ وہ اس لڑکی کو نہیں دیکھنا چاہتا تھا لیکن وہ پیچھے نہ ہٹا۔ اُس کی ذات میں ایک کشمکش سی شروع ہو گئی تھی جسے وہ سمجھ نہ پایا۔

"آپ وہاں کیوں کھڑے ہیں!" — نور اللہ کے کانوں سے شمونہ کی غنودہ سی آواز ٹکرائی۔

وہ چونک کر اس کیفیت سے بیدار ہو گیا جو اُس پر طاری ہو چکی تھی۔ وہ بوکھلایا اور فوری طور پر یہ فیصلہ نہ کر سکا کہ وہ آگے بڑھے، شمونہ کو کوئی جواب دے یا باہر چلا جائے۔

شمونہ بڑی تیزی سے اٹھی۔ اُس کے دل میں نور اللہ کا احترام اور تقدس اتنا زیادہ تھا

کہ اُس پر مرعوبیت طاری رہتی تھی۔

"آپ کس وقت آئے؟" — شمونہ نے لونڈیوں اور غلاموں جیسے لہجے میں پوچھا اور کہنے لگی — "میں ذرا سو گئی تھی..... آپ چپ کیوں ہیں؟..... کیا آپ مجھ سے خفا ہو گئے ہیں؟"

"نہیں، نہیں!" — نور اللہ نے بوکھلائی ہوئی سی آواز میں کہا — "میں تمہیں دیکھنے اِدھر آ گیا تھا...... نہیں، نہیں میں خفا نہیں ہوں" — وہ پیچھے مڑا اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا کمرے سے نکل گیا۔

دو تین دنوں بعد نور اللہ شمونہ کو سامنے بٹھائے کچھ پڑھا رہا تھا۔ شمونہ کا سر جھکا ہوا تھا۔ اُس کی اوڑھنی سر سے ذرا سرک گئی۔ اُس کے ریشم جیسے ملائم بال بے نقاب ہو گئے۔ شمونہ نے محسوس کیا کہ اُس کا قابلِ احترام استاد بولتے بولتے چپ ہو گیا ہے۔ اُس نے آہستہ سے سر اٹھایا تو دیکھا کہ استاد کی نظریں اُس کے ماتھے پر اس طرح مرکوز تھیں جیسے وہ آنکھیں جھپکنا بھول گیا ہو۔ ایک دو لمحوں بعد اُس کی نظریں شمونہ کی نظروں سے ٹکرائیں۔ نور اللہ پر بے خودی کی جو کیفیت طاری تھی وہ زلزلے جیسے جھٹکے سے تہہ و بالا ہو گئی۔

شمونہ کوئی سیدھی سادی دیہاتن یا نادان بچی نہیں تھی۔ اُسے جو تربیت دی گئی تھی، اس میں خاص طور پر بتایا گیا تھا کہ مرد کسی خوبصورت عورت کو کیسی نظروں سے دیکھتے ہیں اور ان کے چہرے کا تاثر کیا ہوتا ہے۔

شمونہ نے وہ تاثر اپنے استاد کے چہرے پر دیکھا اور اُس نے اپنے استاد کی آنکھوں میں بھی ایک تاثر دیکھا جسے وہ اچھی طرح سمجھتی تھی لیکن وہ یہ تسلیم کرنے کو تیار نہیں تھی کہ مذہب میں ڈوبا ہوا یہ شخص جس کا دل عورت کو گناہوں کی علامت سمجھتا ہے اُسے ہوس کی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

"اٹھو شمونہ!" — نور اللہ نے کہا — "آج اتنا ہی کافی ہے۔ اب تم کھانا تیار کرو"۔

شمونہ تو چولہے پر جا کر مصروف ہو گئی لیکن نور اللہ اپنی ذات میں ہلکے ہلکے جھٹکے محسوس کرتا رہا۔ شمونہ کا ذہن بھی پُرسکون نہ تھا۔ وہ اس سوچ میں کھوئی ہوئی تھی کہ اتنے معزز اور مقدس انسان کے چہرے پر اور آنکھوں میں ایسے تاثرات کیوں آئے

تھے۔ اُس نے اپنے آپ کو یہ دھوکا دینے کی بھی کوشش کی کہ یہ اُس کی اپنی غلط فہمی ہے اور یہ اُس کے استاد کا تاثر نہیں تھا۔ اُسے معلوم نہیں تھا کہ اُس کا استاد ایک ایسی کشمکش میں مبتلا ہو چکا ہے جو اُس کی روح کو بھی لہولہان کئے دے رہی ہے۔

O

جس قدرتی رفتار سے شب و روز گزرتے جا رہے تھے اس سے زیادہ تیز رفتار سے شمونہ اپنی ذات میں ایک پاکیزہ اور پُراثر تبدیلی دیکھ رہی تھی۔ وہ اُن دنوں کو بھولتی جا رہی تھی جو دن اُس نے حسن بن صباح کے گروہ میں گزارے تھے۔ وہ صاف طور پر محسوس کر رہی تھی کہ وہ ابلیس کے جال سے نکلتی آ رہی ہے۔

چند دن اور گزرے، دوپہر کے وقت شمونہ کچھ دیر کے لئے سو گئی۔ یہ اُس کا روز کا معمول تھا۔ اس کی آنکھ کھلی تو اُس نے اپنے استاد کو اپنی چارپائی کے قریب کھڑے دیکھا۔ اُسے کچھ ایسا محسوس ہوا جیسے استاد نے اُس کے سر پر اور شاید گالوں پر بھی ہاتھ پھیرا تھا۔ وہ ہاتھ کے لمس کو ابھی تک محسوس کر رہی تھی لیکن اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ یہ ہاتھ اُس کے مقدس استاد کا تھا۔ وہ فوراً اٹھ کھڑی ہوئی۔

"کیا آپ نے مجھے جگایا ہے؟" — شمونہ نے نور اللہ سے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

نور اللہ نے بوکھلائے ہوئے لہجے میں ایسا جواب دیا جس میں ہاں بھی تھی نہیں بھی۔ شمونہ کی مسکراہٹ غائب ہو گئی۔ نور اللہ سر جھکائے آہستہ آہستہ چلتا کمرے سے نکل گیا۔ شمونہ اُس روز کچھ زیادہ ہی سنجیدہ ہو گئی۔ اُس نے دیکھا کہ نور اللہ شام تک چپ چاپ رہا۔ چپ رہنا اس کا معمول نہیں تھا۔

عصر اور مغرب کی نماز کے درمیان نور اللہ کے پاس ہر روز کی طرح اُس کے شاگرد اور معتقد وغیرہ آئے تو اس نے طبیعت کی ناسازی کا بہانہ کر کے درس نہ دیا۔ وہ سب چلے گئے۔ نور اللہ وہیں بیٹھا رہا۔ شمونہ نے اسے دیکھا اور چپ رہی۔

عشاء کی نماز کے بعد جب نور اللہ ایک کتاب کھول کر پڑھنے لگا تو شمونہ اُس کے سامنے جا بیٹھی۔

"کیوں؟" — نور اللہ نے پوچھا — "آج سوئی نہیں؟"

"نہیں!" — شمونہ نے بڑی نرم آواز میں کہا — "میں آج آپ کے پاس بیٹھوں گی"۔

"تم نے دیکھا نہیں کہ میں نے شام کو درس نہیں دیا تھا؟" — نور اللہ نے کہا — "میرے سر میں گرانی ہے۔ اس وقت تمہیں بھی سبق نہیں دے سکوں گا۔ اگر میری پہلی ہوئی کوئی بات تمہاری سمجھ میں نہ آئی ہو تو وہ پوچھ لو اور جا کے سو جاؤ"۔

"ہاں میرے مرشد!" — شمونہ نے کہا — "ایک بات ہی پوچھنی ہے۔ یہ بات آپ نے پہلے کبھی نہیں بتائی۔ یہ مسئلہ میرے اپنے ذہن میں آیا ہے"۔

"پوچھو" — نور اللہ نے شگفتہ لہجے میں کہا اور کتاب بند کر کے الگ رکھ دی۔

"میں آپ میں ایک تبدیلی دیکھ رہی ہوں" — شمونہ نے کہا — "آپ روز بروز خاموش ہوتے چلے جا رہے ہیں"۔

"یہ میری عادت ہے" — نور اللہ نے کہا — "کبھی کبھی میں خاموش ہو جایا کرتا ہوں۔ کچھ دن اور میری یہی حالت رہے گی"۔

"نہیں میرے مرشد!" — شمونہ نے کہا — "میں گستاخی کی جرأت نہیں کر سکتی لیکن یہ ضرور کہوں گی کہ آپ کی زبان نے جو کہا ہے یہ آپ کے دل کی آواز نہیں..... آپ مجھ سے خفا ہیں۔ آپ کے دل میں میرے لئے ناپسندیدگی ہے"۔

"ایک بات کہوں شمونہ!" — نور اللہ نے کہا — "میرے لئے مشکل یہ پیدا ہو گئی ہے کہ میرے دل میں تمہارے لئے ناپسندیدگی نہیں۔ تم جس پیار سے میری خدمت کر رہی ہو اس نے میری سوچیں بدل ڈالی ہیں"۔

"میں کچھ اور بھی کہنا چاہتی ہوں میرے مرشد!" — شمونہ نے کہا — "میری عمر نہ دیکھیں، میری تربیت دیکھیں۔ میں سلطان ملک شاہ کے ہاں اس تربیت کا عملی تجربہ کر آئی ہوں۔ سلطان کا مشیرِ خاص احتشام مدنی جو زاہد اور پارسا تھا، میرے سامنے موم کی طرح پگھل گیا تھا..... میں نے یہ بات اس لئے کہی ہے کہ آپ مجھے نادان، ناتجربہ کار اور کمسن لڑکی نہ سمجھتے رہیں۔ میں کسی بھی آدمی کے دل کی بات اُس کے چہرے اور اُس کی آنکھوں سے پڑھ لیا کرتی ہوں"۔

"شمونہ!" — نور اللہ نے کہا — "تم فوراً وہ بات کیوں نہیں کہہ دیتیں جو تمہارے دل میں ہے؟"

"ڈرتی ہوں میرے آقا!"

"مت ڈرو" — نور اللہ نے کہا — "اللہ سچ بولنے والوں کو پسند کرتا ہے"۔

"لیکن اللہ کے بندے سچ سننے کی تاب نہیں رکھتے" — شمونہ نے کہا — "اگر آپ اللہ کی خوشنودی کے طلب گار ہیں تو میں بے خوف ہو کر بات کروں گی..... میں بہت دنوں سے دیکھ رہی ہوں کہ میں آپ کے سامنے بیٹھتی ہوں تو آپ کی آنکھوں میں وہی تاثر ہوتا ہے جو میں عام سے لوگوں کی آنکھوں میں دیکھا کرتی ہوں..... پھر میں نے تین بار آپ کو اس حالت میں دیکھا ہے کہ میں دن کے وقت سوئی ہوں اور آپ میرے پاس کھڑے مجھے دیکھ رہے ہیں۔ آپ نے میرے سر اور میرے منہ پر ہاتھ بھی پھیرا ہے"۔

"کیا تمہیں یہ اچھا نہیں لگا؟" — نور اللہ نے پوچھا۔

"اگر آپ کو یوں ہی اچھا لگا ہے تو میں کچھ نہیں کہوں گی" — شمونہ نے کہا — "لیکن میں یہ پوچھنا چاہتی ہوں کہ میں آپ کو کتنی کچھ اچھی لگتی ہوں؟"۔

"شمونہ!" — نور اللہ نے لپک کر شمونہ کا ایک ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں لے لیا — "تم نے میری آنکھوں میں جو پڑھا ہے ٹھیک پڑھا ہے اور تم نے غلط نہیں کہا کہ تمہیں سویا ہوا دیکھ کر میں تین چار دن تمہارے پاس جا کھڑا ہوا اور تمہیں دیکھتا رہا تھا"۔

"کس نیت سے؟"

"اس نیت سے کہ تمہیں اپنی زندگی کی رفیقہ بنا لوں" — نور اللہ نے کہا — "کیا تم مجھے قبول کر لو گی؟"

"نہیں میرے مرشد!" — شمونہ نے جواب دیا۔

"کیا میں چالیس برس کی عمر میں بوڑھا ہو گیا ہوں؟"

"نہیں اے مقدس ہستی!" — شمونہ نے کہا — "میں آپ کے تقدس کو اپنے ناپاک وجود سے پامال نہیں کروں گی۔ یہ بات بھی ہے کہ میں نے آپ کو کبھی اپنے سامنے لا کر دیکھا ہی نہیں۔ میرا دل خاوند کے روپ میں آپ کو قبول نہیں کرے گا"۔

"مجھے شک ہے تم مجھ سے اپنی قیمت وصول کرنا چاہتی ہو" — نور اللہ نے قدرے غصیلے لہجے میں کہا — "میں تمہیں شادی کے لئے تیار کرنا چاہتا ہوں، ہوس کاری کے لئے نہیں"۔

"اپنی محنت پر پانی نہ پھیریں میرے آقا!" — شمونہ نے کہا — "میں بھٹک گئی تھی، آپ نے مجھے صراط مستقیم دکھائی ہے..... میں نے تو سنا تھا کہ آپ تارک دنیا

ہیں..... میں بھول گئی تھی میں کون ہوں، آپ نے میری آنکھوں کے آگے سے پردے ہٹا دیئے ہیں۔ میں نے اپنے آپ کو پہچان لیا ہے۔ میری نگاہ میں آپ فرشتہ ہیں"۔

"جاؤ شمونہ!" — نور اللہ نے کہا — "جاؤ، سو جاؤ..... صرف ایک بات کہوں گا..... میں نے دنیا کو ترک نہیں کیا تھا، دنیا نے مجھے ترک کر دیا تھا"۔

شمونہ اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ وہ نور اللہ کی بات سننے کے لئے پھر بیٹھنے لگی تھی لیکن نور اللہ نے اسے کہا "جاؤ، سو جاؤ" تو وہ اپنے کمرے میں چلی گئی۔

○

شمونہ کو اس کے کمرے میں بھیج کر وہ خود وہیں بیٹھا رہا۔ اس کا ذہن پیچھے کو چل پڑا اور وہاں جا رکا جہاں اس کا شعور بیدار ہوا اور وہ بھاگنے دوڑنے کی عمر کو پہنچ گیا۔ اسے معلوم ہی نہیں تھا کہ بچوں کے ساتھ پیار بھی کیا جاتا ہے۔ اسے کوئی عورت یاد نہ آئی جس نے اسے گود میں لیا ہو۔ صرف ایک یاد تھی جو اس کے ذہن کے ساتھ چپکی ہوئی تھی۔ جہاں تک اس کی یاد ماضی کے دوسرے افق تک جاتی تھی، وہ اپنے آپ کو دریا کے کنارے ایک کشتی کو صاف کرتا، اس میں سے پانی نکالتا، کشتی میں مسافروں کا سامان رکھتا اور ساحل کی ہر قسم کی مشقت کرتا دیکھتا تھا۔ اس وقت اس کی عمر چھ سات سال تھی جب اسے ان کاموں پر لگا دیا گیا تھا۔ اس مشقت کے عوض اسے دو وقت کی روٹی اور اپنے آقاؤں کی پھٹکار اور دھتکار ملتی تھی۔

دس گیارہ سال کی عمر میں اسے بتایا گیا تھا کہ وہ اس جھونپڑی میں پیدا نہیں ہوا تھا جس جھونپڑی میں وہ رہتا تھا اور جس کے رہنے والوں کو وہ اپنے والدین سمجھتا تھا۔ یہ لوگ ملاح تھے جو مسافروں کو کشتی کے ذریعے دریا پار کراتے تھے۔ ایک روز اس پر یہ انکشاف ہوا کہ کچھ عرصہ پہلے کی بات ہے یہ دریا سیلابی تھا اور ایک کشتی پار والے کنارے سے اس طرف آ رہی تھی اور یہ مسافروں سے اٹی پڑی تھی۔ کشتی اتنے زیادہ مسافروں کا بوجھ سہارنے کے قابل نہیں تھی۔ کشتی دریا کے وسط میں پہنچی تو اچانک سیلاب کا زور بڑھ گیا۔ کشتی الٹ گئی۔

ملاحوں نے مسافروں کو بچانے کے لئے اپنی اپنی کشتیاں دریا میں ڈال دیں لیکن سیلاب اتنا تیز و تند تھا کہ مسافر تنکوں کی طرح سیلاب میں گم ہوتے چلے جا رہے تھے۔ ایک کشتی کو اس کے ملاح ذرا آگے لے گئے۔ انہوں نے ایک عورت کو دیکھا جس نے

دودھ پیتے ایک بچے کو اپنے ہاتھوں میں لئے اس طرح اوپر اٹھا رکھا تھا کہ بچہ ڈوب نہ جائے۔ ملاحوں نے کشتی اُس کے قریب کر کے بچے کو پکڑ لیا۔ دوسرے ملاح نے ہاتھ لمبا کیا کہ عورت کو بھی سیلاب میں سے نکال لے لیکن عورت میں اتنی تاب نہیں رہی تھی کہ وہ دو گز اور تیر سکتی۔ اُس نے دیکھا کہ بچہ بچ گیا ہے تو اُس نے اپنے آپ کو سیلاب کے حوالے کر دیا اور ملاحوں کی نظروں سے اوجھل ہو گئی۔

اس بچے کو ملاحوں نے اس طرح پالا کہ اسے کبھی بکری کا دودھ پلایا اور کبھی لوتی کا۔ وہ چار پانچ سال کا ہُوا تو اُسے کشتی رانی کی مشقت پر لگا دیا۔

ان ملاحوں نے اس بچے کا نام نور اللہ رکھا تھا۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ مسلمان تھے۔

نور اللہ کو دس گیارہ سال کی عمر میں پتہ چلا کہ اُس کے ماں باپ دریا میں ڈوب گئے تھے اور اسے ملاحوں نے پالا تھا تو اُس کے دماغ میں جو دھماکہ ہُوا وہ اسے چالیس برس کی عمر میں بھی یاد تھا۔ وہ اسی کو زندگی سمجھتا تھا جس میں ملاحوں نے اسے ڈال رکھا تھا لیکن اس انکشاف نے اس پر ایسی کیفیت طاری کر دی جیسے وہ بھٹکا ہُوا راہی ہو اور اپنی منزل کی تلاش میں مارا مارا پھر رہا ہو۔

ایک روز کشتی سے مسافر اُترے تو ایک امیر کبیر آدمی نے اُسے کہا کہ اس کا سامان اٹھا کر وہاں تک پہنچا دے جہاں سے لوگ مل جاتے ہیں۔ نور اللہ نے اس کا سامان وہاں تک پہنچا دیا اور واپس چل پڑا۔ اُس آدمی نے اسے بلایا اور ایک دینار اُجرت دی۔ دس گیارہ سال عمر کا نور اللہ دینار کو ہاتھ لگاتے ڈرتا تھا۔ اس آدمی نے اُسے کہا کہ یہ اس کا حق ہے۔

"دنیا میں میرا کوئی حق نہیں" ــــ نور اللہ نے کہا ــــ "کسی پر میرا حق نہیں۔ مشقت کرتا ہوں اور روٹی اور رات کو جھونپڑی کی چھت مل جاتی ہے۔ ذرا سی سستی کروں تو مجھے مارا پیٹا جاتا ہے۔ میں یہ اُجرت لے کر جاؤں گا تو وہ لوگ مجھ سے چھین لیں گے"۔

"تمہارا باپ ہے؟"

"نہیں..... اسی دریا میں ڈوب گیا تھا"۔

"ماں ہے؟"

"نہیں..... وہ بھی ڈوب گئی تھی"۔

"کوئی بھائی..... کوئی چچا' ماموں؟"

نور اللہ نے اسے وہ سارا واقعہ سنا دیا جو کچھ دن پہلے اسے سنایا گیا تھا۔

"میرے ساتھ چلو گے؟" ــــ اس امیر کبیر آدمی نے پوچھا اور اُس کے جواب کا انتظار کئے بغیر کہا ــــ "تنخواہ بھی ملے گی' روٹی بھی ملے گی' کپڑے بھی ملیں گے اور رہنے کو بہت اچھی جگہ ملے گی"۔

نور اللہ نے یہ پہلا شخص دیکھا جس نے اُس کے ساتھ پیار سے بات کی تھی اور اُسے اس قابل سمجھا تھا کہ اسے اچھی جگہ رکھا جائے' اچھی قسم کا روٹی کپڑا دیا جائے اور اجرت بھی دی جائے۔ وہ وہیں سے اس شخص کے ساتھ چل پڑا۔

○

دونوں کرائے کے ایک ہی اونٹ پر سوار ہوئے اور شام کو شتربان نے انہیں ایک بڑے شہر میں پہنچا دیا۔ یہ شہر نیشاپور تھا۔ یہ آدمی وہیں کا رہنے والا تھا۔ اس کی حویلی بڑی ہی شاندار تھی۔ وہاں اس شخص کی دو بیویاں رہتی تھیں۔ ایک ادھیڑ عمر اور دوسری نوجوان تھی۔ نور اللہ کو اس گھر میں نوکر رکھ لیا گیا۔ وہاں ایک عورت پہلے سے ملازم تھی۔

نور اللہ روز مرہ کے کام کاج کرتا رہا۔ اُسے اتنی زیادہ سہولتیں میسر آ گئی تھیں کہ وہ یوں سمجھتا تھا جیسے جہنم سے نکل کر جنت میں آ گیا ہو۔ کھانے پینے کو اتنا اچھا ملتا تھا کہ گیارہ بارہ سال کی عمر میں وہ سولہ سترہ سال کا نوجوان نظر آنے لگا۔

ایک سال سے کچھ زیادہ عرصہ گزر گیا۔

ایک روز اُس کا آقا اپنی ادھیڑ عمر بیوی اور بچوں کو ساتھ لے کر کچھ دنوں کے لئے شہر سے باہر چلا گیا۔ پیچھے اس کی نوجوان بیوی رہ گئی۔ اسی اگلی رات کا واقعہ ہے۔ ملازمہ اپنا کام کاج ختم کر کے جا چکی تھی۔ نور اللہ کو ایسے شک ہُوا جیسے کوئی آدمی حویلی کے صحن میں سے گزرا ہے۔ اُس نے اٹھ کر دیکھا۔ ایک آدمی اُس کی نوجوان مالکن کے کمرے میں داخل ہو رہا تھا۔ نور اللہ دوڑ کر گیا۔ دروازہ اندر سے بند ہو چکا تھا۔ اُس نے دروازے پر دستک دی۔ دروازہ کھلا اور مالکن باہر آئی۔

"کیا ہے؟" ــــ مالکن نے پوچھا۔

"یہ کون ہے جو اندر آیا ہے؟" ——نور اللہ نے اپنا فرض سمجھتے ہوئے پوچھا۔

"تم کون ہو پوچھنے والے؟" —— حسین اور نوجوان مالکن نے بڑے رعب سے پوچھا۔

"میں آقا کے حکم کی تعمیل کر رہا ہوں" ——نور اللہ نے کہا —— "آقا کہہ گئے تھے کہ گھر میں تم ہی ایک مرد ہو' گھر کا خیال رکھنا"۔

مالکن نے اُس کے منہ پر بڑی زور سے تھپڑ مارا۔ تھپڑ کی آواز پر وہ آدمی جو کمرے میں گیا تھا' باہر نکل آیا۔

"کون ہے یہ؟" ——اس شخص نے پوچھا۔

"میرا پہرہ دار بن کے آیا ہے" ——لڑکی نے کہا —— "میں اس کی زبان ہمیشہ کے لئے بند کر دوں گی"۔

اس شخص نے نور اللہ کو بازو سے پکڑا' گھسیٹ کر اندر لے گیا اور اسے دونوں ہاتھوں سے اٹھا کر فرش پر پٹخ دیا۔ پھر اُس کی شہ رگ پر پاؤں رکھ کر دبا لیا اور خنجر نکال کر اُس کے اوپر جھکا۔

"میں اس کا پیٹ چیر دوں گا" —— اس شخص نے خنجر کی نوک نور اللہ کے پیٹ پر رکھ کر کہا —— "اس کی لاش باہر کتوں کے آگے پھینک دوں گا"۔

"آج اسے معاف کر دو" ——نوجوان مالکن نے اپنے آشنا کو پرے ہٹاتے ہوئے کہا —— "یہ زبان بند رکھے گا۔ اس نے کبھی بھی زبان کھولی تو اس کے دونوں بازو کاٹ کر اسے جنگل میں پھینک دیں گے پھر اسے گیدڑ اور بھیڑیے کھائیں گے"۔

نور اللہ اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ سر سے پاؤں تک کانپ رہا تھا۔

"وعدہ کر کہ تُو زبان بند رکھے گا" —— اس شخص نے خنجر کی نوک نور اللہ کی شہ رگ پر رکھ دی اور کہا —— "خاموشی سے چلا جا اور خاموش رہنا"۔

نور اللہ ظلم و تشدد سے بہت ڈرتا تھا۔ وہ چپ چاپ' خوفزدگی کی حالت میں اپنے کمرے میں چلا گیا۔

اس کے بعد اُس کے آقا کی واپسی تک یہ آدمی دو تین مرتبہ رات کو اس کی مالکن کے پاس آیا اور نور اللہ اپنے کمرے میں دبکا پڑا رہا۔ اُس کا آقا واپس آیا تو نور اللہ کو جرأت نہ ہوئی کہ وہ اپنے آقا کو بتاتا کہ اُس کی غیر حاضری میں یہاں کیا ہوتا رہا ہے۔

ایک بار چھوٹی مالکن نے نور اللہ کو اپنے کمرے میں بلایا اور پیار سے بات کرنے کی بجائے اُسے پھر وہی دھمکی دی کہ اس کا پیٹ پھاڑ کر یا بازو کاٹ کر اسے بھیڑیوں' کتوں اور گیدڑوں کے آگے پھینک دیا جائے گا۔

نور اللہ کا کوئی مذہب نہیں تھا نہ اُس نے کبھی سوچا تھا کہ مذہب کے لحاظ سے وہ کون اور اس کا آقا کون ہے۔ نہ اُس نے خود کبھی عبادت کی تھی نہ اُس نے اپنے آقا یا اُس کی بیوی کو عبادت کرتے دیکھا تھا۔ اُس میں یہ احساس بیدار ہو گیا تھا کہ مذہب انسان کے لئے ضروری ہوتا ہے۔ اُس سے تین چار آدمی پوچھ چکے تھے کہ وہ مسلمان ہے یا عیسائی۔ وہ کسی کو بتاتا کہ وہ مسلمان ہے اور کسی کو عیسائی بتاتا۔ ایک بار ایک آدمی نے اسے کہا' تمہارا آقا تو باطنی معلوم ہوتا ہے...... اُسے تو معلوم ہی نہیں تھا کہ باطنی کیا ہوتے ہیں۔

ایک رات اُس کے آقا نے اُسے شراب لانے کو شراب خانے بھیجا۔ وہ مسجد کے قریب سے گزرا۔ عشاء کی نماز ہو چکی تھی اور خطیب درس دے رہا تھا۔ نور اللہ کے کانوں میں خطیب کے یہ الفاظ پڑے —— "ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھ ہی سے مدد مانگتے ہیں..... ہمیں اُن لوگوں کا سیدھا راستہ دکھا جن پر تیرا انعام نازل ہوا ہے نہ کہ ان لوگوں کا راستہ جن پر تیرا غضب نازل ہوا" —— خطیب سورۂ فاتحہ کی تفسیر بیان کر رہا تھا۔ نور اللہ کو کچھ بھی معلوم نہیں تھا کہ یہ قرآن کی آیت ہے اور قرآن اللہ کا کلام ہے۔ اُسے صرف یہ احساس ہُوا کہ وہ بھی اُن لوگوں میں سے ہے جن پر اللہ کا غضب نازل ہُوا ہے۔

نور اللہ جلدی میں تھا۔ اُس کا آقا شراب کے انتظار میں تھا۔ وہ دوڑ گیا' شراب خریدی اور اپنے آقا کو جا دی۔ اُس کے ذہن میں خطیب کے یہ الفاظ اٹک کے رہ گئے تھے جو اس نے مسجد کے دروازے میں کھڑے ہو کر سنے تھے۔ وہ بھی مدد کا اور سیدھے راستے کی رہنمائی کا طالب بن گیا تھا۔

○

اگلی رات نور اللہ روزمرہ کے کام کاج سے فارغ ہو کر مسجد کے دروازے پر جا پہنچا۔ خطیب روزمرہ کی طرح درس دے رہا تھا۔ نور اللہ دروازے میں جا کر کھڑا ہو گیا۔ خطیب نے اسے دیکھا تو اشارے سے اپنے پاس بلایا۔ وہ ڈرتے جھجکتے خطیب کے پاس چلا گیا۔

"دروازے میں کھڑے کیا کر رہے تھے؟" —— خطیب نے پوچھا۔

"آپ کی باتیں سُن رہا تھا" — نور اللہ نے جواب دیا — "کل باہر کھڑا سن رہا ہوں"۔

"مسلمان ہو؟"

"معلوم نہیں" — نور اللہ نے بڑی سادگی سے جواب دیا — "میں یہی معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ میں کون ہوں..... اس وقت ایک شیخ کے گھر ملازم ہوں"۔

خطیب نے اسے اپنے پاس بٹھا لیا اور اسے بتایا کہ جس شیخ کا اس نے نام لیا ہے وہ بے دین ہے۔ اپنے آپ کو مسلمان کہتا ہے لیکن کسی کو بھی معلوم نہیں کہ وہ کس فرقے کا آدمی ہے اور اس کا عقیدہ کیا ہے۔

"کل سے تم میرے پاس آجایا کرو" — خطیب نے اُسے بڑے پیار سے کہا — "اب تم چلے جاؤ"۔

اگلے روز سے نور اللہ نے خطیب کے پاس جانا شروع کر دیا۔ اُس نے خطیب کو بتایا کہ اُس کے ماں باپ سیلاب میں ڈوب گئے تھے اور اُسے ملاحوں نے سیلاب سے نکالا تھا۔ اُس نے خطیب کو اپنی گذری ہوئی زندگی کا ایک ایک لمحہ سنایا۔ خطیب نے اُسے پڑھانا لکھانا شروع کر دیا۔ یہ خالصتاً" دینی تعلیم تھی۔ نور اللہ نے اس تعلیم میں گہری دلچسپی کا مظاہرہ کیا۔ تقریباً" ایک سال بعد اُس نے خطیب سے اس خواہش کا اظہار کیا کہ وہ اس شیخ کی نوکری چھوڑ کر خطیب کی اور مسجد کی خدمت کرنا چاہتا ہے۔ خطیب نے خندہ پیشانی سے اُسے اپنے پاس رکھ لیا۔

نور اللہ نے پندرہ سال اس خطیب کے ساتھ گذارے اور دین کے امور میں خاصی دسترس حاصل کر لی۔ خاص بات یہ ہوئی کہ اُس کے ذہن میں ابلیس اٹک گیا۔ اُس کا عقیدہ بن گیا کہ ہر بُرا کام ابلیس کرواتا ہے۔

دوسری خاص بات یہ ہوئی کہ خطیب کی ایک ہی بیوی تھی جو صرف تین سال کی رفاقت کے بعد مر گئی اور خطیب نے دوسری شادی نہ کی۔ خطیب نے کسی کو بھی نہ بتایا کہ اُس نے دوسری شادی کیوں نہیں کی۔ ایک وجہ یہ ہو سکتی تھی کہ اُسے اس بیوی سے اتنا زیادہ پیار تھا کہ اُس نے کسی اور عورت کو قبول ہی نہ کیا' یا یہ بات تھی کہ اس بیوی سے وہ اس قدر نالاں تھا کہ وہ مر گئی تو خطیب نے شادی سے توبہ کر لی۔

وجہ جو کچھ بھی تھی' خطیب نے اپنے شاگرد نور اللہ کو عورت سے متنفر کر دیا اور اُس کے ذہن میں یہ عقیدہ ڈال دیا کہ عورت گناہوں کی علامت ہوتی ہے اور ابلیس عورت کے زیادہ قریب ہوتا ہے۔

چند برس اور گزرے تو خطیب فوت ہو گیا۔ نور اللہ ایسا دلبرداشتہ ہوا کہ وہ مسجد کو بھی چھوڑ گیا اور جنگل میں ایک کُٹیا سی بنا کر وہاں جا ڈیرہ لگایا۔ اب وہ عالمِ دین کہلانے کے قابل ہو چکا تھا۔ خطیب کے جو شاگرد تھے وہ نور اللہ کے پاس جنگل میں پہنچنے لگے اور نور اللہ نے انہیں درس دینا شروع کر دیا۔ اُس کی شہرت سینہ بہ سینہ پھیلتی چلی گئی اور اُس کا نام ابو مسلم رازی تک پہنچا۔ ابو مسلم رازی رے کا امیرِ شہر تھا۔ دینی علوم سے اُسے دلچسپی لگاؤ تھا۔ وہ اتنی دُور جنگل میں جا کر نور اللہ سے ملا اور اُس سے متاثر ہوا۔ متاثر بھی اتنا ہوا کہ ایک روز اُس کے لئے سواری ساتھ لے کر اُسے اس میں بٹھایا اور اپنے شہر میں لے آیا۔ شہر میں اُسے بڑا اچھا مکان دیا اور کہا کہ یہاں وہ جو جی چاہے کرے اور لوگوں کو دین کی تعلیم دے۔

لوگ اُس کے پاس آنے لگے۔ بعض لوگ اُس سے اتنے زیادہ متاثر ہو گئے تھے کہ اُس سے غیب کا حال معلوم کرتے تھے۔ وہ زیادہ تر ابلیس اور عورت پر زور دیا کرتا تھا اور کہتا تھا کہ ان دو چیزوں سے اپنے جسم اور اپنی روح کی حفاظت کرو۔

○

آج نور اللہ اُسی مکان میں بیٹھا تھا جو اُسے ابو مسلم رازی نے دیا تھا لیکن اُس پر جو کیفیت طاری تھی وہ کوئی اجنبی دیکھتا تو یہ تسلیم نہ کرتا کہ یہ شخص عالم فاضل ہے۔ وہ اُسے ذہنی مریض سمجھتا۔ اُسے اپنا ماضی یاد آ رہا تھا۔ شمونہ اپنے کمرے میں گہری نیند سو گئی تھی۔ اُسے احساس ہی نہیں تھا کہ نور اللہ کے وجود میں اور جذبات میں وہ کیسے زلزلے بپا کر آئی ہے۔

اُسی نور اللہ نے جس نے ہمیشہ یہ سبق دئیے تھے کہ عورت سے دُور رہو' شمونہ سے کہا تھا کہ وہ اُس کے ساتھ شادی کرنا چاہتا ہے لیکن شمونہ جو گنہگاروں کی پروردہ تھی گناہوں کی دنیا سے نکل کر پارسائی میں داخل ہو گئی تھی' اُس شمونہ نے نور اللہ سے کہہ دیا تھا — "میں آپ کے تقدس کو اپنے ناپاک وجود سے پامال نہیں کروں گی" — شمونہ نے یہ بھی کہا تھا — "میرا اول خاوند کے روپ میں آپ کو قبول نہیں کرے گا"۔

نور اللہ کی آنکھوں کے آگے سے اُس کا پورا ماضی تیز رفتار گھوڑا گاڑیوں کی قطار

کی مانند گذر گیا۔ وہ اپنے وجود میں پیاس کی تلخی محسوس کر رہا تھا۔ ایک تشنگی تھی، بڑ
محرومیاں تھیں جو کانٹوں کی طرح اُس کے حلق میں چُبھ رہی تھیں۔

تلخی بڑھتی چلی گئی۔

دیکھتے ہی دیکھتے اُس کی ذات سے ایک شعلہ اٹھا جس نے اُس کے علم و فضل کے خرمن کو
جلا ڈالا۔

وہ اپنے لئے اجنبی بن گیا۔

وہ بڑی تیزی سے اٹھا اور اُس کمرے میں داخل ہو گیا جس میں شمونہ گہری نیند سوئی
ہوئی تھی۔ اُس رات شمونہ نے دروازہ بند نہیں کیا تھا کیونکہ اُسے توقع تھی کہ نور اللہ
اُسے بلانے گا۔ وہ لیٹی اور نیند نے اُسے دبوچ لیا۔

نور اللہ اُس کے پلنگ پر جا بیٹھا۔ کمرہ تاریک تھا۔ برآمدے میں جلتے ہوئے دیئے کی
ہلکی ہلکی روشنی دروازے سے اندر آ رہی تھی جس میں سمٹی ہوئی شمونہ کا سراپا دھندلا سا نظر آ
رہا تھا۔

شمونہ گہری سانسیں لے رہی تھی۔ نور اللہ کی سانسیں بے قابو سی ہو گئیں اور اُس
کے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی۔ اُس نے ہاتھ شمونہ کی طرف بڑھایا۔ یہ ہاتھ کچھ لرزتا ہوا
آہستہ آہستہ شمونہ کے پُرشباب جسم کی طرف بڑھ رہا تھا۔ ہاتھ جب شمونہ کے جسم کے
قریب گیا تو آسمان پر اچانک گھٹاؤں کی گرج سنائی دی۔ نور اللہ نے یک لخت ہاتھ پیچھے
کھینچ لیا جیسے چوری کرتے عین موقع پر پکڑا گیا ہو۔ جب اُسے احساس ہُوا کہ یہ گھٹاؤں کی
گرج تھی تو اُس کے دل کو حوصلہ ملا۔

اُس نے اب ذرا دلیری سے ہاتھ آگے بڑھایا اور شمونہ کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔
..... اب کے گھٹا پہلے سے زیادہ زور سے گرجی۔ نور اللہ نے ہاتھ پیچھے کھینچنے کی بجائے
شمونہ کا ہاتھ اور زیادہ زور سے پکڑ لیا اور اُس نے شمونہ کے ہاتھ کو اتنی زور سے دبایا کہ
شمونہ کی آنکھ کھل گئی۔ اُس نے نور اللہ کو اپنے پلنگ پر بیٹھے اور اپنا ہاتھ نور اللہ کے ہاتھ
میں دیکھا تو وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی۔

"آپ؟" — شمونہ نے گھبرائے ہوئے لہجے میں پوچھا — "یہاں کیوں؟"

"مت گھبراؤ شمونہ!" — نور اللہ نے شمونہ کا ہاتھ چھوڑے بغیر کہا — "آج کی
پیاس مجھے جلا کر راکھ کر رہی ہے جسے میں نے پہلے کبھی محسوس ہی نہیں کیا تھا..... میری

ایک بات سن لو۔"
شمونہ کچھ ایسی ڈری کہ وہ پلنگ پر بیٹھے بیٹھے پیچھے کو سرکنے لگی۔ نور اللہ نے اُس کا
دوسرا ہاتھ بھی پکڑ لیا اور اُسے اپنی طرف بڑے آرام سے کھینچا۔
"مجھے ماں کا پیار نہیں ملا" — نور اللہ نے ایسی آواز میں کہا جو اُس کی قدرتی آواز
نہیں تھی — "مجھے بہن کا پیار نہیں ملا۔ میں بیٹی کے پیار سے بھی محروم رہا۔
میں نے کبھی کسی عورت کو ہاتھ لگا کر بھی نہیں دیکھا لیکن تم میرے قریب آئیں تو مجھ پر
یہ راز کھلا کہ جس عورت کو میں نفرت کی علامت سمجھتا رہا ہوں وہ پیار کا سرچشمہ ہے....
تم ہو وہ سرچشمہ..... مجھ سے دُور نہ ہٹو" — اُس نے شمونہ کو ذرا زور سے اپنی طرف
کھینچا۔

"نہیں میرے مُرشد!" — شمونہ نے رندھی ہوئی سی آواز میں کہا — "تم میں
بدی سے نیکی کی طرف، شر سے خیر کی طرف آئی ہوں۔ مجھے اس راستے پر آپ نے ہی
ڈالا تھا۔ آپ اُس طرف نہ جائیں جدھر سے میں واپس آئی ہوں۔ مجھے اللہ اور ابلیس کے
درمیان بھٹکانہ چھوڑیں"۔

"میری بات سمجھنے کی کوشش کرو شمونہ!" — نور اللہ نے ایسی ڈگمگاتی ہوئی آواز
میں کہا جیسے وہ نشے میں ہو — "تھوڑی سی دیر کے لئے مجھے بھٹک جانے دو۔ مجھے پیاسا
نہ لوٹاؤ"۔

آسمان پر بجلی بڑی زور سے کڑکی پھر گھٹا گرجی اور اس کے ساتھ ہی طوفانِ باد و باراں
شروع ہو گیا۔ دروازے کے کھلے کواڑ زور زور سے بجنے لگے۔ برآمدے میں دیا بجھ گیا۔
نور اللہ نے شمونہ کو اپنی طرف کھینچا۔ شمونہ کا سینہ بڑی زور سے نور اللہ کے سینے سے
ٹکرایا۔ نور اللہ اُس کے ہاتھ چھوڑ کر اُسے اپنے بازوؤں میں لینے لگا تو شمونہ اچھل کر
پیچھے ہٹی اور بڑی زور سے ایک تھپڑ نور اللہ کے منہ پر مارا۔

"تم لوگوں کو جس ابلیس سے ڈراتے ہو" — شمونہ نے بڑے ہی غضبناک لہجے
میں کہا — "وہ ابلیس تم خود ہو"۔

شمونہ اچھل کر پلنگ سے اٹھی اور فرش پر کھڑی ہو گئی۔ اُسے توقع ہو گی کہ نور اللہ
اُس پر جھپٹے گا لیکن اندھیرے میں نور اللہ کے قدموں کی آہٹ اُبھری جو شمونہ کی طرف
بڑھنے کی بجائے دروازے کی طرف جا رہی تھی۔ شمونہ وہیں دبکی کھڑی رہی۔ نور اللہ

باہر نکل گیا۔ شمونہ کو اب یہ خوف محسوس ہونے لگا کہ نور اللہ رسی لینے گیا ہے اور اسے باندھ کے لایا چھری یا چاقو لا کر اسے قتل کر دے گا۔ ڈر کے مارے وہ پلنگ کے نیچے چھپ گئی۔

○

نور اللہ صحن میں چلا گیا۔ بارش بہت ہی تیز تھی اور اس کے ساتھ جھکڑ اور زیادہ تیز و تند تھا۔

"مجھے سکون دو" — نور اللہ نے بڑی بلند آواز میں کہا — "مجھے انسان کا لہو دو"۔

شمونہ نے یہ آواز سنی اور وہ پلنگ کے نیچے دبکی رہی۔

نور اللہ پر دیوانگی طاری ہو چکی تھی۔ وہ اسی حالت میں باہر نکل گیا۔ شہر کے لوگوں نے طوفانِ باد و باراں کے بھیانک شور و غل میں بڑی بلند آوازیں سنیں — "مجھے سکون دو..... میں جل رہا ہوں..... میرے اللہ! باد و باراں کو اور تیز کر دے..... میری روح کو تکلیفوں سے نجات دلا دے"۔

شہر کے لوگوں نے یہ آوازیں مسلسل سنیں اور یہ دور ہٹتی گئیں اور پھر طوفان کے شور و غل میں تحلیل ہو گئیں اور لوگ یہ سمجھ کر ڈر گئے کہ یہ کسی کی بھٹکی ہوئی مظلوم بدروح ہے جو فضا میں چیختی چلاتی چلی جا رہی ہے۔

شمونہ پلنگ کے نیچے چھپی کانپ رہی تھی۔

نور اللہ شہر سے نکل کر جنگل میں چلا گیا تھا اور وہ بازو پھیلائے چلاتا چلا جا رہا تھا کہ مجھے سکون دو۔ شہر سے کچھ دور چھوٹی سی ایک ندی تھی جس میں سے بچے بھی گزر جایا کرتے تھے لیکن اوپر اتنی زور کا مینہ برسا تھا کہ ندی میں طغیانی آ گئی تھی۔ ہر طرف پانی ہی پانی تھا۔ ندی پانی میں ہی کہیں چھپ گئی تھی۔ نور اللہ کچھ دور آگے گیا تو ایک ٹہنی درخت سے ٹوٹ کر اس طرح گرا کہ نور اللہ کے سر پر لگا۔ وہ تو پہلے ہی دیوانگی کی حالت میں تھا اُسے یہ احساس بھی نہ تھا کہ جا کہاں رہا ہے۔ سر پر ٹہنی گرا تو اس پر غشی طاری ہونے لگی۔ وہ گرا تو چند قدم آگے ندی کے کنارے پر گرا۔ کنارہ سیلاب میں ڈوبا ہوا تھا۔ سیلاب نور اللہ کو اپنے ساتھ ہی بہا لے گیا۔

اُسے اللہ نے سیلاب میں نئی زندگی دی تھی اور یہ زندگی سیلاب نے ہی واپس لے

لی۔

شمونہ صبح تک پلنگ کے نیچے چھپی رہی۔ صبح ڈرتے ڈرتے باہر نکلی تو نور اللہ وہاں نہیں تھا۔ طوفان ختم ہو چکا تھا۔ شمونہ گھر سے نکلی اور ابو مسلم رازی کے ہاں چلی گئی اور اُسے رات کی واردات سنائی۔

"ابلیس ہر انسان کی ذات میں موجود ہوتا ہے" — ابو مسلم رازی نے شمونہ سے کہا — "ایک خوبصورت عورت میں اتنی طاقت ہوتی ہے کہ وہ کسی کے بھی ایمان کو سُلا کر ابلیس کو بیدار کر سکتی ہے لیکن جن کے ایمان مضبوط ہوتے ہیں، ابلیس ان کا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکتا..... تمہارا اب کیا ارادہ ہے؟"

"میں آپ کی پناہ میں آئی تھی" — شمونہ نے التجا کی — "مجھے اپنی پناہ میں رکھیں..... یہ تو میرا ایک ارادہ ہے۔ میرا ایک ارادہ اور بھی ہے۔ آپ نے کہا ہے کہ ایک خوبصورت عورت کسی کے بھی ایمان کو سُلا کر ابلیس کو بیدار کر سکتی ہے..... یہ آپ نے ٹھیک کہا ہے۔ حسن بن صباح لوگوں کو اور امراء وزراء کو اپنا مرید بنانے کے لئے عورت کی یہی طاقت استعمال کر رہا ہے۔ میں اُس کی اس طاقت کو زائل کرنے کا ارادہ رکھتی ہوں۔ اس ارادے کی تکمیل کے لئے میں آپ کے زیرِ سایہ رہنا چاہتی ہوں"۔

اُسی روز شہر میں مشہور ہو گیا کہ رات کو ایک بے چین بدروح طوفانِ باد و باراں میں چلاتی گزر گئی تھی 'مجھے سکون دو' 'مجھے سکون دو'..... یہ باتیں امیرِ شہر تک پہنچیں تو شمونہ نے بھی سنیں۔ اُس نے بتایا کہ یہ الفاظ نور اللہ نے اپنے گھر کے صحن میں کہے تھے پھر وہ باہر نکل گیا تھا۔ وہی باہر بھی یہ نعرے لگا کے گیا ہو گا۔

تیسرے چوتھے دن شہر سے کچھ دور آگے ایک جگہ نور اللہ کی لاش مل گئی تو کڑیاں ملتے یہ کہانی سامنے آئی جو داستان گو نے سنائی ہے۔ یہ تاریخ کا ایک قصہ بن گیا۔

یہ آگے چل کر سنایا جائے گا کہ شمونہ نے اس داستان میں کیا رول ادا کیا تھا۔

○

حسن بن صباح اپنی گرفتاری کی اطلاع قبل از وقت مل جانے سے رے سے فرار ہو گیا تھا۔ اُس نے خلجان پہنچنا تھا۔ وہ اپنے خاص آدمیوں کو کہہ گیا تھا کہ شمونہ کو بھی خلجان پہنچا دینا۔ وہاں وہ اُسے سزائے موت دینا چاہتا تھا وہ خود بھی خلجان نہ پہنچ سکا۔ تاریخ

میں اس کی وجہ یہ بیان کی گئی ہے کہ وہ خلجان کی طرف اونٹ پر جا رہا تھا۔ وہ شتربانوں کے بھیس میں تھا۔ اس کی رفتار معمول کے مطابق تھی تاکہ کسی کو شک نہ ہو۔ اس نے ابھی آدھا فاصلہ طے کیا ہو گا کہ پیچھے سے ایک تیز رفتار گھوڑ سوار گیا اور اسے جا لیا۔ وہ حسن کے اپنے گروہ کا آدمی تھا۔

"کیا خبر لائے ہو؟" — حسن نے اس سے پوچھا۔

"خلجان نہ جائیں" — گھوڑ سوار نے کہا — "ہمارا خیال ہے سلجوقی امیر کو شک ہو گیا ہے کہ آپ خلجان جا رہے ہیں۔ شاید وہ لوگ آپ کے تعاقب میں آئیں گے۔ کسی اور طرف کا رخ کر لیں"۔

حسن رک گیا۔ کچھ دیر سوچا۔

"میں اصفہان چلا جاتا ہوں" — اس نے کہا — "تم خلجان چلے جاؤ۔ وہاں کے امیر احمد بن عطاش کو ساری بات سنا کر بتانا کہ میں اصفہان جا رہا ہوں۔ وہاں میرا ایک پرانا دوست رہتا ہے۔ نام ابوالفضل ہے۔ ہم امام موافق کے مدرسے میں اکٹھے پڑھتے تھے۔ اب اس کا شمار شہر کے رئیسوں میں ہوتا ہے۔ وہ مجھے پناہ دے گا اور مدد بھی کرے گا۔ احمد بن عطاش سے کہنا کہ میں کچھ دنوں بعد خلجان پہنچ جاؤں گا، اور یہ بھی کہنا کہ شہر میں کوئی مشکوک آدمی نظر آئے تو اس کے پیچھے اپنے جاسوس ڈال دے۔ وہ سلجوقیوں کا جاسوس ہو سکتا ہے۔ اسے زندہ نہیں چھوڑنا"۔

"میں آپ کی بات سمجھ گیا ہوں" — گھوڑ سوار نے کہا — "ہمیں یہاں زیادہ دیر رکنا نہیں چاہیے"۔

گھوڑ سوار خلجان کی طرف اور حسن بن صباح اصفہان کی طرف چلا گیا۔

تاریخ سے پتہ نہیں چلتا وہ کتنے دنوں بعد اصفہان پہنچا۔ ابوالفضل اصفہانی کے گھر کا راستہ پوچھا اور اس کے گھر جا پہنچا۔ ابوالفضل کو ملازم نے اندر جا کر اسے بتایا کہ ایک شتربان آیا ہے۔ ابوالفضل نے کہا کہ اس نے کسی شتربان کو نہیں بلایا نہ کسی شتربان کی اجرت اس کے ذمے ہے۔

"اس سے پوچھو کیوں آیا ہے!" — ابوالفضل نے ملازم سے کہا۔

"آقا پوچھتے ہیں کیوں آئے ہو!" — ملازم نے باہر جا کر حسن سے کہا — "ان کا کسی شتربان سے کوئی کام نہیں ہو سکتا"۔

"آقا سے کہو یہ شتربان آپ سے ملے بغیر نہیں جائے گا" — حسن بن صباح نے کہا۔

ملازم اندر گیا اور واپس آ کر وہ حسن کو اندر لے گیا۔ معمولی سے ایک کمرے میں بٹھایا۔ ایک تو وہ شتربانوں کے لباس میں تھا، دوسرے وہ بڑی مسافت طے کر کے آیا تھا۔ چہرے پر تھکن کے آثار بھی تھے۔ ابوالفضل اصفہانی اس کمرے میں گیا۔ وہ حسن کو پہچان نہ سکا۔ حسن نے تعارف کرایا تو ابوالفضل نے اسے پہچانا اور اسے اس کمرے میں لے گیا جس میں اعلیٰ رتبے کے مہمانوں کو بٹھایا جاتا تھا۔

وہ کچھ دیر مدرسے کے زمانے کی باتیں کرتے رہے، پھر ابوالفضل نے اس سے پوچھا کہ وہ کہاں سے آیا ہے اور کہاں جا رہا ہے۔

"یوں سمجھو آسمان سے گرا ہوں" — حسن بن صباح نے کہا — "میں مرو سے آیا ہوں۔ سلطان ملک شاہ نے مجھے اپنا معتمد خاص بنا لیا تھا۔ یہ تو تم جانتے ہو کہ ہمارا پرانا دوست نظام الملک سلطان ملک شاہ کا وزیر اعظم ہے" — حسن بن صباح نے جھوٹ بولا — "سلطان مجھے اپنا وزیر اعظم بنا رہا تھا لیکن نظام الملک نے خفیہ طریقے سے سلطان کو میرا دشمن بنا دیا اور پھر مجھے عہدے سے معزول کرا کے شہر بدر کروا دیا"۔

"دبستان مذاہب" کے حوالے سے "آئمہ تلبیس" میں لکھا ہے کہ ابوالفضل نے حسن سے پوچھا کہ وہ کیا کرنا چاہتا ہے۔

"میں سلجوقی سلطنت کا خاتمہ کرنا چاہتا ہوں" — حسن بن صباح نے کہا — "مجھے تم جیسے دو دوست مل جائیں تو میں اس ترک ملک شاہ اور خواجہ حسن طوسی کا جو نظام الملک بنا پھرتا ہے، پہلے خاتمہ کر دوں"۔

ابوالفضل چپ رہا۔ اتنے میں ملازموں نے دسترخوان چن دیا۔ ابوالفضل نے ایک الماری سے ایک شیشی نکالی اور اس میں جو سفوف پڑا ہوا تھا، اس میں ذرا سا سفوف ایک پیالے میں پانی ڈال کر گھولا۔

"لو حسن!" — اس نے پیالہ حسن کو دیتے ہوئے کہا — "یہ پی لو"۔

"یہ کیا ہے؟" — حسن نے پوچھا۔

"یہ دماغی تقویت کے لئے ایک دوائی ہے" — ابوالفضل نے کہا — "تم نے اتنا لمبا سفر کیا ہے کہ تھکان نے تمہارا دماغ شل کر دیا ہے ورنہ تم ایسی بہکی بہکی باتیں نہ

کرتے کہ تم سلطان ملک شاہ اور اس کے وزیرِ اعظم نظام الملک کا خاتمہ کر دو گے، ملا کر تمہیں پوری طرح احساس ہے کہ سلجوقی نہ آتے تو اسلام کی بنیادیں جو کھوکھلی ہوئی جا رہی تھیں، پوری عمارت کو لے بیٹھتیں۔ مسلمان 72 فرقوں میں بٹ چکے ہیں اور فرقوں کے اندر فرقے بن رہے ہیں۔ اسلام کی توڑ پھوڑ شروع ہو چکی ہے۔ سلجوقیوں نے آ کر اسلام کی بنیادیں مضبوط کر دی ہیں اور قرآن کے اس فرمان کے مطابق کہ اُمت ایک جماعت ہے، ایک جماعت کی حکومت قائم کر دی ہے..... تم جیسا مسلمان یہ کہے کہ وہ سلطنتِ سلجوق کا خاتمہ کر دے گا تو یہ ثبوت ہے کہ وہ دماغی توازن کھو بیٹھا ہے! یا کسی وجہ سے اُس کے دماغ پر عارضی اثر ہو گیا ہے..... تمہارے دماغ پر سفر کی تھکان کا اثر ہے۔ یہ دوائی پی لو۔ دماغ تر و تازہ ہو جائے گا"۔

یہ ایک تاریخی واقعہ ہے جو ہر مؤرخ نے لکھا ہے۔ حسن بن صباح اپنے پرانے دوست ابوالفضل اصفہانی کے ہاں پناہ اور مدد امداد کے لئے گیا تھا لیکن اُس کے دوست نے اسے دماغی خرابی کا مریض قرار دے دیا۔ حسن کو ایک مایوسی تو یہ ہوئی کہ اس کا دوست سلجوقیوں کا حامی ہی نہیں بلکہ پیروکار نکلا۔ اس کے ساتھ ہی اسے خطرہ محسوس ہوا کہ ابوالفضل کو اس کی اصلیت اور گرفتاری سے فرار کا پتہ چل گیا تو وہ اسے گرفتار کرا دے گا۔

حسن بن صباح نے اپنے متعلق یہ مشہور کر رکھا تھا کہ وہ اہلِ سنت ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا شیدائی ہے۔ اسماعیلیوں میں جاتا تو اپنے آپ کو اسماعیلی بتاتا تھا۔ حقیقت یہ تھی کہ وہ اپنا ہی ایک فرقہ بنا رہا تھا اور اُس نے نبوت کا دعویٰ کرنا تھا۔

اُس نے ابوالفضل کے ہاتھ سے پیالہ لے کر دوائی پی لی، کھانا کھایا اور باتوں میں مشغول ہو گیا۔ ابوالفضل نے اُسے جلدی سُلا دیا۔

وہ صبح بہت جلدی جاگ اٹھا۔ اپنے میزبان سے کہا کہ وہ اس سے رخصت چاہتا ہے۔ وہ وہاں سے بھاگنے کی فکر میں تھا۔ ابوالفضل کے گھر سے نکل کر وہ خلجان کی طرف روانہ ہو گیا۔ وہاں گرفتاری کا خطرہ تو تھا لیکن وہ احمد بن غطاش سے مل کر آئندہ کا پروگرام بنانا چاہتا تھا۔

○

دو تین دنوں کی مسافت طے کر کے وہ خلجان پہنچ گیا۔ اُس کا بہروپ اتنا کامیاب تھا کہ

احمد بن غطاش بھی اُسے نہ پہچان سکا۔ اُس نے پہلی بات یہ پوچھی کہ گرفتاری کا خطرہ ابھی ہے یا ٹل گیا ہے۔ دوسری بات یہ پوچھی کہ شمونہ آئی ہے یا نہیں۔ شمونہ کے متعلق اسے بتایا گیا کہ نہیں آئی، البتہ یہ اطلاع آئی ہے کہ وہ فرار ہو گئی ہے۔

"اس صورت میں اُسے قتل کرنا ضروری ہے" — حسن بن صباح نے کہا — "ہم نے اسے یہاں لا کر قتل ہی کرنا تھا لیکن اب وہ ہمارے لئے زیادہ خطرناک ہو گئی ہے۔ اگر وہ سلجوقیوں کے پاس چلی گئی تو ہمارا سارا کھیل بے نقاب ہو جائے گا"۔

"تمہیں یہاں سے نکلنے کی ایک بڑی اچھی صورت پیدا ہو گئی ہے" — احمد بن غطاش نے کہا — "مصر کے دو عالم آئے ہیں۔ تم جانتے ہو کہ مصر پر اسماعیلیوں کی حکومت ہے۔ وہ میرے مہمان اس طرح ہوئے کہ ہمیں وہ اسماعیلی سمجھتے ہیں۔ میں نے انہیں یقین دلا رکھا ہے کہ ہم اسماعیلی فرقے کے لوگ ہیں۔ یہ دونوں تبلیغ کے لئے آئے ہیں۔ ان میں ایک داعی الکبیر کہلاتا ہے۔ اس نے مجھے کہا ہے کہ اُسے ایسے ذہین اور پُر اثر گفتار والے آدمی دیئے جائیں جو اسماعیلی عقائد اور مسلک کی تبلیغ کریں اور لوگوں کو اس فرقے میں لائیں"۔

"میں ان میں شامل ہو جاتا ہوں" — حسن بن صباح نے کہا — "مصر جانے کے ارادے سے! یہ تو میں پہلے ہی سوچ رہا تھا کہ مصر جاؤں اور وہاں کے حکمرانوں کو قائل کروں کہ وہ سلجوقیوں پر حملہ کریں اور ہم انہیں نفری اور دیگر ضروریات کی مدد دیں گے..... ہمارا پہلا شکار سلجوقی سلطنت ہے۔ اس کا ہم نے خاتمہ کر دیا تو اس پر قابض ہونے والوں کے ہم پاؤں نہیں ٹکنے دیں گے"۔

پہلے بیان ہو چکا ہے کہ مصر پر عبیدیوں کی حکمرانی تھی جن کے متعلق مشہور تھا کہ وہ اسماعیلی ہیں لیکن وہ باطنی تھے۔ یہ جو دو عالم خلجان گئے اور احمد بن غطاش سے ملے اسماعیلی ہی تھے جو اپنے فرقے کے مبلغ تھے۔ معلوم ہوتا ہے کہ انہیں بھی معلوم نہیں تھا کہ مصر کے حکمران اسماعیلی نہیں بلکہ باطنی ہیں۔

ایک روایت یہ بھی ہے کہ دونوں عالم دراصل باطنی تھے اور اسماعیلیت کے پردے میں اپنے عقائد کی تبلیغ کرتے پھرتے تھے۔ داستان گو کے لئے یہ عالم کوئی ایسے اہم نہیں کہ ان کے متعلق حتمی طور پر کہے کہ وہ کس فرقے کے لوگ تھے۔ اہم بات یہ ہے کہ

حسن بن صباح مصر جانا چاہتا تھا۔ اس نے یہ طریقہ اختیار کیا کہ ان عالموں سے ملا اور تبلیغ کے لئے اپنی خدمات پیش کیں۔ دوسروں پر اپنا طلسم طاری کرنے کا ڈھنگ اُسے آتا تھا۔ اس کی زبان میں جادو کا اثر تھا۔ اس نے عالموں کو متاثر کر لیا اور انہوں نے اسے تبلیغ کے لئے رکھ لیا۔

حسن نے انہیں کہا کہ وہ اپنے علاقے میں تبلیغ کرنے کی بجائے مصر چلا جائے تو زیادہ بہتر ہے۔ اس نے ایسے دلائل دیئے جن سے یہ عالم متاثر ہو گئے اور اسے مصر جانے کے لئے تمام سہولتیں اور رقم وغیرہ دے دی۔

حسن مصر کو روانہ ہو گیا۔ اپنے دو آدمیوں کو ساتھ لے گیا۔

○

دو مہینوں کے سفر کے بعد حسن بن صباح مصر پہنچ گیا اور سیدھا اُس وقت کے حکمران کے پاس گیا۔ اس نے حکمران کو بھی متاثر کر لیا لیکن اُسے یہ نہ بتایا کہ وہ اسماعیلی عقائد کی تبلیغ کے لئے آیا ہے۔ اُس نے حکمران پر دھاک بٹھانی شروع کر دی کہ وہ بہت بڑا عالم ہے اور وہ وزارت کے رتبے کا آدمی ہے۔ اُس نے اپنے متعلق یہ بھی بتایا کہ وہ غیب دان بھی ہے اور آنے والے وقت کی پیشگوئی بھی کر سکتا ہے۔

عبیدی حکمران اتنے کچے نہیں تھے کہ فوراً ہی ایک اجنبی کی باتوں میں آجاتے۔ انہوں نے ظاہر یہ کیا کہ وہ اس سے متاثر ہو گئے ہیں لیکن اُس کے ساتھ اپنے جاسوس لگا دیئے۔ ان میں ایک بڑی ہی خوبصورت لڑکی تھی جس نے یہ ظاہر کیا کہ وہ پہلی نظر میں ہی حسن کی محبت میں گرفتار ہو گئی ہے۔ حسن جان نہ سکا کہ وہ خود جو حربہ دوسروں کو ہاتھ میں لینے کے استعمال کیا کرتا ہے وہی حربہ اُس پر استعمال ہو رہا ہے۔

حسن بن صباح کی حکمرانوں نے ایسی پذیرائی کی جیسے وہ آسمان سے اترا ہوا فرشتہ ہو۔ اُس نے وہاں در پردہ اپنا ایک گروہ بنانا شروع کر دیا اور اس لڑکی کو بھی اپنے مقاصد اور مفادات کے لئے استعمال کیا۔

اس کے ساتھ ہی اُس نے حکمرانوں کو یہ مشورے دینے شروع کر دیئے کہ وہ سلجوقی سلطنت پر قبضہ کرنے کی کوشش کریں۔ انہیں وہ اس قسم کی پیشگوئیاں سناتا تھا کہ وہ کامیاب ہو جائیں گے اور وہ خود ایک فرشتہ بن کر مصر میں آیا ہے۔

عبیدی حکمران یہی تو دیکھ رہے تھے کہ یہ شخص کیا کرنے آیا ہے۔ وہ دو عالم جنہوں

نے اسے مصر بھیجا تھا وہ بھی واپس مصر آ گئے۔ وہ اسماعیلی مبلغ تھے جن کا عبیدی حکومت کے ساتھ کوئی تعلق نہیں تھا کیونکہ وہ اسماعیلی نہیں تھے۔ ایک روز حسن بن صباح ان عالموں کے بلاوے پر ان سے ملنے چلا گیا۔ جاسوسوں نے حکمرانوں کو بتا دیا۔ اس دوران جاسوسوں نے حکمرانوں کو یہ بھی اطلاعیں دی تھیں کہ اس شخص کی کارروائیاں صرف مشکوک ہی نہیں بلکہ خطرناک بھی معلوم ہوتی ہیں۔

حسن بن صباح کے متعلق صحیح اطلاعیں تو اُس لڑکی نے دیں جسے اُس کے ساتھ لگایا گیا تھا اور جس نے یہ ظاہر کیا تھا کہ وہ حسن بن صباح کی محبت میں گرفتار ہو گئی ہے۔

حکمرانوں کے لئے یہی کافی تھا اور وہ یہی معلوم کرنا چاہتے تھے۔ ایک رات حسن اس لڑکی کو پاس بٹھائے شراب پی رہا تھا کہ اُس کے کمرے کا دروازہ بڑی زور سے کھلا اور دو آدمی اندر آئے۔ ان کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں تھیں۔ انہوں نے حسن بن صباح کو ہتھکڑیوں میں جکڑ لیا اور اسے گھسیٹتے ہوئے باہر لے گئے اور پھر اسے پیادہ چلا کے قید خانے تک لے گئے۔ تب اُسے بتایا گیا کہ سلطانِ وقت کے حکم سے اسے قید خانے میں ڈالا جا رہا ہے اور یہ نہیں بتایا جا سکتا کہ اسے کب رہائی ملے گی یا رہائی ملے گی بھی یا نہیں۔

مؤرخ لکھتے ہیں کہ اُس نے قید خانے کے دروازے پر کھڑے ہو کر نعرہ لگایا —

"مجھے قید کرنے والو! تمہاری تباہی اور بربادی کا وقت آ گیا ہے"۔

اسے قید خانے میں تو دھکیل دیا گیا اور پھر ایک کوٹھڑی میں بند کر دیا گیا لیکن جس طرح اُس نے تباہی کا نعرہ لگایا تھا وہ ایسا تھا کہ سننے والوں پر خوف طاری ہو گیا تھا۔ یہ خبر حکمران تک پہنچ گئی۔

وہ جو کہتے ہیں کہ اللہ شیطان کو بڑی ڈھیل دیتا ہے وہ حسن بن صباح کے معاملے میں بالکل صحیح ثابت ہوئی۔ اُسے جس قید خانے میں بند کیا گیا تھا اس کا نام قلعہ دمیاط تھا۔ یہ ایک قدیم قلعہ تھا۔ ہوا یوں کہ جس رات حسن بن صباح کو اس قید خانے میں پھینکا گیا، اُسی رات اس قلعہ کا سب سے بڑا برج گر پڑا۔ یہ تو کسی نے بھی نہ دیکھا کہ برج کے گرنے کی وجہ کیا ہے، سب پر یہ خوف طاری ہو گیا کہ یہ حسن بن صباح کی بددعا کا نتیجہ ہے۔ سلطانِ مصر کو اطلاع ملی تو اُس نے حکم دیا کہ اس شخص کو مصر سے نکال دیا جائے۔

اتفاق سے ایک بحری جہاز کسی دور کے سفر پر روانہ ہو رہا تھا۔ تاریخ کے مطابق،

اس کے تمام مسافر عیسائی تھے۔ حسن بن صباح کے ساتھ اُس کے دو آدمی بھی تھے جو اُس کے ساتھ ہی آئے تھے۔ جہاز ساحل سے بہت دُور سمندر کے درمیان پہنچا تو بڑا ہی تیز و تند طوفان آگیا۔ بادبان اُڑنے لگے پانی جہاز کے اندر آنے لگا اور ہر لمحہ یہ خطرہ تھا کہ جہاز ڈوب جائے گا۔

جہاز کے عملے اور مسافروں میں بھگدڑ مچی ہوئی تھی۔ ہر کوئی جہاز میں سے پانی باہر نکالنے میں مصروف تھا۔ کچھ لوگ ہاتھ آسمان کی طرف اٹھائے جہاز اور مسافروں کی سلامتی کی دعائیں مانگ رہے تھے۔ صرف حسن بن صباح تھا جو ایک جگہ بڑے آرام سے بیٹھا مسکرا رہا تھا۔ جہاز کے کپتان نے اسے دیکھ لیا۔

"کون ہو تم!" — کپتان نے حسن بن صباح کو ڈانٹتے ہوئے کہا — "سب لوگ مصیبت میں گرفتار ہیں اور تم یہاں بیٹھے ہنس رہے ہو۔ اٹھو اور کوئی کام کرو"۔

"گھبرانے کی کوئی بات نہیں" — حسن بن صباح نے بڑے آرام سے کہا — "طوفان گذر جائے گا۔ نہ جہاز کو کوئی نقصان پہنچے گا نہ کوئی مسافر زخمی یا ہلاک ہو گا۔ مجھے خدا نے بتا دیا ہے"۔

کچھ ہی دیر بعد طوفان تھم گیا۔ جہاز کو کوئی نقصان نہ پہنچا۔ تمام مسافر زندہ اور سلامت تھے۔ جہاز کے کپتان کے لئے یہ ایک معجزہ تھا۔

"تم کون ہو؟" — کپتان نے حسن بن صباح سے پوچھا۔

"میں طوفان لا بھی سکتا ہوں روک بھی سکتا ہوں" — حسن بن صباح نے جواب دیا۔

"میں جہازرانی میں بوڑھا ہو گیا ہوں" — کپتان نے کہا — "میں نے ایسے شدید طوفان میں سے کبھی کوئی جہاز ٹھیک ٹھاک نکلتے نہیں دیکھا۔ یہ ایک معجزہ ہے کہ میرا جہاز اس طوفان سے نکل آیا ہے"۔

"یہ معجزہ میرا ہے" — حسن بن صباح نے کہا۔

"میں تمہیں کچھ انعام دینا چاہتا ہوں" — کپتان نے کہا — "کہو کیا انعام دوں!"

"اگر انعام دینا ہے تو ایک کام کرو" — حسن بن صباح نے کہا — "جہاز کا رخ موڑ دو اور مجھے حلب پہنچا دو۔ ایسا ہو سکتا ہے کہ میں جہاز میں موجود رہا تو ایک بار پھر طوفان

آجائے"۔

کپتان بہت ہی خوف زدہ تھا۔ اُس نے جہاز کا رخ موڑا اور حلب کا رخ کر لیا۔ حلب پہنچ کر حسن بن صباح اور اُس کے دو ساتھیوں کو اتار دیا۔

"یہ بتاؤ حسن!" — اُس کے ساتھی نے پوچھا — "تمہیں کس طرح پتہ چل گیا تھا کہ جہاز طوفان سے خیریت سے نکل آئے گا؟"

"یہ تو ذرا عقل سے کام لو" — حسن بن صباح نے کہا — "اگر جہاز ڈوب جاتا تو مجھے یہ کہنے کے لئے کوئی بھی زندہ نہ رہتا کہ میری پیشگوئی غلط نکلی ہے۔ میں نے سوچ لیا تھا کہ طوفان گزر گیا تو سب پر میری دھاک بیٹھ جائے گی اور پھر میں کپتان سے اپنی یہ بات منوالوں گا کہ مجھے ملک شام کی بندرگاہ حلب پہنچا دے۔ ایسے ہی ہوا۔ ہمارا کام ہو گیا"۔

حسن بن صباح حلب سے بغداد گیا اور ایک بار پھر اصفہان جا پہنچا۔ وہاں سے اس کا جو سفر شروع ہوا وہ ایسے پُراسرار واقعات کا تسلسل ہے جس پر تاریخ آج تک محوِ حیرت ہے۔

داستان گو نے لکھا ہے کہ حسن بن صباح جہاز سے حلب اُترا اور وہاں سے بغداد اور بغداد سے اصفہان پہنچا۔

کوئی غلط فہمی نہ رہے اس لئے داستان گو داستان کو ذرا پیچھے لے جاتا ہے۔ پہلی بات یہ ہے کہ حلب بندرگاہ نہیں۔ بندرگاہ انطاکیہ تھی جہاں جہاز لنگر انداز ہوا اور حسن بن صباح وہاں اترا تھا۔ حلب وہاں سے ساٹھ میل دور ہے۔ حلب سے وہ بغداد گیا۔ یہ چار سو میل کی مسافت ہے۔ بغداد سے وہ اصفہان گیا۔ یہ فاصلہ بھی چار سو میل ہے۔ اس طرح حسن بن صباح نے انطاکیہ سے اصفہان تک آٹھ سو میل سفر کیا تھا۔

گھوڑے یا اونٹ کی پیٹھ پر عام رفتار سے چلنے سے یہ ایک مہینے کا سفر تھا۔ تیز رفتار سے جلدی بھی طے ہو سکتا تھا لیکن حسن بن صباح اپنی منزل اصفہان تک چھ ماہ بعد پہنچا تھا۔

اسے اصفہان تک پہنچنے کی کوئی جلدی نہیں تھی۔ اسے جلدی صرف یہ تھی کہ زیادہ سے زیادہ لوگوں کو اپنے زیرِ اثر لے لے اور ان کی عقل پر اس طرح قابض ہو جائے کہ بلا سوچے سمجھے وہ اس کے اشاروں پر ناچیں۔ آگے چل کر حالات بتائیں گے کہ حسن بن صباح کے ذہن میں "اشاروں پر ناچنا" مشہورِ عام محاورہ ہی نہیں تھا، وہ اپنے پیروکاروں کو دیوانگی یا پاگل پن کے اُس مقام پر لے جانا چاہتا تھا جہاں وہ کسی سے کہے کہ اپنے آپ کو ہلاک کر دو تو وہ اپنا خنجر اپنے ہی دل میں اتار لے۔ حسن بن صباح اپنے پیروکاروں کو جو فدائین کہلاتے تھے، اس مقام پر لے آیا تھا اور اُس نے یہ مظاہرے کر کے بھی دکھا دیئے اور اپنے دشمنوں کو حیرت میں ہی نہیں بلکہ خوف میں مبتلا کر دیا تھا۔

حسن بن صباح کی سوانح حیات الف لیلہ سے زیادہ دلچسپ اور طلسم ہوشربا سے زیادہ حسین اور پُراسرار ہے۔

کوئی بھی انسان صرف اس صورت میں سنسنی خیز، پُراسرار اور چونکا دینے والی داستان کا ہیرو بنتا ہے جب بنی نوع انسان کی محبت میں دیوانہ ہو جاتا ہے یا وہ انسان ایسا بنتا ہے جس کے دل میں بنی نوع انسان کی محبت کا شائبہ تک نہ رہے اور اُسے صرف اپنی ذات سے محبت ہو اور وہ آسمان میں اور زمین پر، سورج، چاند اور ستاروں میں صرف اپنی ذات کو دیکھ رہا ہو اور ساری کائنات کو اپنے تابع کرنا چاہتا ہو۔

ابتدا میں بیان ہو چکا ہے کہ ایسا انسان، عورت ہو یا مرد، خیر سگالی اور پیار و محبت کے

جذبات سے عاری ہوتا ہے۔ اُس کا دل ابلیس کا آشیانہ ہوتا ہے لیکن وہ اپنے شکار کے لیے پیار و محبت کا جال پھیلاتا، خیر و برکت اور جذبۂ ایثار کی ایسی اداکاری کرتا ہے کہ پتھروں کو بھی موم کر لیتا ہے۔

یہ ہے ابلیسیت کا حُسن اور شر کی سحر انگیزی!

اللہ تبارک و تعالیٰ نے ایسے ہی لوگوں کے متعلق فرمایا ہے:

"انہیں باطل (اور بیہودہ باتوں) میں پڑا رہنے دو اور انہیں اپنا کھیل کھیل لینے دو اُس دن تک جس دن کا ان کے ساتھ وعدہ کیا گیا ہے" ——

(سورہ المعارج۔ آیت 42)۔

حسن بن صباح اُس دن سے پہلے پہلے جس دن کا اللہ نے وعدہ کیا ہے، اپنے عزائم پورے کرنے کی کوشش میں تھا۔ وہ جانتا تھا یہ حساب کا اور عذاب کا دن ہو گا۔

○

حسن بن صباح کو جس طرح مصر سے عبیدیوں نے نکالا اور جس طرح بحری جہاز طوفان کی لپیٹ میں آ کر نکلا اور جس طرح جہاز کے کپتان نے حسن بن صباح کو انعام کے طور پر شام کے ساحل پر اتارا، وہ پچھلے باب میں تفصیل سے بیان ہو چکا ہے۔ وہاں سے طرح کی یہ پُراسرار اور رونگٹے کھڑے کر دینے والی داستان یوں آگے چلتی ہے کہ انطاکیہ کی بندرگاہ میں اُترنے والا اکیلا حسن بن صباح نہیں تھا۔ اُس کے ساتھ وہ اس کے اپنے ساتھی تھے جو اُس کے رازدار، ہمدرد اور بہی خواہ تھے، اور سات آٹھ آدمی جن میں ایک جوان عورت بھی تھی، حسن بن صباح کے ساتھ انطاکیہ اُتر گئے تھے۔

ان سات آٹھ آدمیوں نے اس بندرگاہ پر اُترنا تھا جو جہاز کی منزل تھی اور وہاں سے ملک شام جانا تھا۔ ان کی خوش قسمتی کہ حسن بن صباح نے جہاز کا رخ شام کی طرف کرا لیا اور وہ پیدل سفر سے بچ گئے۔

ان کے ساتھ جو عورت تھی وہ اپنا چہرہ نقاب میں رکھتی تھی۔ اُس کی صرف پیشانی اور آنکھوں پر نقاب نہیں ہوتا تھا۔ اُس کی پیشانی سفیدی مائل گلابی تھی جس پر ریشم کی باریک تاروں جیسے چند ایک بے ترتیب بال بہت ہی بھلے لگتے تھے۔ اُس کی آنکھیں غزالی غزال جیسی تھیں جن میں خمار کا سا تاثر تھا جو ان آنکھوں میں آنکھیں ڈالنے والے کو مسحور کر لیتا تھا۔ اُس کے کھڑے قد میں اور چال ڈھال میں جاذبیت تھی اور ایسا

تاڑ گئے کہ یہ کوئی عام عورت نہیں اور اس کا تعلق کسی قبیلے کے سردار خاندان سے یا کسی بڑے ہی امیر کبیر تاجر خاندان سے ہے۔

یہ سب آدمی مصر کی بندرگاہ سکندریہ سے انطاکیہ تک حسن بن صباح کے ہم سفر رہے تھے۔ انہوں نے اتنے زیادہ طوفان میں حسن بن صباح کو پُرسکون بیٹھے اور مسکراتے دیکھا تھا اور وہ اسے پاگل سمجھتے تھے، جسے یہ احساس تک ہی نہیں کہ جہاز ڈوبنے والا ہے اور کوئی بھی زندہ نہیں رہے گا۔ پھر انہوں نے حسن بن صباح کی یہ پیش گوئی سنی تھی کہ جہاز اس طوفان سے بخیر و خوبی گذر جائے گا۔

جہاز بپھرے ہوئے سمندر کی پہاڑوں جیسی طوفانی موجوں پر اوپر کو اٹھ اٹھ کر آخر اس طوفان سے نکل گیا۔ حسن بن صباح کے دونوں آدمیوں نے تمام مسافروں کو بتایا کہ جہاز کو اس برگزیدہ درویش نے طوفان سے نکالا ہے۔ مسافروں نے حسن بن صباح کے ہاتھ چومے اور اس کے آگے رکوع میں جاکر تعظیم و تکریم پیش کی تھی۔

یہ سات آٹھ آدمی تو حسن بن صباح کے گرویدہ ہو گئے تھے۔ سب سے زیادہ اثر تو انہیں پہنچا تھا۔ یہ لوگ پیدل سفر سے بچ گئے تھے۔

○

انطاکیہ میں انہیں رکنا پڑا۔ یہ سرائے میں چلے گئے۔ حسن بن صباح اور اس کے دونوں ساتھیوں نے الگ کمرہ لے لیا اور باقی آدمی ایک بڑے کمرے میں چلے گئے۔ اس عورت اور اس کے خاوند کا کمرہ الگ تھا۔

حسن بن صباح اور اس کے ساتھی نہا چکے تھے اور اب انہوں نے سرائے کے لنگر سے کھانا لینے جانا تھا۔ دروازے پر دستک ہوئی۔ ایک آدمی نے دروازہ کھولا۔ سرائے کا مالک آیا تھا۔

"کیا میں خوش نصیب نہیں کہ آپ نے مجھے میزبانی کی سعادت عطا کی ہے؟" — سرائے کے مالک نے کہا — "میں سرائے کا مالک ابو مختار ثقفی ہوں۔ ابھی ابھی آپ کے مسافروں نے مجھے اپنے بحری سفر کی داستان سنائی ہے۔ خدا کی قسم! جہاز میں آپ نہ ہوتے تو یہ لوگ مجھے اس طوفان کی کہانی سنانے یہاں نہ آتے"۔

"ابو ثقفی؟" — حسن بن صباح نے کہا — "بیٹھ کر بات کرو..... یہ تو بتاؤ، ایک ثقفی اپنے وطن سے اتنی دور کیوں چلا آیا ہے؟"

"سنا ہے میرے آباؤ اجداد حجاج بن یوسف سے عداوت مول لے بیٹھے تھے" — ابو مختار نے جواب دیا — "ان میں سے کچھ قتل کر دیئے گئے، کچھ بھاگ کر وطن سے دور چلے گئے اور میرا کوئی بزرگ ادھر آ نکلا۔ یہ سرائے اس نے تعمیر کی تھی جو ورثے میں مجھ تک پہنچی ہے"۔

"کیا اس سرائے میں صرف مسلمان ٹھہرا کرتے ہیں؟" — حسن بن صباح نے پوچھا۔

"نہیں پیر و مرشد!" — ابو مختار نے جواب دیا — "اس سرائے کے دروازے ہر کسی کے لئے کھلے ہیں۔ یہ سرائے دنیا کی مانند ہے۔ یہاں ہر مذہب، ہر رنگ اور ہر نسل کے لوگ آتے ہیں، کچھ دن گزارتے ہیں اور چلے جاتے ہیں۔ دنیا کی طرح اس سرائے میں بھی آمد و رفت لگی رہتی ہے۔ آپ جیسا ولی اللہ اور غیب کا بھید جاننے والا مدتوں بعد آیا ہے..... کیا میں مطلب کی بات نہ کہہ دوں؟"

"اجازت کی ضرورت نہیں" — حسن بن صباح نے کہا۔

"آج رات کا کھانا میری طرف سے قبول فرمائیں" — ابو مختار نے کہا — "اور میں نے آپ کے لئے الگ کمرہ تیار کیا ہے۔ آپ اسی کمرے میں آجائیں"۔

کچھ دیر بعد حسن بن صباح اس کمرے میں اپنے دونوں ساتھیوں کے ساتھ دسترخوان پر بیٹھا تھا۔ کھانا بہت ہی پُرتکلف تھا۔ تین چار اور اجنبی بھی مدعو تھے۔ یہ ایک کشادہ کمرہ تھا جسے رنگا رنگ ریشمی پردوں اور فانوسوں سے سجایا گیا تھا۔ آدھے سے زیادہ کمرہ خالی تھا۔ دیوار سے دیوار تک دلکش رنگوں والا قالین بچھا ہوا تھا۔ دسترخوان کمرے کے وسط میں نہیں بلکہ ایک طرف چوڑائی والی دیوار کے ساتھ بچھایا گیا تھا۔ دیوار کے ساتھ گاؤ تکیے رکھے ہوئے تھے۔ پیچھے دیوار کے ساتھ ایک قالین لٹک رہا تھا جس پر ہرے بھرے جنگل کا منظر بنا ہوا تھا اور اس میں ایک شفاف ندی بہتی دکھائی گئی تھی۔

مختصر یہ کہ یہ شاہانہ انتظام اور یہ عالیشان ضیافت ایک اعزاز تھا جو حسن بن صباح کو دیا گیا تھا۔

"میں آپ کے مزاج سے واقف نہیں" — سرائے کے مالک نے حسن بن صباح سے کہا — "آپ کے ذوق کا بھی مجھے کچھ پتہ نہیں۔ گستاخی ہی نہ کر بیٹھوں۔ کیا آپ رقص، گانا یا صرف سازوں کی موسیقی پسند کریں گے؟"

"تم نے مجھے کیا سمجھ کر یہ بات پوچھی ہے؟" — حسن بن صباح نے پوچھا۔

"ایک برگزیدہ ہستی ....!" — سرائے کے مالک نے جواب دیا — "اللہ کے بہت قریب آپ ہیں، ہم جیسے گنہگار تصور میں بھی نہیں لا سکتے"۔

"اللہ نے کسی بندے پر کوئی نعمت حرام نہیں کی" — حسن بن صباح نے کہا۔ "رقاصہ کے فن سے لطف اندوز ہونا گناہ نہیں' اس کے جسم کو اپنے قبضے میں لے کر اس سے لطف اور لذت حاصل کرنا بہت بڑا گناہ ہے"۔

"کیا اسلام نیم برہنہ رقاصہ کا رقص دیکھنے کی اجازت دیتا ہے؟" — سرائے کے مالک نے پوچھا۔

"ہاں!" — حسن بن صباح نے جواب دیا — "اسلام جہاد میں ہر مسلمان سے جان کی قربانی مانگتا ہے اور مسلمان نعرے لگاتے ہوئے جانوں کی قربانی دیتے ہیں اس لئے اسلام ہر مسلمان کو دنیا کی ہر لذت اور ہر تفریح سے لطف اٹھانے کی اجازت دیتا ہے"۔

"ہم نے آج تک جو سنا ہے....."

"وہ اسلام کے دشمنوں نے مشہور کیا ہے" — حسن بن صباح نے اپنے میزبان کی بات کاٹتے ہوئے کہا — "یہودیوں اور نصرانیوں نے دیکھا کہ اسلام تھوڑے سے عرصے میں آدھی دنیا میں مقبول ہو گیا ہے تو انہوں نے امام اور خطیب بن کر یہ بے بنیاد بات پھیلا دی کہ اسلام صرف قربانیاں مانگتا ہے اور دیتا کچھ بھی نہیں اور اسلام میں سوائے پابندیوں کے اور کچھ بھی نہیں"۔

تاریخ میں آیا ہے کہ حسن بن صباح اپنے آپ کو اسلام کا علمبردار کہلاتا تھا۔ وہ مسلمانوں کو اسلام کے نام پر مشتعل کر کے انہیں اسلام کے خلاف استعمال کرتا تھا۔ یہ ضرورت اُسے اس لئے پیش آئی تھی کہ اُس نے اپنی سرگرمیوں اور اپنے عزائم کے لئے جو علاقہ منتخب کیا تھا وہ مسلمانوں کی غالب اکثریت کا علاقہ تھا۔

سرائے کے مالک نے حسن بن صباح کی یہ باتیں سنیں تو اُس نے کھانے پر حاضری دینے والے ایک ملازم کی طرف اشارہ کیا۔ ملازم بڑی تیزی سے باہر چلا گیا۔ فوراً ہی وہ واپس آگیا۔ اُس کے پیچھے چار پانچ سازندے ساز اٹھائے کمرے میں آئے اور قالین پر بیٹھ گئے۔

سازوں کی آواز اُبھری تو نیم برہنہ رقاصہ یوں کمرے میں داخل ہوئی جیسے جل پری

خلاف ندی میں تیرتی آرہی ہو۔ سازوں کی دھیمی دھیمی آواز کمر جگا رہی تھی اور نوجوان رقاصہ کا مرمریں جسم ناگن کی طرح بل کھا رہا تھا۔ اُس کے بازو رقص کی اداؤں میں یوں اوپر نیچے اور دائیں بائیں ہو رہے تھے جیسے فردوسِ بریں کے ایک بڑے ہی حسین پودے کی ڈالیاں ہوا کے جھونکوں سے ہل رہی ہوں۔ فانوسوں کی رنگا رنگ روشنیوں کا اپنا ہی ایک حسن تھا۔

دسترخوان پر بیٹھے ہوئے مہمان کھانا بھول گئے۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے اس نوجوان رقاصہ نے سب کو ہپناٹائز کر لیا ہو لیکن حسن بن صباح اس لڑکی کو کسی اور ہی نظر سے دیکھ رہا تھا۔ اُس کی آنکھوں میں کسی جوہری کے اُس وقت کا تاثر تھا جب وہ ہیرا یا کوئی قیمتی پتھر پرکھ رہا ہوتا ہے۔

اس ضیافت' اس رقاصہ' پھر ایک مغنیہ اور سازندوں نے اس رات کو الف لیلہ کی ایک ہزار ایک راتوں جیسی ایک رات بنا دیا تھا۔

○

رات آدھی گذر گئی تھی جب حسن بن صباح ضیافت سے فارغ ہو کر اپنے کمرے میں داخل ہوا۔ سرائے کا مالک بھی اس کے پیچھے کمرے میں چلا گیا۔ حسن بن صباح پلنگ پر بیٹھ گیا۔

"پیر و مرشد!" — سرائے کے مالک نے نماز کی طرح اپنے دونوں ہاتھ پیٹ پر باندھ کر کہا — "کیا میں آپ کی خدمت میں کوتاہی تو نہیں کر رہا؟"

"یہ میرا مطلب نہیں تھا" — حسن بن صباح نے کہا — "مجھے تم بوریئے پر بٹھا کر اور روٹی پر دال رکھ کر دے دیتے تو بھی میں اللہ کا شکر ادا کرتا کہ اس کے ایک بندے نے مجھ پر کتنا بڑا کرم کیا ہے..... اب یہ بتا دو کہ تمہارے دل میں کوئی خاص مراد ہے یا تم کسی پریشانی میں مبتلا ہو؟"

"اے طوفانوں کا منہ پھیر دینے والے امام!" — سرائے کے مالک نے کہا — "پہلے اس شہر میں صرف میری سرائے تھی اور تمام مسافر میری سرائے میں آتے تھے۔ تھوڑے عرصے سے دو یہودیوں نے ایک سرائے کھول لی ہے۔ وہ مسافروں کو شراب بھی پیش کرتے ہیں لڑکیاں بھی۔ اس سے میری آمدنی بہت کم ہو گئی ہے۔ آپ کو اللہ نے ایسی طاقت عطا کی ہے....."

"اُن کا بیڑہ غرق کرتا ہے یا اپنا بیڑہ پار لگاتا ہے؟" — حسن بن صباح نے اُس کی بات کاٹ کر پوچھا۔

"یہ فیصلہ آپ ہی کر سکتے ہیں حضور!" — سرائے کے مالک نے کہا — "میں تو چاہتا ہوں کہ میری آمدنی پہلے جتنی ہو جائے"۔

"ہو جائے گی" — حسن بن صباح نے کہا — "کل ایک کالا بکرا ذبح کرا خواہ چھوٹا سا ہی ہو۔ اُس کے دونوں شانوں کی ہڈیاں میرے پاس لے آنا..... اور مجھے یہ بتا کہ یہ رقاصہ کس کی ملکیت ہے؟"

"ایک بوڑھی رقاصہ کی بیٹی ہے یا وَلی!" — سرائے کے مالک نے جواب دیا — "زیادہ تر میں ہی اسے اپنی سرائے میں خاص مہمانوں کے لئے بلایا کرتا ہوں..... کیا حضور کے دل کو یہ اچھی لگی ہے؟"

"ہاں!" — حسن بن صباح نے جواب دیا — "لیکن اس مقصد کے لئے نہیں جو تم سمجھ رہے ہو۔ اگر تم اس کی ماں کو بلاؤ تو میں اُسے اس لڑکی کے متعلق کچھ بتانا بہت ضروری سمجھتا ہوں۔ وہ اس لڑکی کو صرف جسم سمجھتی ہو گی لیکن یہ کمسن لڑکی جسم سے کہیں زیادہ کچھ اور ہے"۔

سرائے کے مالک نے ایک ملازم کو بلا کر کہا کہ رقاصہ اور اس کی ماں کو یہاں لے آئے۔ وہ دونوں ابھی گئی نہیں تھیں۔ اطلاع ملتے ہی آ گئیں۔ سرائے کا مالک انہیں پہلے ہی حسن بن صباح کے متعلق بتا چکا تھا کہ یہ کوئی امام یا ولی ہے اور اس کے ہاتھ میں کوئی ایسی روحانی طاقت ہے جو طوفانوں کو روک دیتی ہے۔ رقاصہ اور اس کی ماں نے بے تابی سے خواہش ظاہر کی تھی کہ وہ حسن بن صباح سے ملنا چاہتی ہیں۔ وہ اپنے آپ کو خوش قسمت سمجھ رہی تھیں کہ امام نے خود ہی انہیں بلا لیا تھا۔

وہ کمرے میں داخل ہوئیں تو حسن بن صباح نے دیکھا کہ رقاصہ ابھی رقص کے لباس میں تھی۔ یہ کوئی لباس نہیں تھا کمر سے اس نے ریشم کی رنگا رنگ رسیاں لٹکا رکھی تھیں۔ ان رسیوں نے اس کا کمر سے نیچے جسم ڈھانپ رکھا تھا لیکن وہ چلتی پھرتی یا ناچتی تھی تو اس کی ٹانگیں رسیوں سے باہر آ جاتی تھیں۔ اُس کے سینے کا کل لباس ایک انگیا تھی۔ اُس کے شانوں اور پیٹھ کو اُس کے نرم و ملائم بالوں نے ڈھانپ رکھا تھا جو اُس نے کھلے چھوڑے ہوئے تھے۔

"مستور ہو کر آ لڑکی!" — حسن بن صباح نے کہا — "میں تیرے جسم کا طلبگار نہیں۔ میں تیری روح کو برہنہ کر کے دیکھوں گا اور تجھے بھی دکھاؤں گا تو اپنی روح سے انجان ہے" — اُس نے رقاصہ کی ماں سے کہا — "جا اسے ایسے کپڑے پہنا کے لا کہ اس کے صرف ہاتھ نظر آئیں اور کچھ چہرہ نظر آئے"۔

ماں بیٹی چلی گئیں۔ سرائے کا مالک وہیں بیٹھا رہا۔

"تمہارا کام ہو جائے گا" — حسن بن صباح نے اُسے کہا — "جب یہ ماں بیٹی آئیں تو تم چلے جانا اور صبح میرے پاس آنا"۔

سرائے کا مالک بھی چلا گیا۔

○

رقاصہ اور اُس کی ماں آ گئیں۔ رقاصہ نے ویسا ہی لباس پہن رکھا تھا جیسا حسن بن صباح نے اسے کہا تھا۔ اس لباس نے اس کے چہرے کے نقش و نگار میں سحر انگیز نکھار پیدا کر دیا تھا۔ وہ نوجوان تھی لیکن اب وہ کمسن لگتی تھی..... معصوم سی لڑکی!

"کیا تجھے یہ اس لباس میں اچھی نہیں لگتی؟" — حسن بن صباح نے رقاصہ کی ماں سے پوچھا۔

"ہاں مرشد!" — ماں نے جواب دیا — "یہ مجھے اسی لباس میں اچھی لگتی ہے"۔

"اس لئے یہ اچھی لگتی ہے کہ یہ ایک پاک روح ہے" — حسن بن صباح نے کہا — "پاک جسم نہیں۔ اس کی قیمت پہچان؟"

"میرے مرشد!" — رقاصہ کی ماں نے کہا — "میں بھٹکی ہوئی ایک بے آسرا عورت کیا جانوں ہم ماں بیٹی کا کل کیسا ہو گا۔ ہم نے آپ کی کرامت سنی تو سرائے کے مالک سے التجا کی یہ مجھے آپ کے حضور پیش کر دے اور میں آپ سے پوچھوں کہ بیٹی کو اسی پیشے میں رکھوں یا کوئی اور راستہ دیکھوں۔ مجھے آنے والے وقت کی کچھ خبر دے دیں"۔

حسن بن صباح نے سحر اور علم نجوم میں دسترس حاصل کر لی تھی۔ اُس نے نوجوان رقاصہ کا دایاں ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں لے کر پھیلایا اور اس کی آڑی ترچھی لکیریں دیکھنے لگا۔ رقاصہ نے اس انتظار میں حسن بن صباح کے چہرے پر نظریں گاڑ دی تھیں کہ دنیا کا یہ برگزیدہ انسان جو بحری جہاز کو ایک خوفناک طوفان کے جبڑوں سے صحیح و

سلامت نکال لایا تھا‘ وہ اس کے ہاتھ کی لکیریں دیکھ کر کیا پیش گوئی کرتا ہے۔

حسن بن صباح کے چہرے کے تاثرات میں تبدیلیاں نظر آرہی تھیں۔ ایک بار اُس نے اپنا سر یوں پیچھے کیا جیسے رقاصہ کی ہتھیلی کی کوئی لکیر سانپ بن گئی ہو۔ رقاصہ اور اُس کی ماں بھی چونک پڑیں۔

"کیا دیکھا ہے میرے مُرشد!" — سلمیٰ نے سہمی ہوئی آواز میں پوچھا۔

"پردے اُٹھ رہے ہیں" — حسن بن صباح نے اس عورت کی طرف دیکھے بغیر زیرِ لب کہا۔

پھر اُس نے رقاصہ کا ہاتھ چھوڑ دیا اور اُس کا چہرہ اپنے دونوں ہاتھوں کے پیالے میں لے کر ذرا اوپر اُٹھایا۔

"آنکھیں پوری کھلی رکھو" — اُس نے رقاصہ سے کہا۔

اُس کی آنکھوں نے رقاصہ کی آنکھوں کو جکڑ لیا۔ حسن بن صباح نے دونوں انگوٹھوں سے رقاصہ کی کنپٹیاں آہستہ آہستہ ملنی شروع کر دیں۔ وہ زیرِ لب کچھ کہہ رہا تھا۔

کچھ دیر بعد رقاصہ نے دھیمی سی آواز میں کہا — "میں نے سیاہ پردے کے پیچھے دیکھ لیا ہے..... میں جاؤں گی..... یہ جسم نہ گیا تو میں اس سے آزاد ہو کر وہاں پہنچ جاؤں گی"۔

"یہ جسم تمہارے ساتھ جائے گا" — حسن بن صباح نے کہا۔

"یہ جسم میرے ساتھ جائے گا" — رقاصہ نے کہا۔

"کیا کرو گی اس جسم کو؟" — حسن بن صباح نے پوچھا۔

"یہ جسم بلوچ گا نہیں" — رقاصہ نے کہا — "یہ دوسروں کو نچائے گا"۔

"تمہیں ایک قلعہ نظر آرہا ہے" — حسن بن صباح نے کہا۔

رقاصہ خاموش رہی۔ حسن بن صباح نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے ہوئے چھ سات مرتبہ کہا — "تمہیں ایک قلعہ نظر آرہا ہے"۔

"ہاں!" — رقاصہ نے کہا — "مجھے ایک قلعہ نظر آرہا ہے"۔

"اس قلعے میں تم اپنے آپ کو دیکھ رہی ہو" — حسن بن صباح نے خوابناک سی آواز میں کہا اور یہ الفاظ چند مرتبہ دُہرائے۔

"دیکھو ہاں!" — رقاصہ نے بچوں کی طرح مچلتے ہوئے کہا — "میں اپنے آپ کو دیکھ رہی ہوں"۔

"اپنے آپ کو کس حال میں دیکھ رہی ہو؟"

"چار لڑکیاں ہیں" — رقاصہ نے کہا — "شہزادیاں لگتی ہیں۔ میں انہی جیسے لباس میں ہوں اور ہم سب ایک خوشنما باغ میں اٹھکیلیاں کرتی پھر رہی ہیں"۔

حسن بن صباح نے رقاصہ کا چہرہ چھوڑ دیا اور کچھ دیر اُس کی آنکھوں میں دیکھتا رہا۔ رقاصہ نے اپنی آنکھیں تیزی سے جھپکیں اور سر جھکا لیا۔ اُس نے جب سر اٹھایا تو اُس کے چہرے پر حیرت کا تاثر تھا۔ وہ آنکھیں پھاڑے کبھی حسن بن صباح کو اور کبھی اپنی ماں کو دیکھتی تھی۔ حسن بن صباح مسکرا رہا تھا۔

"میں کہاں چلی گئی تھی؟" — رقاصہ نے حیرت زدہ آواز میں پوچھا — "میں ایک تاریکی میں سے گذری تھی اور آگے کوئی اور ہی دنیا آگئی تھی"۔

"تمہاری اصل جگہ اُس دنیا میں ہے جو تم نے دیکھی ہے" — حسن بن صباح نے کہا — "اب تم جہاں ہو یہ ایک فریب اور حسین دھوکہ ہے۔ یہاں تمہارا انجام بہت بُرا ہو گا۔ میرے خدا نے تمہاری قسمت میں بہت اونچا مقام لکھا ہے۔ میں نے تمہیں وہ مقام دکھا دیا ہے..... ماں کو بتاؤ تم نے کیا دیکھا ہے"۔

رقاصہ نے اپنی ماں کو بتایا۔

"لیکن پیرو مُرشد!" — رقاصہ کی ماں نے پوچھا — "ہم اُس مقام تک پہنچ کس طرح سکتی ہیں؟ کیا آپ ہماری راہنمائی اور مدد کر سکتے ہیں؟"

"کر سکتا ہوں" — حسن بن صباح نے کہا — "لیکن کروں گا نہیں..... میں تمہیں اس کی وجہ بھی بتا دیتا ہوں۔ انسان کی فطرت ایسی ہے کہ میں تو انسان ہوں‘ انسان اللہ کی عطا کی ہوئی نعمتوں سے بھی مطمئن نہیں ہوتا۔ میں نے دو تین آدمیوں کو اسی طرح ان کے اصل مقام دکھائے اور انہیں وہاں تک پہنچا بھی رہا تھا لیکن تھوڑے ہی عرصے بعد انہوں نے میرے خلاف باتیں شروع کر دیں۔ اب تو میں کسی کو اس کے متعلق کچھ بتاتا نہیں۔ تم عورت ہو اور مجبوریوں نے یا درہم و دینار کے لالچ نے تمہیں غلط اور خطرناک راستے پر ڈال رکھا ہے۔ پھر مجھے تمہاری اس بچی کا خیال آتا ہے۔ میں نے اس کا اصل روپ دیکھ لیا ہے۔ تم نے اس پر بہروپ چڑھا دیا ہے۔ میں اسے اس کے

مقام تک پہنچانا چاہتا ہوں۔ تم اس کے ساتھ ہو گی اور تمہیں بھی تمہاری کھوئی ہوئی تعظیم اور تکریم ملے گی"۔

"پھر ہم پر کرم کیوں نہیں کرتے یا مرشد!" — ماں نے التجا کی۔

"صرف ایک صورت میں کرم ہو سکتا ہے" — حسن بن صباح نے کہا — "اپنی سوچیں میرے حوالے کر دو۔ اپنے آپ کو بھی میرے حوالے کر دو"۔

"کر دیا مرشد!" — ماں نے کہا — "آپ جو حکم دیں گے ہم ماں بیٹی مانیں گی"۔

"پھر سن لو!" — حسن بن صباح نے کہا — "میں جب یہاں سے جاؤں گا تو تم دونوں میرے ساتھ چلو گی"۔

"چلیں گی یا مرشد!" — رقاصہ کی ماں نے کہا۔

"آج کا رقص تمہارا آخری رقص تھا" — حسن بن صباح نے نوجوان رقاصہ سے کہا — "اب تمہاری نئی اور حقیقی زندگی شروع ہو گئی ہے..... جاؤ اور سو جاؤ..... صبح سے بیمار پڑ جانا۔ سر کپڑے سے باندھ لینا۔ اس سرائے والا یا دوسرے سرائے کے یہودی تمہیں رقص کے لئے بلانے آئیں تو ہائے ہائے شروع کر دینا جیسے تم اس بیماری سے مری جا رہی ہو۔ میری کہنا کہ انہیں بلاؤ میرا علاج کریں۔ میں آ کر کوئی بیماری بتا کر سب کو ڈرا دوں گا کہ اس لڑکی کے قریب کوئی نہ آئے ورنہ اسے بھی یہ بیماری لگ جائے گی"۔

ماں بیٹی چلی گئیں۔ انہیں بتانے والا کوئی نہ تھا کہ اس شخص نے انہیں ایک عمل سے مسحور کر لیا تھا۔ یہ تھا عمل تنویم جسے مغرب والے اپنی زبان میں ہپناٹزم کا نام دیا ہے۔

حسن بن صباح نے رقاصہ کو اپنے کام کی چیز سمجھ کر اسے ہپناٹائز کر لیا تھا اور رقاصہ کو وہی کچھ نظر آ رہا جو حسن بن صباح اسے دکھانا چاہتا تھا۔

عمل تنویم کا تو اپنا اثر تھا، حسن بن صباح کے بولنے کے انداز کا اپنا ایک اثر تھا جو سننے والے کو مسحور کر لیتا تھا۔ یورپی تاریخ نویسوں نے بھی لکھا ہے کہ حسن بن صباح نے اپنے آپ میں ایسے اوصاف پیدا کر لئے تھے جو دوسروں کو اپنا گرویدہ بنا لیتے تھے۔ یہ ابلیسی اوصاف تھے۔

رقاصہ اور اس کی ماں کے جانے کے بعد حسن بن صباح کے دونوں ساتھی اس کے کمرے میں آ گئے۔

"میں نے اپنی ترکش میں ایک اور تیر ڈال لیا ہے" — حسن بن صباح نے فاتحانہ لہجے میں اپنے ساتھیوں سے کہا — "یہ رقاصہ ایسا دانہ ہے کہ عقابوں اور شہبازوں کو بھی جال میں لے آئے گا"۔

"ہمارے ساتھ جا رہی ہے؟" — اس کے ایک ساتھی نے پوچھا۔

"دونوں ہمارے ساتھ جا رہی ہیں" — حسن بن صباح نے کہا — "انہیں کسی طرح چھپا کر ساتھ لے جانا پڑے گا"۔

"یہ انتظام ہو جائے گا" — دوسرے نے کہا۔

○

دوسرے دن حسن بن صباح کے کمرے کے باہر اسے ملنے والوں کا ایک ہجوم جمع ہو گیا تھا لیکن کسی کو کمرے میں جانے نہیں دیا جا رہا تھا۔ لوگوں کو بتایا گیا تھا کہ "امام" عبادت میں مصروف ہیں۔

کچھ دیر بعد ایک آدمی اور ایک عورت کو اندر جانے کی اجازت دی گئی۔ یہ میاں بیوی تھے اور یہ سکندریہ سے انطاکیہ تک حسن بن صباح کے ہمسفر تھے۔ یہ وہی عورت تھی جس کا پہلے ذکر آیا ہے کہ چہرہ نقاب میں رکھتی تھی۔ صرف پیشانی اور آنکھوں پر نقاب نہیں تھا۔ پیشانی اور آنکھوں سے پتہ چلتا تھا کہ عورت حسین ہے۔ اس کے کھڑے قد میں کشش تھی۔ اس کی چال ڈھال میں ایسا جلال سا تھا جس سے لگتا تھا جیسے یہ کسی سردار خاندان کی خاتون ہو۔ بہرحال وہ کوئی معمولی عورت نہیں لگتی تھی۔

کمرے میں جا کر اس عورت کے خاوند نے حسن بن صباح کے آگے رکوع میں جا کر مصافحہ کیا۔ وہ پیچھے ہٹا تو عورت نے آگے بڑھ کر حسن بن صباح کا دایاں ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں لے کر پہلے آنکھوں اور پھر ہونٹوں سے لگایا پھر اس کا ہاتھ احترام سے اس کی گود میں رکھ دیا۔

"بیٹھ جاؤ میرے ہمسفرو!" — حسن بن صباح نے کہا اور خاوند سے پوچھا — "تم لوگ کہاں گئے تھے اور کس منزل کے مسافر ہو؟"

"ہماری منزل رے ہے" — خاوند نے جواب دیا — "میں اصلاً اصفہانی ہوں..... خلجہ اصفہانی میرا نام ہے..... رزق کے پیچھے بہت سفر کیا ہے اور اللہ نے جھولی بھر کے رزق دیا ہے..... دوسری تلاش علم کی ہے۔ علم کے حصول کے لئے بہت سفر کیا ہے

تھا مصر میں دو عالم ہیں جن کے پاس علم کا سمندر ہے۔ میں اپنی اس بیوی کو ساتھ لے کر مصر گیا تھا۔ ان علماء سے ملا لیکن انہوں نے علم کو اپنے ہی ایک نظریئے میں محدود کر دیا ہے"۔

"وہ عبیدی ہیں" — حسن بن صباح نے کہا — "اور ظاہر کرتے ہیں کہ اسماعیلی ہیں..... تم کس فرقے اور کس عقیدے کے آدمی ہو؟"

"یا ولی!" — حافظ اصفہانی نے کہا — "میں ایک اللہ کو مانتا ہوں جو وحدہٗ لاشریک ہے' اس کے آخری کلام کو مانتا ہوں جو قرآن ہے اور اللہ کے آخری رسول محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو مانتا ہوں جن کے ذریعے اللہ کا کلام ہم تک پہنچا۔ اس سے زیادہ مجھے کچھ علم نہیں کہ میں کون سے فرقے سے تعلق رکھتا ہوں"۔

"اور اب رے کہاں جا رہے ہو؟"

"ابو مسلم رازی سے ملوں گا" — حافظ اصفہانی نے جواب دیا — "وہ وہاں امیر ہے۔ اللہ کو ماننے والا حاکم ہے"۔

"اس سے تمہیں کیا حاصل ہو گا؟"

"میں نے اسے کچھ بتانا ہے" — حافظ اصفہانی نے جواب دیا — "میں خلجان گیا تھا۔ وہاں ایک بڑا ہی خطرناک فرقہ سر اٹھا رہا ہے۔ ایک شخص احمد بن عطاش نے خلجان پر قبضہ کر لیا ہے۔ سنا ہے وہ شعبدہ بازی اور سحر کا ماہر ہے۔ سنا تھا کہ قلعہ شاہ در اور خلجان کے درمیان علاقے میں ایک پہاڑی پر اللہ کا ایلچی اُترا تھا اور اس علاقے کے لوگوں نے اسے دیکھتے ہی اللہ کا ایلچی مان لیا ہے۔ اس ایلچی کا نام حسن بن صباح ہے..... وہ آپ کا ہم نام ہے..... بلکہ میں تو یہ کہوں گا کہ وہ آپ کے نام کی توہین ہے۔ آپ اللہ کے محبوب اور برگزیدہ بندے ہیں۔ میں نہیں سمجھ سکتا کہ آپ کو ولی کہوں یا امام کہوں"۔

"تم نے اس کا نام غلط سنا ہے" — حسن بن صباح نے کہا — "اس کا نام الحسن ابن سبا ہے۔ لوگوں نے اسے حسن بن سبا بنا دیا ہے"۔

"یہ تو بہت ہی اچھا ہے" — حافظ اصفہانی نے کہا — "اس کا صحیح نام سن کر مجھے روحانی اطمینان ہو گیا ہے۔ آپ کے نام کی بے ادبی نہیں ہو رہی۔ سنا ہے اس الحسن ابن سبا کی زبان میں اور بولنے کے انداز میں ایسا جادو ہے کہ پتھروں کو بھی موم کر لیتا ہے۔ یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ اس نے اور احمد بن عطاش نے لوگوں کی ایک فوج تیار کر

لی ہے۔ یہ باقاعدہ فوج نہیں۔ لوگ اپنے اپنے گھروں میں رہتے ہیں۔ انہیں تیغ زنی' تیر اندازی' برچھی بازی اور گھوڑ سواری کی تربیت دی جاتی ہے"۔

"کیا تم ان لوگوں کے متعلق ابو مسلم رازی کو بتاؤ گے؟" — حسن بن صباح نے پوچھا۔

"ہاں یا ولی!" — حافظ اصفہانی نے جواب دیا — "میں تو سلطان ملک شاہ تک بھی پہنچوں گا اور اسے احساس دلاؤں گا کہ وہ اس باطل فرقے کو طاقت سے ختم کرے..... مجھے یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ بڑی مدت سے یہ لوگ قافلوں کو لوٹ رہے ہیں۔ وہ زر و جواہرات لوٹتے ہیں اور لڑکیوں کو اپنے ساتھ لے جاتے ہیں۔ آٹھ دس سال عمر کی بچیوں کو بھی لے جاتے ہیں۔ انہیں اپنے مذموم مقاصد اور عزائم کے مطابق تربیت دیتے ہیں۔ زر و جواہرات کا استعمال بھی یہی ہوتا ہے"۔

"میں جانتا ہوں" — حسن بن صباح نے کہا — "وہ بہت خطرناک لوگ ہیں"۔

○

حافظ اصفہانی کو معلوم نہ تھا کہ اس نے جس حسن بن صباح کی باتیں سنی ہیں وہ یہی شخص ہے جسے وہ ولی اور امام کہہ رہا ہے اور احمد بن عطاش اس کا استاد ہے۔ حسن بن صباح حافظ اصفہانی سے یہ باتیں سن کر ذرا سا بھی نہ چونکا نہ اس نے کسی ردِ عمل کا اظہار کیا' بلکہ حافظ اصفہانی کی باتوں کی تائید کرتا اور احمد بن عطاش پر لعنتیں بھیجتا رہا۔

"آپ ایک عرض سن لیں یا ولی!" — حافظ اصفہانی نے کہا — "اجازت ہو تو کہوں"۔

"اجازت کی کیا ضرورت ہے؟" — حسن بن صباح نے کہا — "کہو جو کہنا ہے"۔

"اولاد سے محروم ہوں" — حافظ اصفہانی نے کہا — "پہلی بیوی سے بھی اولاد نہیں ہوئی۔ وہ فوت ہو گئی تو کچھ عرصے بعد میں نے اس کے ساتھ شادی کر لی"۔

"اس کے ساتھ کب شادی کی ہے؟" — حسن بن صباح نے پوچھا۔

"بارہ تیرہ سال ہو گئے ہیں" — حافظ اصفہانی نے جواب دیا — "اس کا پہلا خاوند ایک قافلے میں ڈاکوؤں کے ہاتھوں مارا گیا تھا"۔

"کیا اس سے اس کا کوئی بچہ تھا؟"

"ایک بچی تھی!" — حافظ نے جواب دیا — "نو دس سال کی تھی۔ ڈاکو اسے اٹھا

لے گئے تھے"۔

"بہت خوبصورت بچی تھی" ــــ حافظ کی بیوی نے کہا ــــ "مجھے اُس سے بہت پیار تھا۔ شاید یہ اُس کے غم کا اثر ہے کہ میں کوئی بچہ پیدا نہ کر سکی"۔

"اور مجھے اس بیوی سے اتنا پیار ہے کہ میں صرف اولاد کی خاطر دوسری شادی نہیں کروں گا" ــــ حافظ اصفہانی نے کہا ــــ "آپ کو اللہ نے کرامت عطا کی ہے"۔

"چہرے سے نقاب ہٹا دو" ــــ حسن بن صباح نے عورت سے کہا۔

عورت نے چہرہ بے نقاب کیا تو حسن بن صباح کو ایسا دھچکا لگا کہ وہ بدک گیا اور اس کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔ اس کی ایک وجہ تو شاید یہ ہو گی کہ یہ عورت غیر معمولی طور پر حسین تھی۔ اس کی عمر زیادہ تھی لیکن اُس کے چہرے پر معصومیت ایسی کہ وہ پچیس سال کی جوان لڑکی لگتی تھی۔

حسن بن صباح کے بدک جانے کی دوسری وجہ یہ تھی کہ اسے یوں لگا جیسے شمونہ نے اس کے سامنے اپنا چہرہ بے نقاب کر دیا ہو۔ شمونہ وہ لڑکی تھی جسے حسن بن صباح لے گیا تھا اور اسے اپنی بیوی بنا لیا اور نام فاطمہ بتایا تھا۔ وہ نظام الملک کی جگہ وزیر اعظم بننے کے لئے اس لڑکی کو استعمال کر رہا تھا کہ بھانڈہ پھوٹ گیا اور اسے اس لڑکی کے ساتھ شہر بدر کر دیا گیا تھا۔

اب اس کے سامنے جو چہرہ بے نقاب ہوا تھا وہ اسی لڑکی کا چہرہ تھا جس کا نام شمونہ تھا۔

"تمہارا نام کیا ہے؟" ــــ حسن بن صباح نے اس سے پوچھا۔

"میمونہ!" ــــ عورت نے جواب دیا۔

حسن بن صباح عام سے دماغ والا انسان نہیں تھا۔ اس نے اپنے دماغ میں ایک طاقت پیدا کر لی تھی جسے تین مؤرخوں نے مافوق العقل کہا ہے۔

"میمونہ!" ــــ حسن بن صباح نے کہا ــــ "تمہیں واقعی اپنی بیٹی سے بہت محبت تھی۔ اسی لئے تم نے اس کا نام شمونہ رکھا تھا۔ یہ نام تمہارے نام سے ملتا ہے"۔

یہ حسن بن صباح کی قیاس آرائی یا قیافہ شناسی تھی۔ اس عورت کی بیٹی تھک سے اغوا ہوئی تھی اور اس کی بیٹی کی شکل اس کے ساتھ ملتی تھی اس لئے حسن بن صباح نے بڑی گہری سوچ سے ہوا میں تیر چلایا جو ٹھیک نشانے پر جا لگا۔

"یا امام!" ــــ میمونہ نے حیرت زدگی کے عالم میں کہا ــــ "میں نے تو آپ کو اپنی بیٹی کا نام نہیں بتایا تھا!"

"نہیں میمونہ!" ــــ حسن بن صباح نے کہا ــــ "اگر تمہارے بتانے سے مجھے تمہاری بیٹی کا نام معلوم ہوتا تو پھر میرا کیا کمال ہوا!"

"یا امام!" ــــ میمونہ نے کہا ــــ "میں نے آپ کو امام مان لیا ہے..... آپ کو یہ بھی معلوم ہو گا کہ وہ زندہ ہے یا نہیں' اگر زندہ ہے تو کہاں ہے"۔

حسن بن صباح نے اپنے آپ پر مراقبے کی کیفیت طاری کر لی۔ آنکھیں بند کر لیں۔ ہاتھوں سے عجیب طرح کی حرکتیں کرنے لگا پھر ایک بار اُس نے تالی بجائی۔

"کہاں مر گئے تھے؟" ــــ اُس نے کہا ــــ "میرے سوالوں کے جواب دو..... ہوں ..... اچھا..... وہ ہے کہاں؟..... ٹھیک ہے..... ہاں..... تم جا سکتے ہو"۔

"وہ زندہ ہے" ــــ حسن بن صباح نے مراقبے سے بیدار ہو کر میمونہ سے کہا ــــ "اور اُسے رے میں دیکھا گیا ہے"۔

"کیا یہ پتہ چل سکتا ہے کہ رے میں وہ کہاں مل سکتی ہے؟" ــــ میمونہ نے پوچھا۔

"امیر شہر ابو مسلم رازی سے اس کا سراغ مل سکتا ہے" ــــ حسن بن صباح نے جواب دیا ــــ "شمونہ کے ساتھ مجھے ابو مسلم رازی کا چہرہ بھی نظر آیا ہے"۔

کیا حسن بن صباح کو عالم غیب سے اشارہ ملا تھا کہ شمونہ زندہ ہے اور رے میں ہے؟ کیا اس نے کسی پُراسرار عمل کے ذریعے معلوم کر لیا تھا؟

نہیں..... داستان گو پچھلے باب میں اصل حقیقت بیان کر چکا ہے۔ حسن بن صباح نے رے سے مفرور ہوتے وقت حکم دیا تھا کہ شمونہ کو خلجان پہنچا دیا جائے جہاں دوسری لڑکیوں کے سامنے اسے قتل کیا جائے گا لیکن حسن بن صباح کو فرار ہو کر مصر جانا پڑا۔ فرار سے پہلے اسے اطلاع مل گئی تھی کہ شمونہ کہیں بھاگ گئی ہے' پھر اسے یہ اطلاع بھی ملی تھی کہ شمونہ ابو مسلم رازی کے پاس چلی گئی ہے۔

میمونہ یہ سمجھ رہی تھی کہ حسن بن صباح کو مراقبے میں یہ جنات نے بتایا ہے کہ شمونہ اس وقت کہاں ہے۔

"کیا میری بیٹی مجھے مل جائے گی؟" ــــ میمونہ نے پوچھا۔

"ہاں" ــــ حسن بن صباح نے جواب دیا ــــ "مل جائے گی"۔

"یا اللہ!" — میمونہ نے کہا — "آپ یہ بتا دیں کہ میرا کوئی اور بچہ ہوگا یا نہیں؟"

حسن بن صباح ایک بار پھر مراقبے میں چلا گیا۔

"نہیں، نہیں!" — کچھ دیر بعد آنکھیں بند کئے ہوئے وہ اپنے آپ سے باتیں کرنے کے انداز سے بولا — "کچھ کرو...... کوئی طریقہ، کوئی ذریعہ بتاؤ۔ میں انہیں اللہ بچے دینا چاہتا ہوں...... اچھا...... ہاں، بتاتے چلو...... قبر کی نشانی بتاؤ...... ٹھیک ہے"۔

حسن بن صباح نے خاصی دیر بعد آنکھیں کھولیں۔

"ایک بچے کی امید بندھ گئی ہے" — حسن بن صباح نے میمونہ کے خاوند سے کہا — "لیکن میرے جنات نے جو طریقہ بتایا ہے وہ ذرا خطرناک ہے۔ ضروری نہیں کہ اس میں جان چلی جائے۔ میں تمہاری حفاظت کا انتظام کر دوں گا لیکن خطرے کے لئے بھی تمہیں تیار رہنا چاہئے"۔

"آپ طریقہ بتائیں" — حافظ اصفہانی نے کہا۔

"یہ کام تمہیں ہی کرنا پڑے گا" — حسن بن صباح نے کہا — "میں کاغذ پر لکھ کر اور یہ کاغذ تہہ کر کے تمہیں دوں گا۔ رات کے وقت قبرستان میں جا کر کوئی ایسی قبر دیکھنا جو بیٹھ گئی ہو۔ ایک کدال ساتھ لے جانا۔ قبر میں اتر جانا اور کدال سے اتنی مٹی نکال کر باہر پھینکنا جو تمہارے اندازے کے مطابق تمہارے جسم کے وزن جتنی ہو۔ مٹی دو بالشت چوڑی جگہ سے نکالنا تاکہ گڑھا بنتا چلا جائے۔ یہ گڑھا اس طرف سے کھودنا ہے جس طرف مُردے کا سر ہوتا ہے۔ ہو سکتا ہے مُردے کی کھوپڑی نظر آجائے۔ کھدائی ختم کر دینا اور یہ کاغذ کھوپڑی پر رکھ کر کھودی ہوئی مٹی سے گڑھا بھر دینا اور واپس آجانا۔ اگر کھوپڑی نظر نہ آئے تو یہ اندازہ کر لینا کہ تمہارے جسم کے وزن جتنی مٹی نکل آئی ہے۔ یہ کاغذ گڑھے میں رکھ کر گڑھا مٹی سے بھر کر آجانا۔ گیارہ دنوں بعد تمہیں بیوی خوشخبری سنائے گی"۔

حسن بن صباح کے دونوں ساتھی اُس کے پاس بیٹھے ہوئے تھے۔

"تم دونوں کو معلوم ہے کون سی قبر موزوں ہے" — اس نے ان دونوں ساتھیوں سے کہا — "صبح اسے ساتھ لے جانا اور قبرستان میں کوئی بہت پرانی اور بیٹھی ہوئی قبر اسے دکھا دینا۔ رات کو یہ اکیلا جائے گا"۔

حسن بن صباح نے کاغذ کے ایک پرزے پر کچھ لکھا۔ منہ ہی منہ میں کچھ پڑھ کر

کاغذ پر پھونکیں ماریں، کاغذ کی کئی تہیں کر کے حافظ اصفہانی کو دیا اور کہا کہ اسے کھول کر نہ دیکھے۔

حافظ اور اس کی بیوی میمونہ چلے گئے۔

○

"تم نے اس شخص کی باتیں سن لی ہیں" — حسن بن صباح نے اپنے ساتھیوں سے کہا — "یہ کوئی معمولی آدمی نہیں۔ عہدار اور سردار ہے۔ یہ ابو مسلم رازی کے پاس جا رہا ہے۔ اُسے بتائے گا کہ خلجان میں کیا ہو رہا ہے"۔

"ہمارے خلاف طوفان کھڑا کرے گا" — ایک ساتھی نے کہا — "آپ حکم دیں کیا کرنا ہے"۔

"کیا یہ بتانے کی ضرورت ہے؟" — حسن بن صباح نے کہا — "کل رات یہ قبرستان سے زندہ واپس نہ آئے۔ میں نے اسے سب کچھ تمہاری موجودگی میں بتایا ہے۔ تمہیں قبرستان میں پہلے سے موجود ہونا چاہئے"۔

"اب یہ ہم پر چھوڑ دیں" — اُس کے ساتھی نے کہا — "اس کی لاش اُسی قبر میں پڑی ملے گی جس میں کھدائی کر کے وہ تعویذ رکھنے جائے گا"۔

"اس کی اس بیوی کا کیا بنے گا؟" — دوسرے ساتھی نے پوچھا۔

"یہ ہمارے ساتھ جائے گی" — حسن بن صباح نے کہا — "ہمارے کام کی عورت ہے۔ ہو سکتا ہے اس کے ذریعے اس کی بیٹی شمونہ واپس آجائے"۔

اگلے روز ابھی سورج طلوع ہوا ہی تھا کہ حافظ اصفہانی حسن بن صباح کے ساتھیوں کے کمرے میں گیا۔ وہ انہیں قبرستان لے جانا چاہتا تھا۔ دونوں تیار تھے۔ اُس کے ساتھ چلے گئے۔

وہ ایک وسیع و عریض قبرستان تھا جس میں نئی قبریں بھی تھیں اور پرانی بھی اور کچھ اتنی پرانی کہ ان کے ذرا ذرا سے نشان باقی رہ گئے تھے۔ ضرورت ایسی قبر کی تھی جو بیٹھ گئی ہو یعنی جو اندر کو دھنس گئی ہو۔ قبرستان کا یہ حصہ ایسا تھا جو بارشوں کے بہتے پانی کے راستے میں آتا تھا۔ وہاں دھنسی ہوئی چند قبریں نظر آگئیں۔ ایک قبر اتنی زیادہ دھنس گئی تھی کہ اس میں مدفون مُردے کی کھوپڑی اور کندھوں کی ہڈیاں نظر آرہی تھیں۔

"یہ قبر آپ کا کام کرے گی" — حسن بن صباح کے ایک ساتھی نے کہا —

آپ کو کھدائی نہیں کرنی پڑے گی۔ رات کو اس میں اُتریں اور امام کا دیا ہُوا کاغذ اس کھوپڑی کے منہ میں رکھ دیں پھر اس پر کدال سے مٹی ڈال دیں"۔

"مٹی بہت ساری ڈالنا بھائی صاحب!" ــــ دوسرے ساتھی نے کہا ــــ "اپنے وزن کے برابر مٹی ہو ..... میں آپ کو ایک خطرے سے خبردار کر دینا ضروری سمجھتا ہوں۔ آپ کو ننگی کھوپڑی مل گئی ہے۔ یہ آپ کی مراد پوری کر دے گی اور بہت جلدی کر دے گی لیکن آپ نے ذرا سی بھی بدپرہیزی یا بے احتیاطی کی تو یہ کھوپڑی آپ کی جان لے لے گی"۔

"پھر بھی اس موقع سے ضرور فائدہ اٹھائیں" ــــ دوسرا ساتھی بولا ــــ "امام نے آپ کی حفاظت کا انتظام کر دیا ہے۔ اللہ کا نام لے کر رات کو آجائیں"۔

"میں ضرور آؤں گا" ــــ حافظ اصفہانی نے پُرعزم لہجے میں کہا۔

اُسے بتانے والا کوئی نہ تھا کہ یہ دن اُس کی زندگی کا آخری دن ہے اور اُس کی آنکھیں کل کا سورج نہیں دیکھ سکیں گی۔

○

آدھی رات کے وقت وہ کدال اٹھائے قبرستان میں پہنچ گیا۔

چاندنی اتنی سی تھی جس میں دن میں دیکھی ہوئی قبر تک پہنچنا مشکل نہ تھا۔ وہ جب گھر سے چلا تھا تو میمونہ نے اُسے روک لیا تھا۔

"معلوم نہیں میرے دل پر بوجھ سا کیوں آپڑا ہے" ــــ میمونہ نے کہا تھا ــــ "کیا میں آپ کے ساتھ نہیں چل سکتی؟"

"نہیں میمونہ!" ــــ حافظ نے کہا ــــ "تمہارے سامنے امام نے کہا تھا کہ میں قبرستان میں اکیلا جاؤں۔ یہ شرط ہے جس کی خلاف ورزی ہوئی تو ہماری جانیں خطرے میں آسکتی ہیں"۔

"میری ایک بات مانیں" ــــ میمونہ نے کہا تھا ــــ "مجھے بچہ نہیں چاہیے۔ آپ ہیں تو سب کچھ ہے۔ اس وقت قبرستان میں نہ جائیں"۔

"تم تو بڑے مضبوط دل والی تھیں میمونہ!" ــــ حافظ نے بڑے پیارے انداز میں کہا تھا ــــ "میں میدانِ جنگ میں نہیں جا رہا، میں طوفانی سمندر میں نہیں جا رہا۔ مجھے اللہ حافظ کہو میمونہ! میرے جانے کا وقت ہو رہا ہے"۔

"اللہ حافظ!" ــــ میمونہ نے کہا تھا۔

حافظ اصفہانی جب میمونہ کو اللہ حافظ کہہ کر اس کی نظروں سے اوجھل ہو گیا تھا تو میمونہ کو ہچکی سی آئی اور اس کا دل ڈوب گیا تھا جیسے اُسے غیب سے اشارہ ملا ہو کہ کوئی انہونی ہونے والی ہے۔

وہ اپنے کمرے میں چلی گئی اور دروازہ کھلا رکھا۔ اسے نیند آجانی چاہیے تھی لیکن اس کے جسم کا رواں رواں، ریشہ ریشہ بیدار تھا۔ بے کلی بڑھتی جا رہی تھی۔ رات گزرتی جا رہی تھی۔

رات کا آخری پہر شروع ہو گیا۔ میمونہ کو ذرا سی آہٹ سنائی دیتی تو دوڑ کر دروازے تک جاتی اور مایوس لوٹ آتی۔

اسے مؤذن کی آواز سنائی دی تو میمونہ کے دل سے ہوک اٹھی۔ مؤذن نے اذان کے الفاظ میں اعلان کر دیا تھا کہ رات گزر گئی ہے۔

"اتنا وقت نہیں لگنا چاہیے تھا" ــــ اس کے دل نے کہا۔

دل کانپ رہا تھا۔ اس کا پورا وجود کانپ رہا تھا۔

اُس نے وضو کیا اور مصلے پر کھڑی ہو گئی۔ فجر کی پوری نماز پڑھ کر اُس نے نفل پڑھنے شروع کر دیے۔ ہر چار نفلوں کے بعد ہاتھ پھیلا کر اپنے خاوند کی سلامتی کی دعا مانگی تھی۔

آنسو اُس کا حسن دھوتے رہے۔ اُس کا دل اتنی زور سے دھڑکنے لگا تھا کہ وہ اس کی آواز سن سکتی تھی۔

جب صبح کا اجالا سفید ہو گیا تو وہ حسن بن صباح کے ساتھیوں کے کمرے کی طرف اٹھ دوڑی۔ دونوں ہاتھ زور سے دروازے پر مارے اور کواڑ دھاکے سے کھلے۔ دونوں آدمی ناشتہ کر رہے تھے۔ انہوں نے بدک کر دیکھا۔

"حافظ آدھی رات کے وقت قبرستان میں گئے تھے" ــــ میمونہ نے کہا ــــ "ابھی تک نہیں آئے ..... انہیں دیکھو"۔

"ہم دیکھنے جائیں گے" ــــ ایک نے کہا ــــ "ذرا دل مضبوط کریں۔ وہ آجائیں گے"۔

اس شخص نے دراصل یہ کہا تھا کہ حافظ اصفہانی کبھی واپس نہیں آئے گا۔

گزشتہ رات یہ دونوں حافظ اصفہانی سے پہلے قبرستان میں پہنچ گئے اور اس قبر سے کچھ دور ایک گھنی جھاڑی کے پیچھے چھپ کر بیٹھ گئے تھے۔ چاندنی میں انہوں نے حافظ کو آتا دیکھ لیا۔ وہ قبر میں اُترا اور جھک کر کھوپڑی پر حسن بن صباح کا دیا ہُوا تعویذ رکھنے لگا دونوں اٹھے اور حافظ کے عقب میں جا پہنچے۔

حافظ نے تعویذ کھوپڑی پر رکھ دیا۔ وہ جونہی سیدھا ہُوا، پیچھے سے دو ہاتھوں نے اس کی گردن شکنجے میں جکڑ لی۔ دوسرے آدمی نے اس کے پیٹ میں پوری طاقت سے گھونسے مارنے شروع کر دیئے۔

تھوڑی سی دیر میں حافظ کا جسم ساکت و جامد ہو گیا۔ دونوں نے اچھی طرح یقین کر لیا کہ وہ مر گیا ہے، اسے دھنسی ہوئی قبر میں لٹا دیا اور واپس آ گئے۔

صبح میمونہ ان کے کمرے میں گئی اور بتایا کہ اس کا خاوند واپس نہیں آیا۔ دونوں نے جلدی جلدی ناشتہ کیا اور قبرستان کی طرف چل دیئے۔ میمونہ نے کہا کہ وہ بھی ساتھ جائے گی۔ انہوں نے اسے ساتھ لے لیا۔

قبرستان میں پہنچے تو دُور سے انہیں اس قبر کے ارد گرد چند ایک آدمی کھڑے نظر آئے۔ وہ میمونہ کے ساتھ پہنچے تو میمونہ کو دھنسی ہوئی قبر میں اپنے خاوند کی لاش پڑی دکھائی دی۔ میمونہ کی چیخ نکل گئی۔

لوگوں کی مدد سے لاش اٹھا کر سرائے میں لے آئے۔ حسن بن صباح کو اطلاع ملی تو دوڑا باہر آیا۔ اُسے تو اُس کے ساتھیوں نے رات کو آ کر بتا دیا تھا کہ وہ اس کے حکم کی تعمیل کر آئے ہیں۔ حسن بن صباح نے انہیں خاص شراب پلائی تھی۔

"یاد رکھو دوستو!" — حسن بن صباح نے انہیں کہا تھا — "جس پر ذرا سا بھی شک ہو اُسے ختم کر دو۔ یہ شخص ہمارے لئے خطرناک ہو سکتا تھا۔ اس کی بیوی اب ہمارے ساتھ رہے گی۔ اس کے پاس مال و دولت بھی ہے۔ یہ بھی اب ہمارا ہے..... اب صبح کا انتظار کرو"۔

صبح اسے اطلاع ملی کہ قبرستان سے حافظ اصفہانی کی لاش آئی ہے تو وہ کمرے سے دوڑتا نکلا اور لاش تک پہنچا۔ اُس نے لاش کو ہر طرف سے دیکھا، دونوں ہتھیلیاں رکھیں اور گھبراہٹ کی ایسی اداکاری کی کہ دیکھنے والوں پر خوف و ہراس طاری ہو گیا۔ اُس نے میمونہ کو دیکھا جس کی آنکھیں رو رو کر سوج گئی تھیں۔

"میمونہ!" — حسن بن صباح نے کہا — "میرے ساتھ آؤ..... جلدی..... ایک لمحہ دیر نہ لگانا" — اُس نے اپنے ایک ساتھی سے کہا — "تم بھی میرے ساتھ آؤ۔ وقت بہت تھوڑا رہ گیا ہے"۔

وہ میمونہ اور اپنے ساتھی کو اپنے کمرے میں لے گیا اور دروازہ بند کر لیا۔

"دروازہ بند کر دو میمونہ!" — اُس نے گھبرائے ہوئے لہجے میں کہا — "فرش پر بیٹھ جاؤ۔ تمہارا خاوند کوئی غلطی کر بیٹھا ہے۔ ایک بڑی ہی خبیث بدروح نے اس کی جان لی ہے۔ یہ بدروح ابھی تک غصے میں ہے۔ میں نے اس کی سرگوشی سنی ہے۔ تمہاری جان بھی خطرے میں ہے۔ چونکہ یہ عمل اس لئے کیا گیا تھا کہ تمہاری کوکھ سے بچہ پیدا ہو اس لئے یہ بدروح تمہیں بھی اسی طرح مارنا چاہتی ہے۔ میں ابھی تمہاری حفاظت کا انتظام کر رہا ہوں"۔

اُس نے میمونہ کا چہرہ اپنے دونوں ہاتھوں میں لے کر اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالیں اور کچھ بڑبڑانا شروع کر دیا۔ وقفے وقفے سے وہ میمونہ کی آنکھوں میں پھونک مارتا تھا۔ میمونہ جو بلک بلک کر رو رہی تھی اور ایسی بے چین کہ ہاتھ نہیں آتی تھی، پُرسکون ہونے لگی۔

زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ اُس نے سکون اور اطمینان کی لمبی آہ بھری جیسے اُس کا خاوند زندہ ہو گیا ہو۔ حسن بن صباح نے اسے فرش سے اٹھا کر اپنے پاس بٹھا لیا۔

"میں نے حافظ کو خبردار کر دیا تھا" — حسن بن صباح نے کہا — "لیکن اُسے ایک بچے کا اتنا شوق تھا کہ اُس نے میری پوری بات توجہ سے نہ سنی۔ میں خدا کا شکر ادا کرتا ہوں کہ میں نے تمہیں دیکھ لیا اور اس بے رحم بدروح کو بھی دیکھ لیا۔ وہ ابھی تک حافظ پر سوار رہی تھی اور بار بار تمہاری طرف دیکھتی تھی..... میں نے تمہیں محفوظ کر لیا ہے لیکن تمہیں دو چاند میرے ساتھ رہنا پڑے گا۔ اگر تم اس سے پہلے میرے سائے سے دُور ہو گئیں تو تمہارا انجام اپنے خاوند سے زیادہ بُرا ہو گا"۔

"یہ آپ کا کرم ہے یا امام!" — میمونہ نے کہا — "میں آپ کے سائے میں نہیں رہوں گی تو جاؤں گی کہاں۔ میری منزل اصفہان ہے"۔

"وہاں تک میں تمہیں بخیر و خوبی پہنچاؤں گا" — حسن بن صباح نے کہا — "میرے محافظ تمہاری منزل تک تمہارے ساتھ جائیں گے..... لیکن تمہارا خاوند کہ

رہا تھا کہ وہ سلجوقی سلطنت کے حکمران سلطان ملک شاہ سے ملنے تو جائے گا"۔

"اس نے آپ کو یہ بھی بتایا تھا کہ وہ مرو کیوں جائے گا"۔۔۔ میمونہ نے کہا۔۔۔ "میرے خاوند نے خلجان، شاہ در اور اس علاقے میں جو کچھ دیکھا ہے وہ سلطان ملک شاہ کو بتانا تھا۔ خصوصاً خلجان میں کوئی ایسا فرقہ تیار ہو گیا ہے جس کے عقیدے لوگوں کے دلوں میں اتر گئے ہیں۔ یہ لوگ اپنے آپ کو مسلمان کہتے ہیں لیکن ان کے اعمال نہ صرف یہ کہ غیر اسلامی ہیں بلکہ یوں معلوم ہوتا ہے جیسے یہ فرقہ اسلام کو بالکل ہی مسخ کر دے گا۔ سنا ہے اس فرقے نے جانبازوں کا ایک گروہ تیار کر لیا ہے جو اپنی جانوں کی بازی لگا کر اپنے مخالفوں کی جانیں لیتا ہے"۔

"تمہارے خاوند نے مجھے یہ ساری باتیں بتائی تھیں"۔۔۔ حسن بن صباح نے کہا۔۔۔ "تم یہ بتاؤ کہ تم اس سلسلے میں کیا کرنا چاہتی ہو؟"

"کچھ بھی نہیں"۔۔۔ میمونہ نے کہا۔۔۔ "وہ خاوند ہی نہیں رہا جو اسلام کا شیدائی تھا۔ میں تو چاہتی ہوں اصفہان پہنچ جاؤں اور سوچوں کہ مجھے اب اپنے مستقبل کے لئے کیا کرنا چاہئے"۔

"کیا تمہارے گھر میں سونا یا درہم و دینار ہیں؟"

"حافظ اصفہانی ایک جاگیر کا مالک تھا"۔۔۔ میمونہ نے جواب دیا۔۔۔ "سونا بھی ہے درہم و دینار بھی ہیں جو گھر کی ایک دیوار میں چھپا کر رکھے ہوئے ہیں۔ یہ تو ایک دفنی خزانہ ہے لیکن زندگی کا ساتھی ہی نہ رہا تو میں اس خزانے کو کیا کروں گی ..... کوشش کروں گی کہ اپنی بیٹی شمونہ کی تلاش میں مرو اور رے جاؤں۔ آپ ہی نے بتایا ہے کہ وہ امیر شہر ابو مسلم رازی کے پاس ہو گی"۔

حسن بن صباح کو دھچکہ سا لگا۔ وہ ایک رات پہلے اس عورت کو بتا چکا تھا کہ اس کی بیٹی کہاں ہے۔ اب اسے خیال آیا کہ اس عورت کو سلطان ملک شاہ اور ابو مسلم رازی کے پاس نہیں جانا چاہئے ورنہ وہ خلجان پر حملہ کرا دے گی یا اسے گرفتار کرا دے گی۔

"پہلے اپنی منزل پر پہنچو"۔۔۔ حسن بن صباح نے کہا۔۔۔ "مجھ سے پوچھے بغیر کہیں نہ جانا۔ تمہاری بیٹی زندہ ہے اور تمہیں مل جائے گی لیکن اپنے آپ اس کی تلاش میں چل پڑنا"۔

میمونہ جذبات کی ماری ہوئی تن تنہا عورت تھی۔ خاوند کی موت کے صدمے نے اس پر ڈوبنے کی کیفیت طاری کر دی تھی۔ وہ تنکوں کے سہارے ڈھونڈ رہی تھی۔ حسن بن صباح سے بہتر سہارا اور کیا ہو سکتا تھا۔ اسے وہ امام مانتی تھی جو غیب کے پردوں کے پیچھے جھانک کر بتا سکتا تھا کہ کیا ہو چکا ہے اور کیا ہونے والا ہے۔

میمونہ نے مان لیا تھا کہ حسن بن صباح نے اس کے خاوند کو ٹھیک عمل بتایا تھا لیکن ایک بدروح نے اس کی جان لے لی۔ اس مجبور اور مجبور عورت کو یہ تو معلوم ہی نہیں تھا کہ جسے وہ غیب دان امام مانتی ہے، اس نے اسے ہپناٹائز کر لیا ہے اور اب وہ اس کے اشاروں پر چلے گی۔

وہ اس عورت کو ہپناٹائز نہ کرتا تو بھی وہ اس کے جال میں سے نکل نہیں سکتی تھی۔ تمام مورخوں نے خصوصاً یورپی تاریخ نویسوں اور شخصیت نگاروں نے لکھا ہے کہ حسن بن صباح نے اپنے آپ میں ایسے اوصاف پیدا کر لئے تھے کہ اس کے سامنے اس کا کوئی خونی دشمن اسے قتل کرنے کی نیت سے آ جاتا تو وہ بھی اس کا مرید ہو جاتا تھا..... یہ ابلیسیت کا طلسم تھا۔

میمونہ نے فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ حسن بن صباح کے ساتھ رہے گی۔

اس کے خاوند کی لاش اس کے کمرے میں پڑی ہوئی تھی۔ حسن بن صباح نے سرائے کے مالک کو بلا کر کہا کہ وہ میت کے غسل اور کفن دفن کا انتظام کرے، اس کے اخراجات میمونہ ادا کرے گی۔

سہ پہر کے وقت حافظ اصفہانی کا جنازہ سرائے سے اٹھا۔ قبرستان میں جا کر حسن بن صباح نے نماز جنازہ پڑھائی۔ وہ جس قبرستان میں بچہ لینے گیا تھا اسی قبرستان میں دفن ہو گیا اور اپنے پیچھے یہ کہانی چھوڑ گیا کہ اسے ایک بدروح نے مارا ہے۔

میمونہ اپنے کمرے میں تنہا ڈر رہی تھی۔ اس نے حسن بن صباح سے پوچھا کہ وہ اس کے کمرے میں رہ سکتی ہے؟ حسن بن صباح نے اسے اجازت دے دی۔ میمونہ اپنا سامان اٹھوا کر اس کے کمرے میں چلی گئی۔

اس سرائے میں مسافر اس مجبوری کے تحت رکے ہوئے تھے کہ کوئی قافلہ تیار نہیں ہو رہا تھا۔ لوگ قافلوں کی صورت میں سفر کیا کرتے تھے۔ اکیلے دکیلے مسافروں کو رہزن لوٹ لیتے تھے۔

انہیں زیادہ انتظار نہ کرنا پڑا۔ چودہ پندرہ دنوں بعد ایک قافلہ تیار ہو گیا۔ یہ بہت بڑا قافلہ تھا۔ کچھ تاجر تھے' کچھ پورے پورے کنبے تھے۔ زندگی کے ہر شعبے کے لوگ اس قافلے میں شامل تھے۔ عورتیں بھی تھیں' بچے بھی تھے۔

سرائے میں اطلاع آئی تو سرائے خالی ہو گئی۔ حسن بن صباح' اس کے دو ساتھیوں اور میمونہ نے سامان باندھا اور قافلے سے جا ملے۔ انہوں نے ایک گھوڑا اور دو اونٹ کرائے پر لے لئے۔ ایک اونٹ پر بڑی خوبصورت پالکی بندھوائی۔ یہ میمونہ کے لئے تھی۔ قافلے کی روانگی سے پہلے میمونہ کو پالکی میں بٹھا دیا گیا اور حسن بن صباح اپنے ساتھیوں کے ساتھ ذرا پرے جا کھڑا ہوا۔

"اس عورت پر نظر رکھنا" — حسن بن صباح نے اپنے ساتھیوں سے کہا — "یہ اپنے خاوند سے زیادہ خطرناک ہو سکتی ہے۔ میں نے اس کا راستہ بند تو کر دیا ہے پھر بھی یہ دوسرے مسافروں سے نہ ہی ملے تو اچھا ہے۔ اس کا گھر اصفہان میں ہے۔ اپنے مکان کی ایک دیوار میں اس کے خاوند نے اچھا خاصا خزانہ چھپا کر رکھا ہوا ہے۔ اس سے یہ خزانہ نکلوانا ہے اور اس کے گھر میں ہی اس عورت کو دفن کر دینا ہے۔ اگر اسے زندہ رہنے دیا گیا تو یہ کسی بھی دن اپنی بچی سے ملنے ابو مسلم رازی کے شہر کو روانہ ہو جائے گی"۔

○

قافلہ چل پڑا۔

بہت دنوں کی مسافت کے بعد قافلہ بغداد پہنچا۔ لوگ دو چار دن آرام کرنا چاہتے تھے۔ بہت سے مسافروں کی منزل بغداد ہی تھی۔ اتنے ہی مسافر بغداد سے قافلے سے آملے۔

حسن بن صباح اپنے ساتھیوں کو ایک سرائے میں لے گیا جس میں انہیں کمرے مل گئے۔ وہاں چند ایک عورتیں بھی ٹھہری ہوئی تھیں۔ ان کے ساتھ ان کے آدمی بھی تھے۔

دوسری صبح تھی۔ میمونہ اپنے کمرے سے باہر نکلی۔ اسے اپنا خاوند بہت یاد آرہا تھا اور وہ بہت ہی اداس ہو گئی تھی۔ حسن بن صباح نے خود ہی اسے کہا تھا کہ وہ باہر گھومے پھرے' سرائے کے باہر نہ جائے اور عورتوں میں جا بیٹھے۔

وہ باہر نکلی تو اسی کی طرح کی ایک عورت سامنے آگئی۔ وہ بھی حلب کی سرائے سے اپنے

بچے کے ساتھ قافلے میں شامل ہوئی تھی اور وہاں سرائے میں ٹھہری تھی۔ اسے معلوم تھا کہ میمونہ کا خاوند قبرستان میں ایک بدروح کے ہاتھوں مارا گیا تھا لیکن یہ عورت میمونہ سے پوچھ نہیں سکی تھی کہ اس کا خاوند کس طرح مارا گیا تھا۔ بغداد میں میمونہ اس کے سامنے آگئی۔

"ہم سفر ہو کے ہم ایک دوسرے سے بیگانہ ہیں" — اس عورت نے میمونہ سے کہا — "عورت کا درد عورت ہی سمجھ سکتی ہے۔ کچھ دیر کے لئے میرے پاس نہیں آؤ گی؟..... میرے ساتھ میرا خاوند اور اس کا ایک بھائی ہے۔ دو بچے ہیں"۔

میمونہ اداس سی مسکراہٹ سے اس کے ساتھ اس کے کمرے میں چلی گئی۔ مرد ایک طرف ہو کر بیٹھ گئے۔

"یہ تو بتاؤ بہن!" — اس عورت کے خاوند نے میمونہ سے پوچھا — "تمہارا خاوند رات کے وقت قبرستان میں کیا کرنے گیا تھا؟"

"امام نے اسے بھیجا تھا" — میمونہ نے کہا — "کہنا تو یہ چاہئے کہ اسے موت لے گئی تھی..... وہ ایک بچے کا خواہشمند تھا"۔

میمونہ نے ساری بات لفظ بلفظ سنا دی۔

"کیا تمہارے خاوند نے کوئی اور باتیں بھی کی تھیں؟" — اس شخص نے پوچھا — "میں دراصل یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ تمہارا خاوند اس شخص کو جانتا تھا جسے تم امام کہتی ہو؟"

"باتیں تو بہت ہوئی تھیں" — میمونہ نے جواب دیا — "میرا خاوند امام کو پہلے نہیں جانتا تھا۔ ہم مصر سے جہاز میں آرہے تھے۔ بڑا ہی تیز و تند طوفان آگیا۔ جہاز کا ڈوب جانا یقینی تھا لیکن اس امام نے کہا کہ جہاز نہیں ڈوبے گا' طوفان سے نکل جائے گا..... جہاز نکل آیا"۔

یہاں سے بات چلی تو بہت سی باتیں ہوئیں۔ اس عورت کا خاوند کرید کرید کر باتیں پوچھ رہا تھا۔ میمونہ کو شک ہوا کہ یہ آدمی کوئی خاص بات معلوم کرنا چاہتا ہے۔

"میرے بھائی!" — میمونہ نے پوچھا — "معلوم ہوتا ہے آپ کوئی خاص بات معلوم کرنا چاہتے ہیں"۔

"ہاں بہن!" — اس نے کہا — "میرا خیال ہے کہ میں نے خاص بات معلوم کرلی

ہے۔ میں تمہیں اس آدمی سے خبردار کرنا چاہتا ہوں۔ اس شخص کا نام حسن بن صباح ہے اور یہ ایک شیطانی فرقے کا بانی ہے۔ اسے تم امام کہتی ہو۔ یہ اگر امام ہے تو اسی شیطانی فرقے کا امام ہے۔ اس کا استاد احمد بن عطاش ہے اور ان لوگوں نے خلجان کو اپنے فرقے کا مرکز بنایا ہے۔ یہ دونوں شیطان کا نام لئے بغیر لوگوں کو شیطان کا پجاری بنا رہے ہیں اور نام اسلام کا لیتے ہیں"۔

"میرے خاوند نے اس کے ساتھ یہ بات کی تھی" — میمونہ نے کہا — "اور کہا تھا کہ وہ سلطان ملک شاہ اور حاکم رے ابو مسلم رازی کے پاس جا رہا ہے اور انہیں کہے گا کہ احمد بن عطاش اور حسن بن صباح کے خلاف جنگی کارروائی کریں اور اسلام کی اصل روح کو بچائیں۔ میرے خاوند نے جب اسے یہ کہا کہ وہ آپ کا ہمنام ہے تو حسن بن صباح نے کہا کہ اُس کا نام الحسن بن سبا ہے حسن بن صباح نہیں۔ میرے خاوند نے حسن بن صباح اور اُس کے فرقے کے خلاف بہت باتیں کی تھیں اور یہ اس نے دو تین بار کہا تھا کہ میں اس فرقے کو نیست و نابود کرا دوں گا"۔

"میری عزیز بہن!" — اس آدمی نے جو خاصا دانشمند لگتا تھا، کہا — "تمہارا خاوند قتل ہوا ہے۔ اتنی اچھی حیثیت اور عقل و ہوش والا آدمی یہ نہ سمجھ سکا کہ مُردے کسی زندہ انسان کو بچہ نہیں دے سکتے اور حسن بن صباح جیسے شیطان فطرت انسان کی لکھی ہوئی پرچی پر اللہ تبارک و تعالیٰ کسی کی مراد پوری نہیں کیا کرتا۔ حسن بن صباح نے تمہارے خاوند کی دلی مراد سنی تو اس نے فوراً سوچ لیا کہ اپنے اس خطرناک مخالف کو وہ کس طرح قتل کرا سکتا ہے۔ اُس نے تمہارے خاوند کو آدھی رات کے وقت قبرستان میں بھیجا اور پیچھے اپنے آدمی بھیج کر اسے قتل کروا دیا"۔

"میں بھی اُس کے ساتھ یہی باتیں کر چکی ہوں" — میمونہ نے کہا — "اور مجھے اب خیال آتا ہے کہ اس نے مجھ سے یہ بھی اُگلوا لیا ہے کہ میرے خاوند نے اصفہان میں اپنے رہائشی مکان کی ایک دیوار میں بہت سا سونا اور اچھی خاصی رقم چھپا کر رکھی ہوئی ہے"۔

"اُس نے کیا کہا تھا؟"

"اُس نے کہا کہ میں تمہیں اصفہان تک اپنے آدمیوں کی حفاظت میں پہنچاؤں گا" میمونہ نے کہا۔

"وہ تمہارے ساتھ اپنے آدمی ضرور بھیجے گا" — اُس شخص نے کہا — "پھر جانتی ہو کیا ہو گا؟..... تمہارے خاوند کا خزانہ دیوار سے باہر آجائے گا اور تم دیوار کے اندر ہو گی۔ کسی کو پتہ ہی نہیں چلے گا کہ تم کہاں غائب ہو گئیں۔ اس حسن بن صباح کے حکم سے یہ فرقہ کئی سالوں سے قافلوں کو لوٹ رہا ہے۔ قافلوں سے یہ زر و جواہرات اور رقمیں لوٹتے ہیں اور خوبصورت کمسن اور نوجوان لڑکیوں کو اغوا کر کے لے جاتے ہیں"۔

"میں ایک قافلے میں لُٹ چکی ہوں" — میمونہ نے کہا — "میرا پہلا خاوند ڈاکوؤں کے ہاتھوں مارا گیا تھا اور وہ میری اکلوتی بچی کو اٹھا لے گئے تھے"۔

"تمہاری بچی انہی کے پاس ہو گی" — اس آدمی نے کہا۔

"سب باتیں ہو چکیں" — میمونہ نے کہا — "میں نے سب باتیں سمجھ لی ہیں۔ میں نے دیکھا ہے کہ یہ شخص حسن بن صباح جب آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرتا ہے تو اس کا ایک ایک لفظ دل میں یوں اُتر جاتا ہے جیسے یہ الفاظ آسمان سے اُتر رہے ہوں..... میں حیران ہوں کہ سلجوقی سلطان اور ان کے امراء جو اپنے آپ کو صحیح العقیدہ مسلمان سمجھتے ہیں اور اسلام کی پاسبانی کا بھی دعویٰ کرتے ہیں، وہ بے خبر ہیں کہ ان کی سرحد کے ساتھ ساتھ کیا ہو رہا ہے"۔

"اُن کے بے خبر ہونے کی ایک وجہ ہے" — اس شخص نے کہا — "اُن کے جاسوس اُن باطل پرستوں کے علاقے میں جاتے ہیں لیکن وہاں اُن پر ایسا نشہ طاری ہو جاتا ہے کہ وہ وہیں کے ہو کے رہ جاتے ہیں۔ ان میں سے بعض ان باطنیوں کے گرویدہ ہو کر ان کے جاسوس بن کے واپس آجاتے ہیں۔ وہاں کی باتیں غلط بتاتے ہیں اور سلجوقی حکمرانوں کی صحیح خبریں باطنیوں کو دے کر ان کے ہاتھ مضبوط کرتے ہیں۔ ان میں ایسے بھی ہوتے ہیں جو غداری نہیں کرتے، دیانتداری سے جاسوسی کرتے ہیں، وہ وہاں پُراسرار طریقوں سے قتل ہو جاتے ہیں۔ حسن بن صباح نے جاسوسوں اور مشکوک لوگوں کو پکڑنے کا جو نظام بنا رکھا ہے، اس میں اتنی گہری نظر رکھتے ہیں کہ باہر کے جاسوس کو فوراً پہچان لیتے ہیں۔ انہیں حکم ملا ہُوا ہے کہ ایسا کوئی بھی آدمی نظر آئے اسے قتل کر دو"۔

"آپ یہ ساری باتیں جانتے ہیں" — میمونہ نے پوچھا — "پھر آپ یہ سلطان

ملک شاہ تک کیوں نہیں پہنچاتے؟"

"ان بچوں کی خاطر!" ــ اس نے کہا ــ "میں مارا گیا تو ان کا کیا بنے گا؟"

"میں مرو یا رے تک کیسے پہنچ سکتی ہوں؟" ــ میمونہ نے پوچھا ــ "پتہ چلا ہے میری بچی وہاں ہے۔ معلوم نہیں یہ کہاں تک سچ ہے لیکن مجھے اس بچی سے اتنی محبت ہے کہ میں اس کی تلاش میں جاؤں گی ضرور۔ مشکل یہ ہے کہ میں اس شخص حسن بن صباح کی قیدی ہوں۔ ہماری منزل کا راستہ رے سے گزرتا ہے۔ اگر میں وہاں تک پہنچ جاؤں تو سلطان تک بھی پہنچ جاؤں گی"۔

"تمہیں ویسے بھی یہاں سے نکل جانا چاہئے" ــ اس آدمی نے کہا ــ "یہ شخص آخر تمہیں قتل کر دے گا"۔

"میں اس عورت کے لئے ایک قربانی دے سکتا ہوں" ــ اس آدمی کے بھائی نے جو ابھی تک خاموش بیٹھا تھا کہا ــ "اگر یہ یہاں سے بھاگنے کے لئے تیار ہو تو آج ہی رات بھاگ چلے۔ میں اس کا ساتھ دوں گا۔ میرے پاس گھوڑا ہے۔ اس کے لئے کسی کا گھوڑا چوری کر لیں گے"۔

"ہمارے پاس اپنے کا گھوڑا ہے؟" ــ میمونہ نے کہا ــ "اور میں پکی سوار ہوں۔ گھوڑا کیسا ہی منہ زور کیوں نہ ہو زمین کیسی ہی ناہموار کیوں نہ ہو میں سنبھل کر ہر چال اور ہر رفتار پر سواری کر سکتی ہوں"۔

"کیا آپ مجھے اجازت دیتے ہیں بھائی جان؟" ــ اس جوان سال آدمی نے اپنے بھائی سے پوچھا۔

"یہ ایک جہاد ہے" ــ بڑے بھائی نے کہا ــ "میں تجھے کیسے روک سکتا ہوں مزمل!"

انہوں نے میمونہ کو فرار کرا کے رے پہنچانے کا بڑا ہی دلیرانہ منصوبہ تیار کر لیا۔

○

میمونہ اپنے کمرے میں حسن بن صباح کے پاس چلی گئی۔

"یہ کیسے لوگ ہیں جن کے ہاں تم اتنا وقت گزار آئی ہو؟" ــ حسن بن صباح نے پوچھا۔

"کوئی عام سے لوگ ہیں" ــ میمونہ نے کہا ــ "اصفہان جا رہے ہیں۔ حافظ

اصفہانی کو جانتے تھے۔ اسی کی باتیں کرتے رہے"۔

"اب میں باہر جا رہا ہوں" ــ حسن بن صباح نے کہا ــ "تم آرام کر لو"۔

حسن بن صباح کے جانے کے بعد میمونہ نے اپنی قیمتی چیزیں اور کپڑے چھوٹی سی ایک گٹھڑی میں باندھ کر پلنگ کے نیچے رکھ دیئے۔ رات کو حسن بن صباح گہری نیند سو گیا تو میمونہ نہایت آہستہ سے اٹھی، پلنگ کے نیچے سے گٹھڑی نکالی اور دبے پاؤں باہر نکل گئی۔ سب کے گھوڑے باہر بندھے ہوئے تھے۔ ان کی زینیں وغیرہ ان کے پاس ہی تھیں۔ میمونہ کا ہمسفر مزمل آفندی بہت پہلے باہر نکل گیا تھا۔ دن کے وقت اس نے میمونہ کا گھوڑا دیکھ لیا تھا۔ مزمل نے دونوں گھوڑوں پر زینیں کس دی تھیں۔

میمونہ پہنچ گئی، گٹھڑی اپنے گھوڑے کی زین کے ساتھ باندھی اور گھوڑے پر سوار ہو گئی۔ مزمل آفندی بھی گھوڑے پر سوار ہوا اور دونوں گھوڑے چل پڑے۔ پہلے وہ آہستہ آہستہ چلے پھر تیز ہو گئے اور جب شہر کے دروازے سے نکلے تو اور تیز ہو گئے تھے کچھ دور جا کر انہوں نے ایڑ لگائی اور گھوڑے سرپٹ دوڑ پڑے۔

صبح حسن بن صباح کی آنکھ کھلی تو اس نے میمونہ کو غائب پایا۔ اپنے ساتھیوں کے کمرے میں جا کر انہیں کہا کہ اسے ڈھونڈیں۔ اس وقت تک میمونہ بغداد سے ساٹھ میل دور پہنچ چکی تھی۔

"وہ سلجوقیوں کے پاس چلی گئی ہے" ــ حسن بن صباح نے اس وقت کہا جب اسے پتہ چلا کہ گھوڑا غائب ہے۔ اس نے کہا ــ "ہم قافلے کا انتظار نہیں کریں گے۔ ہمیں فوراً اصفہان پہنچنا چاہئے۔ وہاں سے خلجان کی صورت حال معلوم کر کے وہاں جائیں۔ احمد بن عطاش کو خبردار کرنا ضروری ہے"۔

ان کے پاس دو اونٹ تھے۔ انہوں نے ایک اچھی نسل کا گھوڑا کرائے پر لے لیا اور اسی وقت روانہ ہو گئے۔ دونوں اونٹوں کا مالک اور گھوڑے کا مالک بھی ان کے ساتھ تھے۔

مزمل آفندی اور میمونہ اتنی تیز گئے تھے اور انہوں نے اتنے کم پڑاؤ کئے تھے کہ تین دنوں بعد رے پہنچ گئے۔ وہ سیدھے امیر شہر ابو مسلم رازی کے ہاں چلے گئے۔ دربان سے کہا کہ وہ امیر شہر سے ملنا چاہتی ہے۔

"کام کیا ہے؟" ــ دربان نے پوچھا ــ "کہاں سے آئی ہو؟ تم ہو کون؟"

"کیا ہمارے گھوڑوں کا پسینہ نہیں بتا رہا کہ ہم بہت دور سے آئے ہیں؟" میمونہ نے کہا — "ہمارے چہرے دیکھو، ہمارے کپڑوں پر گرد دیکھو۔ امیر سے کہو ایک ماں اپنی بیٹی کی تلاش میں آئی ہے"۔

کچھ ہی دیر بعد وہ اور مزمل ابو مسلم رازی کے کمرے میں اُس کے سامنے کھڑے تھے۔

"بہت دور سے آئے لگتے ہو" — ابو مسلم رازی نے کہا۔

"بغداد سے!" — مزمل نے جواب دیا۔

"دربان نے بتایا ہے تم اپنی بیٹی کی تلاش میں آئی ہو" — ابو مسلم رازی نے کہا — "کون ہے تمہاری بیٹی؟ یہاں اُس کا کیا کام؟"

"اُس کا نام شمونہ ہے" — میمونہ نے کہا — "کسی نے بتایا تھا یہاں ہے"۔

"ہاں!" — ابو مسلم رازی نے کہا — "وہ یہیں ہے" — اُس نے دروازے کے باہر کھڑے خدمت گار کو بلا کر کہا — "شمونہ کو لے آؤ"۔

جب ماں بیٹی کا آمنا سامنا ہوا تو کچھ دیر دونوں چُپ چاپ ایک دوسری کو دیکھتی رہیں۔

"اپنی ماں کو پہچانتی ہو شمونہ؟" — ابو مسلم رازی نے کہا۔

ماں بیٹی یوں ملیں جیسے ایک دوسری کے وجود میں سما جانے کی کوشش کر رہی ہوں۔ ماں اپنی بیٹی کے بازوؤں سے نکل آئی اور ابو مسلم رازی کی طرف دیکھا۔

"میں صرف اپنی بیٹی کی تلاش میں نہیں آئی تھی امیر شہر!" — میمونہ نے کہا — "میرا اصل مقصد کچھ اور ہے ..... کیا آپ حسن بن صباح کو جانتے ہیں؟"

"حسن بن صباح!" — ابو مسلم رازی نے کہا — "کیوں؟ ..... اُسے جانتا ہوں ..... سلطانِ معظم نے اُسے زندہ پکڑ لانے کے لئے ایک سالار امیر ارسلان کو حکم دے دیا ہے"۔

سلطان ملک شاہ نے سالار امیر ارسلان کو حکم تو دے دیا تھا کہ حسن بن صباح کو زندہ پکڑ لائے لیکن حسن بن صباح کا سراغ نہیں مل رہا تھا کہ وہ ہے کہاں۔ سلطان نے امیر ارسلان سے یہ کہا تھا کہ حسن بن صباح کا سراغ لگاؤ اور اسے پکڑو۔

"کیا آپ کو معلوم ہے وہ ہے کہاں؟" — مزمل آفندی نے جو میمونہ اور شمونہ کے ساتھ تھا، ابو مسلم رازی سے پوچھا۔

"نہیں!" — ابو مسلم رازی نے جواب دیا — "یہی ایک سوال ہے جس کا جواب کسی کے بھی پاس نہیں۔ ایک خبر ملی تھی کہ وہ مصر چلا گیا ہے اور یہ خبر بھی ملی ہے کہ مصر سے واپس آگیا ہے"۔

"ہم اسے بغداد چھوڑ آئے ہیں" — مزمل آفندی نے کہا۔

"اور یہ میں آپ کو بتا رہی ہوں" — میمونہ نے کہا — "کہ وہ مصر سے واپس آگیا ہے اور اصفہان جا رہا ہے۔ میں سکندریہ سے اپنے خاوند کے ساتھ اُس کی ہم سفر تھی۔ یہ میرا دوسرا خاوند تھا۔ اسے حلب میں حسن بن صباح نے قتل کروا دیا تھا"۔

"قتل کروا دیا تھا؟" — ابو مسلم رازی نے چونک کر پوچھا — "وہ کیسے؟"

میمونہ نے اسے سارا واقعہ سنا دیا۔

"اور پھر اس نے مجھے اپنے اثر میں لے لیا" — میمونہ نے کہا — "اس نے ایسے انداز اور ایسے طریقے سے میرے ساتھ باتیں کیں کہ میں اسے خدا کی طرف سے زمین پر اترا ہوا فرشتہ سمجھنے لگی۔ میں نے اس حقیقت کو تسلیم کر لیا کہ میرے خاوند کی جان ایک بدروح نے لی ہے اور یہ بدروح میری بھی جان لے گی اور اس بزرگ و برتر شخصیت حسن بن صباح نے مجھے اس بدروح سے محفوظ کر لیا ہے"۔

"کیا اس نے تمہیں اپنے ساتھ رکھ لیا تھا؟" — ابو مسلم رازی نے پوچھا۔

"سرائے میں وہ الگ کمرے میں رہتا تھا" — میمونہ نے جواب دیا — "میں اس کے ساتھ اس کمرے میں رہنے لگی تھی"۔

"میں حیران ہوں کہ تم اُس کے چنگل سے نکل کس طرح آئیں" — ابو مسلم رازی نے کہا۔

"مزمل آفندی اور اس کے بڑے بھائی کی راہنمائی اور مدد سے وہاں سے نکلی ہوں" — میمونہ نے کہا۔

میمونہ نے تفصیل سے سنایا کہ وہ کس طرح مزمل آفندی اور اس کے بڑے بھائی سے اتفاقیہ ملی تھی اور بڑے بھائی نے اسے حسن بن صباح کی اصلیت بتائی تھی۔

"امیرِ شہر!" — مزمل آفندی نے کہا — "ہم اصفہان کے رہنے والے ہیں۔ تجارت ہمارا پیشہ ہے۔ ہم شہر شہر' قصبہ قصبہ جاتے ہیں' لوگوں سے ملتے ملاتے ہیں' ان کی باتیں سنتے ہیں اور چونکہ ہم اللہ کے بتائے ہوئے سیدھے راستے پر چلنے والے مسلمان ہیں اس لئے ہم جہاں بھی جاتے ہیں وہاں غور سے دیکھتے ہیں کہ کہیں اسلام کی روح کو مسخ تو نہیں کیا جا رہا"۔

"ان قلعوں کے علاقوں میں تم نے کیا دیکھا ہے؟" — ابو مسلم رازی نے پوچھا۔

"ان علاقوں میں لوگ حسن بن صباح کو خدا کا ایلچی سمجھتے ہیں" — مزمل آفندی نے کہا — "ان کا عقیدہ ہے حسن بن صباح آسمان سے زمین پر اترا تھا اور پھر آسمان پر چلا گیا ہے اور ایک بار پھر اس کا ظہور ہو گا"۔

"ہمیں معلوم ہو چکا ہے" — ابو مسلم رازی نے کہا — "لیکن ہم لوگوں کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کر سکتے۔ لوگ تو کھیتی کی مانند ہیں۔ کھیتی ہر بیج کو قبول کر لیتی ہے۔ حشیش کا پودا بھی کھیتی اگاتی ہے اور حنا بھی کھیتی ہی دیتی ہے۔ ہم اسے پکڑیں گے جو حنا پیدا کرنے والی زمین میں حشیش کا بیج بوتا ہے"۔

"مجھے ایک شک ہے امیرِ شہر!" — مزمل آفندی نے کہا — "ایسے لوگوں کو آپ فوج کہہ لیں یا احمد بن عطاش اور حسن بن صباح کے جانباز پیروکار کہہ لیں' انہیں حشیش پلائی جاتی ہے اور نشے کی حالت میں ان کے دماغوں میں وہ لوگ اپنے بے بنیاد عقیدے ڈالتے ہیں۔ دوسرے لوگوں کی تو انہوں نے کایا پلٹ دی ہے۔ محصولات اور مالیہ اس قدر کم کر دیا گیا ہے جو انتہائی غریب کسان نہایت آسانی اور خوشی سے دیتا ہے"۔

"وہ محصولات اور مالیہ بالکل معاف کر سکتے ہیں" — ابو مسلم رازی نے کہا — "قافلے لوٹ لوٹ کر انہوں نے قارون جیسے خزانے اکٹھے کر لئے اور ابھی تک ان کی لوٹ مار جاری ہے۔ قتل و غارت گری ان لوگوں کا دستور ہے۔ اس عورت کو دیکھو۔ اس کی اس بچی شمونہ کو حسن بن صباح کے ڈاکوؤں نے چھوٹی سی عمر میں اغوا کر لیا تھا۔ اس کی ماں کو دیکھو۔ اس کے ورثا ان لوگوں کے ہاتھوں قتل ہو چکے ہیں"۔

"امیرِ محترم!" — مزمل آفندی نے پوچھا — "آپ کے سالار امیر ارسلان حسن

...کی گرفتاری کے لئے کب روانہ ہو رہے ہیں؟"

"...میں ضروری نہیں سمجھتا کہ تمہیں اس سوال کا جواب دوں" — ابو مسلم رازی نے کہا — "مجھے یہ بتاؤ کہ بغداد سے اس قافلے نے کب روانہ ہونا تھا؟"

"ابھی اس کی روانگی کے کوئی آثار نہیں تھے" — مزمل آفندی نے جواب دیا — "اگر روانہ ہو بھی چکا ہو تو ابھی راستے میں ہی ہو گا"۔

"تم ...اپنے بھائی کے پاس جانا چاہو گے؟" — ابو مسلم رازی نے پوچھا۔

"نہیں!" — مزمل آفندی نے کہا — "وہ میرے لئے پریشان بھی ہوں گے مگر میں ایک خطرہ محسوس کر رہا ہوں۔ میں اس خاتون کو وہاں سے لایا ہوں۔ یہ دراصل حسن بن صباح کے قبضے میں تھی۔ اسے میں اُس کے ہاتھوں قتل ہونے سے بچا کر لایا ہوں۔ ہو سکتا ہے حسن بن صباح پر یہ راز کھل جائے تو وہ مجھے قتل نہیں کرا دے گا؟"

"تم اکیلے نہیں جاؤ گے" — ابو مسلم رازی نے کہا — "میں مرو جا رہا ہوں۔ سلطان سے کہوں گا کہ سالار امیر ارسلان کو فوراً بغداد بھیج دے۔ اگر قافلہ اصفہان کی طرف روانہ ہو گیا ہو تو اس کا تعاقب کرے اور حسن بن صباح کو پکڑ کر لے آئے۔ تمہیں اس کے ساتھ جانا پڑے گا۔ میرا خیال ہے امیر ارسلان حسن بن صباح کو نہیں پہچانتا۔ یہ تم اسے بتاؤ گے۔ وہ تمہیں اپنی پناہ میں رکھے گا..... تمہیں یہاں تین یا چار دن رکنا پڑے گا۔ امیر ارسلان یہاں آ کر روانہ ہو گا"۔

○

ابو مسلم رازی اُسی روز مرو کو روانہ ہو گیا۔ اُس کے حکم سے مزمل آفندی کی رہائش کا انتظام کر دیا گیا تھا۔ شمونہ کو ابو مسلم رازی نے اپنے مکان میں ٹھہرایا ہوا تھا۔ میمونہ اس کے ساتھ چلی گئی۔

مزمل آفندی نے جس وقت سے شمونہ کو دیکھا تھا اس کی نظریں شمونہ سے ہٹ نہیں رہی تھیں۔ شمونہ بہت ہی حسین لڑکی تھی لیکن اس کے چہرے پر ایک تاثر اور بھی تھا۔ مزمل آفندی محسوس کر رہا تھا کہ اس لڑکی کا حسن صرف جسمانی نہیں۔ اس لڑکی میں اسے کوئی اور ہی پرتو نظر آ رہا تھا۔

مزمل آفندی اپنے کمرے میں گیا تو وہ اپنے آپ میں ایسی ہلچل محسوس کر رہا تھا جو اس نے پہلے کبھی محسوس نہیں کی تھی۔ وہ بے قرار سا ہو گیا اور سوچنے لگا کہ کس

بہانے وہ ماں بیٹی کے کمرے میں جائے۔ وہ تین چار بار اس توقع پر نکلا شاید ماں یا بیٹی باہر نکلے تو اس کے پاس آ جائے یا اسے بلا لے۔ اس نے میمونہ پر بہت بڑا احسان کیا تھا۔ شام گہری ہونے کے بعد مزمل آفندی کھانے سے فارغ ہوا ہی تھا کہ شمونہ اس کے کمرے میں آ گئی۔ مزمل آفندی کو اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا تھا کہ شمونہ اس کے کمرے میں آئی ہے۔

"میں تمہارے چہرے پر حیرت کا تاثر دیکھ رہی ہوں" ــــ شمونہ نے کہا ــــ "کیا تمہیں عجیب لگا ہے کہ میں رات کے وقت تمہارے کمرے میں آئی ہوں؟"

"ہاں شمونہ!" ــــ مزمل آفندی نے کہا ــــ "مجھے تمہارا یہاں آنا عجیب لگا تھا لیکن جس بیباکی سے تم نے پوچھا ہے اس سے میری حیرت ختم ہو گئی ہے۔ میں تمہیں حرم کی ایک عام سی لڑکی سمجھا جو بچپن میں اغوا ہو کر یہاں تک پہنچی ہے"۔

"میں اغوا ہوئی تھی" ــــ شمونہ نے کہا ــــ "لیکن میں کسی کے حرم میں قید نہیں ہوئی نہ مجھے جسمانی تفریح کا ذریعہ بنایا گیا تھا بلکہ مجھے ایسی تربیت دی گئی کہ میں پتھر دل آدمی کو موم کی طرح پگھلا کر اپنی مرضی کے سانچے میں ڈھال سکتی ہوں"۔

"تمہیں یہ تربیت کس نے دی تھی؟" ــــ مزمل آفندی نے پوچھا۔

"حسن بن صباح کے ٹولے نے!" ــــ شمونہ نے جواب دیا ــــ "لیکن مزمل! میں تمہیں یہ داستان سنانے نہیں آئی کہ میں کیا تھی اور اب کیا ہوں"۔

"ساری داستان نہ سہی" ــــ مزمل آفندی نے کہا ــــ "میں کچھ نہ کچھ تو ضرور معلوم کرنا چاہوں گا...... جس طرح تم نے میرے ساتھ بیباکی سے بات کی ہے اسی طرح میں بھی تھوڑی سی بیباکی کا حق رکھتا ہوں۔ اگر تمہیں اچھا نہ لگے تو مجھے روک دینا"۔

"آفندی!" ــــ شمونہ نے کہا ــــ "مجھے وہ انسان اچھا لگتا ہے جس کی زبان پر وہی ہو جو اس کے دل میں ہے"۔

"شمونہ!" ــــ مزمل آفندی نے کہا ــــ "میری زبان پر تمہارا نام ہے اور میرے دل میں بھی تم ہی ہو۔ میں نے تمہیں آج ہی دیکھا ہے اور میرے دل نے کہا ہے کہ اس لڑکی کا حسن جسمانی نہیں روحانی ہے اور 'خدا کی قسم' میں نے یقین کی حد تک محسوس کیا کہ میں تمہیں بچپن سے جانتا ہوں اور بچپن سے تم میرے دل میں موجود ہو۔ اگر تمہیں میری نیت پر شک ہو تو یہ سوچ لینا کہ میں اپنی جان کو خطرے میں ڈال کر تمہاری

یہاں لایا ہوں، اور اسے میں اس لئے نہیں لایا کہ تم خوش ہو جاؤ گی۔ تمہیں تو میں جانتا تک نہ تھا۔ میں ایک مظلوم اور فریب خوردہ عورت کو ایک ابلیس کے جال سے نکال کر لایا ہوں۔ یہ کہتی تھی کہ میری بیٹی سلجوقی سلطان یا کسی امیر کے پاس ہے۔ میں اسے محض خواب اور خیال سمجھتا تھا۔ میں تو یہ سوچ کر اسے لے آیا تھا کہ اسے ابو مسلم رازی کی پناہ میں چھوڑ کر لوٹ جاؤں گا"۔

"میں تمہاری بات سمجھ گئی ہوں آفندی!" ــــ شمونہ نے کہا ــــ "مجھے یقین ہے کہ تم میری خاطر نہیں آئے"۔

"یہ تو اتفاق ہے" ــــ مزمل آفندی نے کہا ــــ "اسے معجزہ کہوں تو بھی غلط نہیں ہو گا کہ تم یہاں مل گئیں"۔

"یہ اللہ کا انعام ہے" ــــ شمونہ نے کہا ــــ "اللہ نے میری توبہ قبول کر لی ہے...... میرے دماغ میں ابلیسیت ڈالی گئی تھی اور میرے خیالات اور میرے کردار کو ابلیسیت کے سانچے میں ڈھال دیا گیا تھا لیکن ایسے حالات پیدا ہو گئے کہ میں ہوش میں آ گئی۔ مجھے امید نہیں تھی کہ اپنے آپ کو ابلیسی اوصاف سے پاک کر کے انسانیت کے دائرے میں داخل ہو سکوں گی لیکن مجھ پر یہ راز کھلا ہے کہ انسان آخر انسان ہے اور وہ اول آخر انسان رہتا ہے۔ کبھی حالات ایسے ہو جاتے ہیں کہ انسان ابلیسیت کی طرف مائل ہو جاتا ہے یا ایسے انسانوں کے نرغے اور اثر میں آ جاتا ہے کہ اسے ابلیسیت میں لذت حاصل ہوتی ہے اور وہ ابلیس کا پجاری بن جاتا ہے لیکن وہ رہتا انسان ہی ہے' وہ ابلیس نہیں بن جاتا۔ یہ سوچنے اور سمجھنے کی بات ہے۔ اللہ نے انسان کو اشرف المخلوقات بنایا ہے۔ وہ ارادہ کر لے اور یہ سمجھ لے کہ اللہ نے اپنی نگاہ میں انسان کو کتنا اونچا مقام دیا ہے تو وہ ایک جھٹکے سے ابلیس کے چنگل سے نکل کر اللہ کے قریب ہو سکتا ہے...... یہ میں نے کیا اور اللہ نے یہ انعام دیا کہ مجھے میری بچھڑی ہوئی ماں دے دی"۔

"یہ عمر اور یہ حسن!" ــــ مزمل آفندی نے کہا ــــ "اور یہ سنجیدگی؟"

"کیا تمہیں یہ سنجیدگی اچھی نہیں لگی؟" ــــ شمونہ نے پوچھا۔

"لگی تو مجھے اچھی لگی ہے" ــــ مزمل آفندی نے کہا ــــ "تم چاہتی ہو کہ جو دل میں ہو وہی زبان پر آئے...... میرے دل کی آواز سن لو شمونہ! میرے دل میں تمہاری وہ محبت پیدا ہو گئی ہے جس کا تعلق روح کے ساتھ ہے اور تم نے ایسی محبت کے قصے سنے ہوں

گے"۔

شمونہ چونک پڑی۔ اُس کے چہرے کا رنگ بدل گیا جیسے وہ خوفزدہ ہو گئی ہو۔ وہ آنکھیں پھاڑے مزمل آفندی کو دیکھنے لگی جیسے اس جواں سال اور خوبرو آدمی نے اسے کہہ دیا ہو کہ میں تمہیں قتل کر دوں گا۔

"کیوں شمونہ!"ــــ مزمل آفندی نے کہاــــ "کیا میں نے تمہارے دل کو تکلیف پہنچائی ہے؟"

"نہیں آفندی!"ــــ شمونہ نے کہاــــ "مجھے شک ہے کہ میری محبت اور موت میں کوئی زیادہ فرق نہیں"۔

مزمل آفندی سراپا سوال بن گیا۔

"آج میں کچھ اور کہنے آئی تھی"ــــ شمونہ نے کہاــــ "میں تمہاری شکرگزار ہوں کہ تم میری ماں کو لے آئے ہو..... اور اس سے زیادہ اللہ کی شکرگزار ہوں کہ ماں نے مجھے انسان کے روپ میں دیکھا ہے۔ اس سے پہلے دیکھتی تو وہ کہتی 'نہیں' یہ میری بیٹی نہیں"۔

وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

"تم جا رہی ہو"ــــ مزمل آفندی نے کہاــــ "میں کیا سمجھوں؟..... ناراض ہو کر جا رہی ہو؟....."

"کل آؤں گی آفندی!"ــــ شمونہ نے قدرے خوشگوار لہجے میں جواب دیاــــ "میں ناراض نہیں ہوں۔ تمہاری نیت سمجھ گئی ہوں۔ میں چہرے سے نیت معلوم کر لیا کرتی ہوں..... میں نے تمہارے ساتھ کچھ اور باتیں بھی کرنی ہیں"۔

شمونہ چلی گئی۔

○

اگلے روز کا سورج طلوع ہوا۔ مزمل آفندی ناشتے سے فارغ ہو چکا تھا۔ شمونہ اپنی ماں میمونہ کے ساتھ اس کے کمرے میں آگئی۔

"مزمل!"ــــ میمونہ نے کہاــــ "میری بیٹی نے بتایا ہے کہ تم نے اسے اپنے لئے پسند کیا ہے"۔

"نہیں!"ــــ مزمل آفندی نے کہاــــ "اپنے لئے پسند کرنے کا مطلب کچھ اور

رہا ہے شمونہ بازار کی کوئی چیز نہیں کہ یہ مجھے پسند آگئی ہے اور میں یہ چیز خرید لوں گا۔ اصل بات یہ ہے کہ میں اس کی محبت کا اسیر ہو گیا ہوں اور یہ محبت میری روح میں اُتر گئی ہے اگر شمونہ مجھے قبول نہیں کرے گی تو میری روح سے اس کی محبت نکل نہیں سکے گی"۔

"تمہیں قبول کرنے یا نہ کرنے کا فیصلہ شمونہ کرے گی"ــــ میمونہ نے کہا اور پوچھاــــ "کیا تم اس کے ساتھ شادی کرنا چاہتے ہو؟"

"شادی صرف اس صورت میں کروں گا کہ یہ میری محبت کو قبول کر لے"ــــ مزمل آفندی نے کہاــــ "لیکن اے قابلِ احترام خاتون! میں ابھی شادی کی بات ہی نہیں کروں گا۔ پہلے وہ مہم سر کروں گا جس کے لئے میں یہاں رکا ہوں..... حسن بن صباح کی گرفتاری..... سلطان نے حکم دیا ہے کہ حسن بن صباح کو زندہ اس کے سامنے لایا جائے لیکن وہ میرے سامنے آگیا تو میں اسے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ میری تلوار اس کے خون کی پیاسی ہے"۔

"اس لئے کہ اس نے میرے پہلے خاوند کو ڈاکوؤں کے ہاتھوں قتل کروایا تھا؟"ــــ میمونہ نے پوچھاــــ "اور اس لئے کہ اس نے میرے دوسرے خاوند کو بھی قتل کروایا ہے؟..... کیا تم ہم ماں بیٹی کو خوش کرنا چاہتے ہو؟"

"نہیں!"ــــ مزمل آفندی نے جواب دیاــــ "میں اللہ کو اور اللہ کے رسولؐ کی روحِ مقدس کو خوش کرنا چاہتا ہوں۔ حسن بن صباح نے بے شمار عورتوں کو بیوہ اور بے شمار بچوں کو یتیم کیا ہے اور وہ اسلام کی روح کو قتل کر رہا ہے"۔

"آفندی!"ــــ شمونہ بے اختیار بولیــــ "اگر تم اس ابلیس کو قتل کر دو تو خدا کی قسم اپنا جسم اور اپنی روح تمہارے قدموں میں ڈال دوں گی"۔

"میں نے اس سے اپنے دو خاوندوں کے قتل کا انتقام لینا ہے"ــــ میمونہ نے کہاــــ "اور اس نے میری بچی کو جو تربیت دی اور اس سے جو قابلِ نفرت کام کروائے ہیں' میں نے اس کا بھی انتقام لینا ہے"۔

"لیکن ماں!"ــــ شمونہ نے کہاــــ "کیا آپ محسوس نہیں کر رہیں کہ آپ بھی اور آفندی بھی جذباتی باتیں کر رہے ہیں؟ کیا آپ یہ سمجھتی ہیں کہ حسن بن صباح کو قتل کرنا اتنا ہی آسان ہے جتنی آسانی سے آپ قتل کے ارادے کی باتیں کر رہے ہیں؟ میں

اُس کے ساتھ رہی ہوں۔ کوئی شخص اُس کے پاس اُسے قتل کرنے کے ارادے سے جائے گا تو وہ سوچ میں پڑ جائے گا کہ اس شخص کو قتل کروں یا نہ کروں؟"

"میں اُس کی یہ طاقت دیکھ چکی ہوں" — میمونہ نے کہا — "میں اسے طاقت نہیں جادو کہوں تو غلط نہیں ہو گا"۔

"طاقت کہو یا جادو!" — شمونہ نے کہا — "اُسے جتنا میں جانتی ہوں اتنا آپ دونوں نہیں جانتے۔ میں کہہ رہی ہوں کہ اسے قتل کرنے کا کوئی اور طریقہ سوچا جائے گا۔ اب سلطان اسے پکڑ لانے کے لئے فوج بھیج رہا ہے۔ میں آپ کو بتاتی ہوں وہ نہیں پکڑا جائے گا۔ اگر پکڑا گیا تو بڑا ہی خوبصورت دھوکہ دے کر نکل جائے گا۔ اسے قتل کرانے کے لئے قرامطیوں کو استعمال کیا جائے تو کامیابی کی امید رکھی جا سکتی ہے"۔

"یہ تم کیسے کہہ سکتی ہو؟" — مزمل آفندی نے پوچھا۔

"یہ میں اس لئے کہہ سکتی ہوں کہ میں حسن بن صباح کے ساتھ رہی ہوں" — شمونہ نے جواب دیا — "اس نے تین چار بار یہ الفاظ کہے تھے کہ صرف قرامطی ہیں جن سے میں خطرہ محسوس کرتا ہوں...... میں نے اس سے وجہ پوچھی تو اس نے کہا تھا کہ قرامطی خونخوار لوگ ہیں اور ان کی تاریخ قتل و غارت گری سے بھری پڑی ہے۔ حسن بن صباح نے مجھے بتایا تھا کہ قرامطیوں نے خانہ کعبہ میں بھی مسلمانوں کا قتل عام کیا تھا"۔

"لیکن اب قرامطیوں میں وہ بات نہیں رہی" — میمونہ نے کہا۔

"میں حسن بن صباح کی بات کر رہی ہوں" — شمونہ نے کہا — "وہ کسی سے نہیں ڈرتا۔ خدا سے بھی نہیں ڈرتا لیکن اُس کے دل میں قرامطیوں کا خطرہ موجود رہتا ہے۔ ایک بار اُس نے مجھے ایک ماں بیٹے کا قصہ سنایا اور کہا تھا کہ یہ سچا واقعہ ہے۔ اس کا راوی بغداد کا ایک مشہور طبیب ابوالحسین ہے جو عرصہ ہوا فوت ہو گیا ہے۔ اس کا سنا ہوا یہ واقعہ کاتبوں نے تحریر کر لیا تھا......

"اس طبیب کے پاس ایک عورت آئی جس کے شانے پر تلوار کا گہرا اور لمبا زخم تھا۔ وہ زخم کی مرہم پٹی کرانے آئی تھی۔ طبیب نے پوچھا کہ یہ زخم کیسے آیا ہے۔ عورت نے زار و قطار روتے ہوئے کہا کہ اس کا اکلوتا اور نوجوان بیٹا کچھ عرصے سے لاپتہ ہے وہ شہروں اور قصبوں کی خاک چھانتی پھری مگر بیٹے کا کھوج نہ ملا......

"وہ قرامطہ میں تھی۔ بیٹا وہاں بھی نہیں تھا۔ کسی نے اسے کہا کہ وہ بغداد چلی جائے شاید بیٹا وہاں مل جائے۔ ماں بغداد کو روانہ ہو گئی۔ تھکی ہاری بغداد کے قریب پہنچی تو اسے اپنا بیٹا نظر آ گیا۔ وہ قرامطیوں کے ایک لشکر کے ساتھ جا رہا تھا۔ اسے دیکھ کر ماں کی تھکن ختم ہو گئی۔ اس نے بیٹے کو پکارا۔ بیٹا اسے دیکھتے ہی لشکر سے نکل آیا۔ ماں نے اسے گلے لگا لیا۔ پھر اس سے خیر خیریت پوچھی اور گلے شکوے کرنے لگی کہ وہ ماں کو بھول گیا ہے......

"بیٹا بولا' فضول باتیں بند کرو ماں' یہ بتاؤ تمہارا دین کیا ہے؟...... ماں نے حیرت زدگی کے عالم میں کہا' کیا باہر گھوم گھوم کر' دیس سے پردیسی ہو کر تیرا دماغ صحیح نہیں رہا؟ میں اسی دین کو مانتی ہوں جسے پہلے مانتی تھی۔ یہ دین اسلام ہے' سب مذہبوں میں سچا مذہب اسلام ہے...... بیٹا پھٹ کر بولا' مت غلط بات کہہ ماں! وہ باطل ہے جس کو ہم سچا دین مانتے رہے ہیں۔ سچا دین یہ ہے جس کا اب میں پجاری ہوں۔ یہ ہے قرامطی دین۔ اگر تم اسلام کو مانتی ہو تو قرامطی اسلام کو مانو......

"ماں کے تو جیسے ہوش ہی اُڑ گئے۔ بیٹے نے صحابہ کرامؓ کے خلاف ایک بیہودہ بات کہہ دی۔ ماں نے اس کے منہ پر تھپڑ مارا اور کہا' کافروں کو ہاتھ لگا' توبہ کر اور کلمہ سے حلف اٹھا!...... بیٹے نے ماں کو غصے سے گھورا اور اپنے لشکر سے جا ملا۔ ماں کو جس بیٹے کی جدائی نے پاگل کر رکھا تھا اور جو بستی بستی' قریہ قریہ بیٹے کو ڈھونڈتی پھرتی تھی' بیٹے کو لشکر کے ساتھ جاتا دیکھتی رہ گئی......

"شہر بغداد قریب تھا' ماں بغداد چلی گئی۔ وہ روتی اور فریادیں کرتی تھی۔ اسے اپنے جیسی ایک عورت مل گئی۔ اس نے اس مجبور ماں سے پوچھا کہ وہ کون سا دکھ ہے جو اسے رلا رہا ہے۔ ماں نے حال دل کہہ سنایا۔ عورت نے اسے بتایا کہ وہ ہاشمی خاندان سے تعلق رکھتی ہے اور قرامطیوں کی قید میں بھی رہ چکی ہے جس کی وجہ یہ ہوئی کہ وہ دینِ اسلام سے منحرف نہیں ہوئی......

"ہاشمی خاندان کی یہ خاتون اس غمزدہ ماں کو اپنے گھر لے جا رہی تھی کہ قرامطی بیٹا پھر سامنے آ گیا۔ اس نے ماں سے پوچھا' تو نے دین اسلام کو ترک کرنے کا فیصلہ کیا ہے یا نہیں؟...... ماں نے کہا' میں نے اپنے گمراہ بیٹے کو ترک کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے...... بیٹے نے بڑی تیزی سے تلوار نیام سے نکالی اور للکار کر کہا' میں اپنی ماں کو قرامطی دین پر قربان

کرتا ہوں۔ یہ کہہ کر اُس نے ماں پر تلوار کا زوردار وار کیا۔ ماں وار بچا تو گئی لیکن تلوار اُس کے شانے پر پڑی اور زخم گہرا آیا۔ کچھ لوگوں نے دوڑ کر بیٹے کو پکڑ لیا۔ ماں قتل ہونے سے بچ گئی اور طبیب ابوالحسین کے ہاں جا پہنچی"۔

یہ واقعہ ابنِ اثیر نے "تاریخ کامل" کی ساتویں جلد کے صفحہ 173 پر لکھا ہے۔ اس کی تحریر کے مطابق اس واقعہ کا اختتام یوں ہوا تھا کہ قرامطی تعداد میں تو بہت زیادہ ہو گئے تھے لیکن بغداد میں ابھی ان کی حکومت قائم نہیں ہوئی تھی۔ اپنی ماں پر قاتلانہ حملہ کرنے والا بیٹا پکڑا گیا۔ ایک روز ماں طبیب سے مرہم پٹی کرا کے آرہی تھی۔ اُس نے قیدیوں کی ایک ٹولی دیکھی۔ ہر قیدی کے پاؤں میں بیڑیاں تھیں۔ ان میں زخمی ماں کا بیٹا بھی تھا۔ ماں نے بیٹے کو دیکھا اور چلا کر بولی ——— "اللہ تجھ سے بھلائی نہ کرے جس نے اپنے سچے دین کو باطل کہا اور رسولؐ کے ساتھیوں کی توہین کی۔ اس قید سے تو کبھی آزاد نہ ہو"۔

"حسن بن صباح نے مجھے یہ واقعہ سنایا تھا" ——— شمونہ نے یہ واقعہ سنا کر کہا ——— "وہ کہتا تھا کہ میں اس قسم کے پیروکار چاہتا ہوں جو اپنے عقیدے پر خواہ یہ عقیدہ باطل ہی ہو، اپنی ماں کو، اپنے باپ کو اور اپنے بچوں کو بھی ذبح کر دیں"۔

"ہم قرامطیوں کو کہاں سے لائیں؟" ——— مزمل آفندی نے کہا۔

"مل جائیں گے" ——— شمونہ نے کہا ——— "میں امیرِ شہر سے بات کروں گی لیکن ابھی نہیں۔ ابھی وہ فوج بھیج رہے ہیں۔ خدا کرے وہ پکڑا جائے اگر نہ پکڑا گیا تو میں قرامطیوں کا انتظام کروں گی"۔

"شمونہ!" ——— مزمل آفندی نے کہا ——— "اگر میں وہی کام کر دوں جو تم سمجھتی ہو کہ قرامطیوں کے سوا اور کوئی نہیں کر سکتا تو....."

"تو جو انعام مانگو گے امیرِ شہر سے دلواؤں گی" ——— شمونہ نے اُس کی بات کاٹ کر کہا۔

"نہیں شمونہ!" ——— مزمل آفندی نے جذباتی سے لہجے میں کہا ——— "میں نے کسی امیر، کسی وزیر اور کسی سلطان سے انعام نہیں لینا" ——— اُس نے شمونہ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھا۔

میمونہ اٹھ کھڑی ہوئی اور ماں بیٹی کمرے سے نکل گئیں۔

امیرِ شہر کے محل نما مکان کے عقب میں کچھ دُور بڑا ہی خوشنما باغ تھا جس میں شہر کے لوگ داخل نہیں ہو سکتے تھے۔ اس میں گھنے پھولدار پودے تھے۔ گھنی بیلیں اور سارے باغ پر سایہ کئے ہوئے درخت بھی تھے، اور یہ درخت تعداد میں بہت زیادہ تھے۔ بعض بیلیں اس طرح درختوں پر چڑھی ہوئی تھیں کہ سبزے کے غار سے بنے ہوئے تھے۔

اس دن کا پچھلا پہر تھا، شمونہ مزمل آفندی کے کمرے میں آئی اور یہ کہہ کر چلی گئی ——— "میں باغ میں جا رہی ہوں۔ وہیں آجاؤ"۔

تھوڑی ہی دیر بعد وہ دونوں باغ کے ایک بہت ہی دلنشیں اور ڈھکے چھپے گوشے میں بیٹھے ہوئے تھے۔

"کیا میں یہ سمجھوں کہ تم نے میری محبت کو قبول کر لیا ہے شمونہ؟" ——— مزمل آفندی نے پوچھا۔

"میں نے تمہاری محبت کو ٹھکرایا تو نہیں" ——— شمونہ نے کہا ——— "لیکن مزمل! میں تمہیں خبردار کرنا ضروری سمجھتی ہوں کہ میری محبت تمہیں راس نہیں آئے گی۔ حسن بن صباح کے ہاں مجھے ایک بڑا ہی خوبصورت دھوکہ بنایا گیا تھا اور مجھے یہ تربیت دی گئی تھی کہ جس آدمی کو جال میں لینا ہو اس پر نشہ بن کر طاری ہو جاؤ اور اسے ہوش ہی نہ آنے دو کہ وہ ایک بڑے ہی خطرناک دھوکے میں آگیا ہے..... میں نے یہ کمال حاصل کیا اور مَرو میں اپنے اس کمال کو آزمایا اور ایک ایسے آدمی کی عقل کو اپنی مٹھی میں لے لیا جو بلاشک و شبہ زاہد، پارسا اور دانشمند تھا۔ میرا راز فاش ہونے کی وجہ کچھ اور تھی میں نے حسن بن صباح کا راز بھی فاش کر دیا.....

میں یہاں آگئی اور امیرِ شہر ابو مسلم رازی سے پناہ مانگی۔ انہوں نے مجھے پناہ میں لے لیا۔ میں نے محسوس کر لیا تھا کہ میرے اندر انسانیت زندہ ہے۔ میں نے اپنی فطرت کو ابلیسی اوصاف سے پاک کرنے کا عزم کر لیا۔ ابو مسلم رازی نے مجھے ایک ایسے عالمِ دین کے حوالے کر دیا جو واقعی عالمِ دین تھا۔ میں نے اسے اپنا پیر و مرشد مان لیا۔ وہ تو تارک الدنیا تھا۔ میں نے اس کی بہت خدمت کی لیکن ہوا یہ کہ میری روح کی پیاس بجھتی گئی اور میرے پیر و مرشد کی روح میں تشنگی پیدا ہوتی گئی"۔

شمونہ نے مزمل آفندی کو لورالفہ کا سارا واقعہ سنایا۔

"میں جانتی ہوں اُس نے اپنے آپ کو سزائے موت دی تھی" — شمونہ نے کہا — "وہ تو مر گیا لیکن میری ذات میں یا میری روح میں عجیب سی بے چینی اور تلخی پیدا ہو گئی۔ مجھے اپنے وجود سے نفرت ہو گئی۔ میرے دماغ پر یہ خیال غالب آگیا کہ ہر عورت یا ہر خوبصورت عورت کے ساتھ شیطان کا تعلق ضرور ہوتا ہے۔ ابو مسلم رازی نے کہا تھا کہ ایک خوبصورت عورت میں اتنی طاقت ہوتی ہے کہ وہ کسی بھی مرد کے ایمان کو شاہ کر اُس میں ابلیس کو بیدار کر سکتی ہے لیکن جن کے ایمان مضبوط ہوتے ہیں ان کا ابلیس کچھ نہیں بگاڑ سکتا"۔

"تم نے مجھے یہ واقعہ کیوں سنایا ہے؟" — مزمل آفندی نے پوچھا۔

"اس لئے کہ میرے دل نے تمہاری محبت کو قبول کر لیا ہے" — شمونہ نے کہا — "تم عام سے امیرزادے ہوتے تو اور بات تھی لیکن میں تم میں کوئی ایسا جذبہ دیکھ رہی ہوں جو ہر کسی میں نہیں ہوتا۔ میں ڈرتی ہوں کہ تم نے مجھے خوبصورت لڑکی سمجھ کر میری محبت کا نشہ اپنے دل پر طاری کر لیا تو میں اپنے آپ کو اس گناہ کی گنہگار سمجھوں گی۔ کبھی تو خدا سے گلہ شکوہ بھی کر لی ہوں کہ مجھے عورت کیوں بنایا تھا..... اگر میں تمہیں تفصیل سے سناؤں کہ میں بچپن میں اغوا ہوئی تھی تو اس عمر سے لے کر جوان ہونے تک مجھے کیسی تربیت ملی اور میں نے کیسی زندگی گزاری ہے تو تم آج بھی مجھ پر اعتبار نہ کرو۔ تم آج بھی مجھے ایک دلکش دھوکہ کہو گے، لیکن میں تمہیں بتاتی ہوں کہ میری ذات میں جو انقلاب آیا ہے اس میں میرا کوئی عمل دخل نہیں، یہ ایک معجزہ ہے۔ میں نے یہ راز پا لیا ہے کہ خدا مجھ سے اپنے عظیم اور سچے دین کے لئے کوئی کام کروانا چاہتا ہے"۔

"معلوم نہیں تم نے یہ راز بھی پایا ہے یا نہیں!" — مزمل آفندی نے کہا — "اللہ کی ذاتِ باری نے تمہارے گناہ بخش دیئے ہیں..... اور میں تمہیں یہ بھی بتا دوں کہ میری تمہارے ساتھ یہ ملاقات جو غیر متوقع طور پر اور انوکھے طریقے سے ہوئی ہے اس کا کوئی خاص مقصد ہے اور یہ مقصد اللہ کی ذاتِ باری نے متعین کیا ہے..... تم نے ٹھیک کہا ہے کہ میں اپنے دل پر تمہیں صرف خوبصورت لڑکی سمجھ کر محبت کا نشہ طاری نہ کروں..... نہیں شمونہ! میں ایسا نہیں کروں گا۔ میں نے تمہیں پہلے کہا تھا کہ میں نے

تم میں کوئی خاص بات دیکھی ہے"۔

"میں تمہیں وہ خاص بات بتا دیتی ہوں" — شمونہ نے کہا — "میں حسن بن صباح کو قتل کرنا چاہتی ہوں۔ اس نے میرے دو باپ قتل کروائے ہیں۔ ایک سگا دوسرا سوتیلا۔ اس نے میری ماں کو دو بار بیوہ کیا ہے۔ یہ تو میرا ذاتی معاملہ ہے۔ دوسرا معاملہ اسلام کا ہے۔ وہ اپنے آپ کو مسلمان اور اسلام کا شیدائی ظاہر کر رہا ہے لیکن وہ اسلام کی جڑیں کاٹ رہا ہے..... ایک بات اور بھی ہے۔ اُس نے میرے قتل کا حکم دے رکھا ہے۔ اُس نے مجھے ایک شخص کے گھر میں قیدی کی حیثیت سے رکھا تھا۔ اس شخص کی بیوی کو پتہ چل گیا کہ مجھے قتل کیا جائے گا۔ اس نے مجھے رات کو فرار کرا دیا اور میں امیرِ شہر ابو مسلم رازی کے پاس آگئی"۔

"یہی عزم میرا ہے" — مزمل آفندی نے کہا — "یہ کام میں نے کرنا ہے۔ اگر میں اس مہم میں ناکام رہا اور مارا گیا تو یہ کام کرنے کی کوشش کرنا۔ میں اپنی زندگی میں تمہیں آگے نہیں جانے دوں گا۔ میں فوج کے ساتھ جا رہا ہوں۔ سالار امیر ارسلان حسن بن صباح کو سلطان کے حکم کے مطابق زندہ پکڑنے کی کوشش کرے گا اور پکڑ بھی لے گا لیکن میں اُسے وہیں قتل کر دوں گا"۔

حسن بن صباح کے قتل کی باتیں کرتے کرتے وہ ایک دوسرے میں گھل مل گئے اور جذباتی باتوں پر آگئے۔ شمونہ جب وہاں سے نکلی تو وہ مزمل آفندی کی محبت سے سرشار تھی۔

○

تین چار دنوں بعد ابو مسلم رازی نے مزمل آفندی کو بلایا۔ سالار امیر ارسلان آگیا تھا۔

"پانچ سو سواروں کا دستہ آگیا ہے" — ابو مسلم رازی نے مزمل آفندی کو بتایا — "آج ہی جتنی جلدی ہو سکے روانہ ہونا ہے۔ اگر قافلہ بغداد سے نکل گیا ہو تو اس کے تعاقب میں جانا ہے۔ تم حسن بن صباح کو پہچانتے ہو۔ امیر ارسلان نے اسے کبھی نہیں دیکھا۔ تم ہمارے مہمان ہو اور ہمارے لشکری یا ملازم نہیں ہو اس لئے یہ فرض تم پر عائد نہیں ہوتا کہ وہاں اگر لڑائی ہو جائے تو تم بھی لڑو"۔

"کیا آپ کو توقع ہے کہ وہاں لڑائی ہو گی؟" — مزمل آفندی نے پوچھا۔

"ہاں!" — ابو مسلم رازی نے جواب دیا — "تم شاید نہیں سمجھتے۔ جسے تم قافلہ کہہ رہے ہو اس میں حسن بن صباح کے باقاعدہ لڑنے والے آدمی بھی ہوں گے"۔

"میں ایک بات کہوں گا امیرِ شہر!" — مزمل آفندی نے کہا — "اگر بات لڑائی تک آ گئی تو پھر میں یہ نہیں دیکھوں گا کہ لڑنا میرا فرض ہے یا نہیں۔ مجھے بتایا گیا ہے کہ سلطانِ معظم نے حسن بن صباح کو زندہ پکڑنے کا حکم دیا ہے لیکن امیرِ شہر! حسن بن صباح میرے سامنے آ گیا تو میں نہیں کہہ سکتا کہ میں اسے زندہ ہی پکڑوں گا"۔

"چاہتا تو میں بھی یہی ہوں" — ابو مسلم رازی نے کہا — "اس شخص کو میں بھی زندہ نہیں دیکھنا چاہتا۔ بہرحال میری طرف سے تمہارے لئے کوئی حکم اور کوئی پابندی نہیں"۔

دن کا پچھلا پہر تھا جب سالار امیر ارسلان کی قیادت میں پانچ سو سواروں کا دستہ رے سے کوچ کر گیا۔

انہیں بتانے والا کوئی نہ تھا کہ حسن بن صباح بغداد سے اس قافلے کو چھوڑ کر اپنے دو ساتھیوں کے ساتھ اسی روز اصفہان کی طرف روانہ ہو گیا تھا جس روز مزمل آفندی میمونہ کو ساتھ لے کر وہاں سے نکلا تھا۔

یہ بتانا مشکل ہے کہ پانچ سو سواروں کا یہ دستہ کتنے پڑاؤ کر کے اور کتنے دنوں بعد بغداد پہنچا۔ اس دستے کی رفتار بہت ہی تیز تھی۔ دستہ جب بغداد پہنچا تو پتہ چلا کہ قافلے کو یہاں سے روانہ ہوئے تین دن گزر گئے ہیں۔ امیر ارسلان نے دستے کو کچھ دیر آرام دیا، کچھ کھلایا پلایا اور وہاں سے قافلے کے تعاقب میں کوچ کر گئے۔

جو قافلہ تین دن پہلے روانہ ہوا تھا اس تک سوار دستے کو پہنچنے کے لئے کم از کم دو دن تو ضرور ہی لگنے تھے۔ امیر ارسلان نے اپنے دستے کو صرف ایک پڑاؤ کرایا اور بڑی تیز رفتار سے قافلے کے تعاقب میں گیا۔

اس روز جس روز سواروں کا دستہ قافلے تک پہنچا سورج سر پر آ گیا تھا اور قافلہ ایک ہرے بھرے، سرسبز علاقے میں سے گزر رہا تھا۔ دو لمبی پہاڑیاں تھیں جن کے درمیان کشادہ وادی تھی۔

امیر ارسلان اور مزمل آفندی دستے کے آگے آگے جا رہے تھے۔ ان کا راستہ ایک پہاڑی کی ڈھلان پر تھا۔ وہ ایک موڑ مڑے تو نیچے انہیں قافلہ جاتا نظر آیا۔ قافلے میں ایک ہزار سے زیادہ لوگ تھے۔ چند ایک گھوڑے اور کچھ اونٹ بھی تھے۔ بعض لوگوں

رکھا ہے تھے۔ ان میں بھی مسافر سوار تھے۔ یہ مسافر یقیناً" مالدار خاندانوں کی عورتیں تھیں۔ سالار امیر ارسلان نے اپنے دستے کو روک لیا۔

"تم بھی سوچو آفندی!" — امیر ارسلان نے مزمل آفندی سے کہا — "اگر ہم قافلے کے عقب سے گئے تو قافلے والے ہمیں ڈاکو سمجھ کر آگے کو بھاگ اٹھیں گے۔ مجھے بتایا گیا ہے کہ حسن بن صباح اور اس کے ساتھی اتنے ہوشیار اور چالاک ہیں کہ وہ پہاڑیوں میں بکھر کر غائب ہو جائیں گے"۔

"یہ تو میں بھی جانتا ہوں" — مزمل آفندی نے کہا — "حسن بن صباح لومڑی کی خصلت کا انسان ہے۔ مجھے تو یہ بھی بتایا گیا ہے کہ وہ دیکھتے ہی دیکھتے غائب ہو جاتا ہے۔ قافلے کو گھیرے میں لیا جائے"۔

سالار امیر ارسلان تجربہ کار سالار تھا۔ اس نے اپنے دستے کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا۔ ایک حصے کے کمانڈر کو قافلہ دکھایا اور اسے کہا کہ وہ دور کا چکر کاٹ کر اس وادی کے اگلے حصے میں پہنچے اور قافلے کو اس طرح روک لے کہ کسی کو ادھر ادھر بھاگنے یا چھپنے کا موقع نہ ملے۔

امیر ارسلان خود دوسرے حصے کے ساتھ رہا۔ اس نے ان سواروں کو اس وقت آگے لے جانا تھا جب دوسرے حصے نے قافلے کا راستہ روک لینا تھا۔ دوسرے حصے کے کمانڈر نے بلندی پر کھڑے ہو کر قافلے کے اردگرد کے علاقے کو دیکھا۔ وہ اپنے لئے راستہ دیکھ رہا تھا۔

○

قافلے کو دیکھنے والے سوار پیچھے مڑے اور جس پہاڑی کے ڈھلانی راستے پر وہ آ رہے تھے، اس پہاڑی سے اترے۔ پہاڑیوں کے اندر اندر وہ دور تک چلے گئے۔ امیر ارسلان نے اپنے سواروں کو اس پہاڑی سے اتارا۔ وہ بلند راستے پر اس خیال سے نہ چلے کہ قافلے میں سے کسی نے گھوم کے دیکھ لیا تو وہ سارے قافلے کو خبردار کر دے گا اور حسن بن صباح کو نکل بھاگنے کا موقع مل جائے گا۔ قافلہ اپنی رفتار سے جا رہا تھا۔

اس پہاڑی علاقے میں داخل ہونے سے پہلے قافلے کے چار پانچ آدمیوں نے قافلے کو روک لیا تھا اور کہا تھا کہ اب ہم بڑی خطرناک جگہ پر آ گئے ہیں۔ یہاں تین قافلے لٹ چکے ہیں۔ ڈاکو مال و دولت کے ساتھ جوان عورتوں کو بھی لے گئے تھے۔

"تمام جوان آدمی چوکس ہو جاؤ" — ایک آدمی نے اعلان کیا — "جس کے پاس جو بھی ہتھیار ہے وہ ہاتھ میں رکھے اور اگر ڈاکوؤں کا حملہ ہو گیا تو لڑنے والے تمام آدمی قافلے کے باہر باہر رہیں اور عورتوں اور بچوں کو ایک جگہ اکٹھا کر لیں اور لوگ انہیں اپنے نرغے میں لے لیں..... اپنے آپ پر ڈاکوؤں کا خوف طاری نہ کرلینا۔ دیکھا گیا ہے کہ لوگوں پر ڈاکوؤں اور رہزنوں کی دہشت طاری ہو جاتی ہے اور یہ دہشت انہیں کمزور کر دیتی ہے کہ دہشت زدہ لوگ ڈاکوؤں کے آگے بھاگ نکلتے ہیں یا ہتھیار ڈال دیتے ہیں"۔

دیکھتے ہی دیکھتے چار سو سے کچھ زیادہ نوجوان' جوان سال اور ادھیڑ عمر آدمی قافلے سے الگ ہو گئے۔ یہ سب لڑنے والے تھے۔ اس دور میں لوگ تلواریں اس طرح اپنے ساتھ رکھتے تھے جیسے عورتیں زیور پہنتی ہیں۔ ان میں زیادہ آدمیوں کے پاس تلواریں تھیں اور باقی جو تھے' ان میں سے کچھ برچھیوں سے مسلح تھے اور بعض کے پاس خنجر تھے۔ یہ سب آدمی قافلے کے پہلوؤں کے ساتھ' کچھ قافلے کے آگے اور باقی قافلے کے پیچھے ہو گئے۔ اس طرح قافلے کو اپنے حفاظتی حصار میں لے کر انہوں نے کہا کہ اب چلو۔

دو پہاڑیوں کے درمیان کشادہ وادی سے گزرتے قافلے کی ترتیب یہی تھی۔ قافلہ لڑنے والوں کے حصار میں تھا۔

عصر کا وقت تھا جب اچانک قافلے کے سامنے سے چند ایک سوار نمودار ہوئے۔ قافلہ بہت ہی لمبا تھا۔

"ہوشیار ہو جاؤ" — یہ بڑا ہی بلند اعلان تھا جو قافلے میں سے ایک آدمی نے کیا — "ڈاکو آ گئے ہیں..... ڈرنا نہیں۔ ہم لڑیں گے"۔

"ہم ڈاکو نہیں" — سواروں کے کمانڈر نے بڑی ہی بلند آواز میں کہا — "بے خوف ہو کر رک جاؤ"۔

"بزدلو' ڈاکوؤ!" — قافلے میں سے للکار سنائی دی — "آگے بڑھو' ہم تیار ہیں"۔

سواروں کے کمانڈر نے تمام سواروں کو سامنے لانے کی بجائے یہ عقلمندی کی کہ سواروں کو دو حصوں میں تقسیم کر کے دونوں پہاڑیوں کی ڈھلانوں پر چڑھا دیا اور ساتھ ساتھ اعلان کیا کہ کوئی لڑنے کی حماقت نہ کرے' ہم سلطان کی فوج کے سپاہی ہیں' تمہیں حفاظت میں رکھنا ہماری ذمہ داری ہے۔

اتنے میں امیر ارسلان اپنے سواروں کو لے کر قافلے کے عقب میں پہنچ گیا۔ اس نے جب اپنے دوسرے کمانڈر کی یہ عقلمندی دیکھی کہ اس نے گھوڑے ڈھلانوں پر چڑھا دیئے تھے تو امیر ارسلان نے بھی اپنے سواروں کو قافلے کے پہلوؤں پر لے جانے کی بجائے ڈھلانوں کی بلندی پر رکھا۔ قافلے میں قیامت برپا ہو گئی۔ عورتوں اور بچوں کی چیخیں زمین و آسمان کو ہلانے لگیں۔ سواروں کی طرف سے بار بار اعلان ہو رہا تھا کہ وہ ڈاکو نہیں لیکن قافلے میں جو لڑنے والے جوان تھے وہ سواروں کو للکار رہے تھے۔ سالار امیر ارسلان اور مزمل آفندی بلندی پر چلے گئے۔

"میں سالار امیر ارسلان ہوں" — اس نے اعلان کیا — "حسن بن صباح اپنے تمام ساتھیوں کے ساتھ میرے سامنے آ جائے..... حسن بن صباح! تم خود میرے سامنے آ جاؤ گے تو زندہ رہو گے اور اگر میں نے تمہیں خود ڈھونڈ کر پکڑا تو پھر میں تمہاری زندگی کی ضمانت نہیں دے سکتا"۔

اس اعلان کے جواب میں بھی دو تین جوشیلے جوانوں نے للکار کر کہا کہ وہ دھوکے میں نہیں آئیں گے اور پورا مقابلہ کریں گے۔

"قافلے والو!" — مزمل آفندی نے بلندی سے اعلان کیا — "مجھے دیکھو اور پہچانو۔ میں نے تمہارے ساتھ بغداد تک سفر کیا ہے۔ میرا بڑا بھائی' اس کی بیوی اور بچے اس قافلے میں شامل ہیں۔ کیا تم مجھے بھی ڈاکو سمجھتے ہو؟"

مزمل آفندی کا بڑا بھائی ان میں سے نکلا اور دوڑتا ہوا ڈھلان پر چڑھا۔ مزمل آفندی گھوڑے سے کود کر اترا اور اپنے بڑے بھائی سے بغلگیر ہو کر ملا۔ اس نے بھائی کو بتایا کہ یہ سلطان ملک شاہ کے فوجی ہیں اور حسن بن صباح کی گرفتاری کے لئے آئے ہیں۔

"وہ اس قافلے میں نہیں ہے" — مزمل کے بڑے بھائی نے کہا — "سالار محترم! میرا یہ بھائی ایک خاتون کو حسن بن صباح کے جال سے نکال کر بغداد سے نکلا تھا تو اس کے فوراً بعد حسن بن صباح بغداد سے نکل گیا تھا"۔

"کیا کوئی یہ بتا سکتا ہے کہ وہ کس طرف گیا تھا؟" — امیر ارسلان نے پوچھا۔

"اس قافلے کے بہت سے لوگ اس کے معتقد اور مرید ہو گئے تھے" — مزمل کے بھائی نے جواب دیا — "یہ مشہور ہو گیا تھا کہ وہ اللہ کی برگزیدہ ہستی ہے اور غیب کی خبر دینے کی طاقت رکھتا ہے۔ اس نے جہاز کو بڑے ہی تیز و تند سمندری طوفان سے نکال لیا

تھا۔ وہ جب بغداد سے روانہ ہونے لگا تو اس کے مریدوں نے اسے گھیر لیا اور پوچھا تھا کہ وہ کہاں جا رہا ہے۔ کچھ لوگ تو اس کے ساتھ جانے کو تیار ہو گئے تھے لیکن اُس نے سب کو روک دیا اور کہا تھا کہ اُسے آسمان سے اشارہ ملا ہے کہ وہ فوراً اصفہان پہنچے۔ اُس نے یہ بھی کہا تھا کہ اصفہان جا کر اسے اللہ کی طرف سے ایک اور اشارہ ملے گا۔ پھر وہ چلا گیا تھا"۔

سالار امیر ارسلان نے اپنے چند ایک سواروں کو ساتھ لیا اور نیچے اتر آیا۔ وہ قافلے کے سامنے گیا۔ مزمل آفندی اور اس کا بڑا بھائی اس کے ساتھ تھے۔ اُس نے قافلے کے ہر ایک آدمی کو دیکھا اور قافلے کے ساتھ ساتھ چلا گیا۔ قافلہ تقریباً ایک میل لمبا تھا۔ حسن بن صباح کو پہچاننے کے لئے مزمل اور اس کا بھائی ساتھ تھے۔ امیر ارسلان نے اونٹوں کے کجاووں اور پالکیوں کے پردے ہٹا کر دیکھا اور اس طرح دیکھتے دیکھتے قافلے کے دوسرے سرے تک چلا گیا۔ چند اور آدمیوں سے حسن بن صباح کے متعلق پوچھا۔ ان سب نے بتایا کہ حسن بن صباح اپنے دو ساتھیوں کے ساتھ کرائے کے گھوڑوں اور ایک اونٹ کے ساتھ ان جانوروں کے مالکوں سمیت بغداد سے چلا گیا تھا اور اس کی منزل اصفہان تھی۔

سواروں نے قافلے کو ایسے گھیرے میں لے لیا تھا کہ کسی کو نکل بھاگنے کا موقع مل ہی نہیں سکتا تھا۔

سالار امیر ارسلان نے اعلان کروایا کہ قافلہ جا سکتا ہے اور اس کے ساتھ ہی یہ اعلان بھی کروایا کہ قافلے پر ڈاکوؤں کا کوئی گروہ حملہ کرنے کی جرأت نہیں کرے گا کیونکہ یہ پانچ سو سوار اسی علاقے میں اصفہان تک موجود رہیں گے۔

امیر ارسلان نے اپنے سواروں کو بلا کر کوچ کی ترتیب میں کر لیا اور اصفہان کی طرف روانہ ہو گیا۔ ان کے پیچھے پیچھے قافلہ بھی چل پڑا۔

○

سواروں کو اصفہان جلدی پہنچنا تھا اس لئے وہ قافلے سے دور آگے نکل گئے اور کچھ دیر بعد بڑی پہاڑیوں کے درمیان سے بھی نکل گئے۔ علاقہ تو آگے بھی پہاڑی ہی تھا لیکن پہاڑیاں زیادہ اونچی نہیں تھیں۔ بعض تو ٹیکریوں جیسی تھیں اور بکھری ہوئی تھیں۔

ان ٹیکریوں میں سے ایک گھوڑے کے سرپٹ دوڑنے کی آوازیں سنائی دیں جو

گھوڑے کی رفتار سے دور ہٹتی جا رہی تھیں۔ اس کے ساتھ ہی ایک گھوڑا قافلے کی طرف سے سوار دستے کی طرف دوڑتا آیا اور سالار امیر ارسلان کے پہلو میں جا رکا۔

"محترم سالار!" ــــ سوار نے کہا ــــ "قافلے میں سے ایک سوار نکلا اور اس نے گھوڑے کو ایڑ لگا دی۔ مجھے شک ہے کہ وہ حسن بن صباح کے آدمیوں میں سے تھا اور اصفہان جا کر یا جہاں کہیں بھی وہ ہے اطلاع دینے گیا ہے کہ اس کی گرفتاری کے لئے ایک سالار آ رہا ہے"۔

اس سوار کو پکڑنا ممکن نہیں تھا۔ اس کے گھوڑے کے ٹاپ بھی اب سنائی نہیں دیتے تھے۔ امیر ارسلان اپنے سوار دستے کو سرپٹ تو نہیں دوڑا سکتا تھا کہ وہ اس سوار کے ساتھ ساتھ اصفہان پہنچ جاتا۔ اس نے سوار دستے کو ذرا تیز چلنے کا حکم دیا۔

اصفہان میں ایک بہت بڑا مکان تھا جس کی شکل و صورت ایک قلعے جیسی تھی۔ حسن بن صباح کچھ دن پہلے وہاں پہنچا تھا اور اس نے احمد بن عطاش کو اپنی آمد کی اطلاع دی تھی۔ احمد بن عطاش خلجان میں تھا۔ اطلاع ملتے ہی وہ بڑی لمبی مسافت تھوڑے سے وقت میں طے کر کے اصفہان پہنچ گیا۔ حسن بن صباح نے اسے سنایا کہ مصر میں اس کے ساتھ کیا بیتی تھی اور اسے قید میں ڈال دیا گیا تھا اور کس طرح وہ قید سے رہا ہوا اور جس طرح وہ مصر سے حلب پہنچا تھا وہ ساری روداد سنائی پھر پوچھا کہ کب وہ خلجان آئے یا نہیں۔

"تمہیں آخر آنا ہی ہے حسن!" ــــ احمد بن عطاش نے کہا ــــ "لیکن ہمارے جاسوسوں نے جو اطلاعیں دی ہیں وہ یہ ہیں کہ سلطان ملک شاہ تمہیں گرفتار کرنے کی کوشش میں ہے۔ تم ابھی یہیں رہو"۔

"میرے پیر استاد!" ــــ حسن بن صباح نے کہا ــــ "مجھے یہ بتائیں کہ لوگ مجھے بھول تو نہیں گئے؟ کیا آپ نے اس سلسلے میں کوئی اور کام کیا ہے؟"

"تم بھول جانے کی بات کرتے ہو حسن!" ــــ احمد بن عطاش نے کہا ــــ "لوگ تمہاری راہ دیکھ رہے ہیں۔ میں نے جو کامیابی حاصل کی ہے وہ تم وہاں آ کر دیکھو گے۔ ہم لوگوں کو یہ بتا رہے ہیں کہ خدا کا ایلچی اب پہلے کی طرح اسی علاقے میں کہیں آسمان سے اترے گا اور جو بھی اس کا پیروکار بنے گا اُسے اس دنیا میں جنت مل جائے گی۔ لوگ تمہارے نام پر جانیں دینے کے لئے تیار رہتے ہیں۔ میں نے جانبازوں کا ایک گروہ تیار کر

لیا ہے جو ایک اشارے کا منتظر رہتا ہے۔ ہم بہت جلدی سلجوقیوں کا مقابلہ کرنے کے قابل ہو جائیں گے۔ اس علاقے کی تقریباً تمام مسجدوں میں جو امام یا خطیب ہیں وہ سب ہمارے آدمی ہیں۔ وہ لوگوں کو قرآن اور احادیث کی جو تفسیریں سنا رہے ہیں ان میں ہمارے عقیدے اور خدا کے ایلچی کے نزول کی پیش گوئیاں ہوتی ہیں۔ لوگ اسی کو صحیح اسلام سمجھ رہے ہیں"۔

"لڑکیوں کا گروہ تیار ہوا ہے یا نہیں؟" ــــ حسن بن صباح نے پوچھا ــــ "اور کیا جانبازوں کو حشیش دی جا رہی ہے یا نہیں؟"

"حشیش نے ہی تو ہمارا کام آسان کیا ہے" ــــ احمد بن عطاش نے کہا ــــ "لوگوں کو خصوصاً لڑنے والے لشکریوں کو معلوم ہی نہیں کہ ہم انہیں کھانے پینے کی اشیاء میں حشیش دے رہے ہیں۔ ہماری لڑکیوں نے جو کام کئے ہیں وہ تم وہاں آ کر دیکھو گے۔ بعض قبیلوں کے سردار جو ہماری باتوں کا اثر قبول نہیں کر رہے تھے بلکہ ہمارے خلاف ہو گئے تھے، انہیں ہماری لڑکیوں نے ایسا رام کیا ہے کہ اب وہی سردار ہماری طاقت بن گئے ہیں"۔

تمام مؤرخوں نے تفصیل سے لکھا ہے کہ ان لوگوں نے انسانی فطرت کی کمزوریوں اور فطری مطالبات کے عین مطابق لوگوں کے ذہنوں میں اپنا باطل عقیدہ ڈالا تھا۔ داستان گو پہلے بیان کر چکا ہے کہ لوگوں کو اکٹھا کر کے آگ میں ایسی کوئی جڑی بوٹی ڈال دی جاتی تھی جس کا دھواں اور جس کی بو انسانی ذہن پر نشہ سا طاری کر دیتی تھی لیکن لوگ محسوس نہیں کرتے تھے کہ ان کے دماغوں پر کس طرح قبضہ کیا جا رہا ہے۔ وہ بظاہر ذہنی طور پر نارمل رہتے تھے لیکن ان جڑی بوٹیوں کی وجہ سے حسن بن صباح کے ٹولے کے قبضے میں چلے جاتے تھے پھر اس ٹولے کے بڑے لوگ جب باطل کی بھی کوئی بات کرتے تھے تو ان کے دماغ باطل کو بھی قبول کر لیتے تھے۔

دراصل وہ پسماندگی کا دَور تھا۔ لوگ جو مسلمان تھے وہ اس لئے مسلمان تھے کہ دینِ اسلام ان کے ورثے میں چلا آ رہا تھا۔ جو اگر کسی کی باتوں میں نہیں آتے تھے تو وہ عیسائی اور یہودی تھے۔ اسلام کے دائرے میں رہ کر مسلمانوں کو کوئی نئی چیز بتائی جاتی تو وہ غور سے سنتے اور اسے اسلامی سمجھ کر قبول کر لیتے تھے۔ اگر آج کی زبان میں بات کی جائے تو یوں کہا جا سکتا ہے کہ کسی خاص جڑی بوٹی کے دھوئیں اور قرآن کی نئی تفسیروں کے

ذریعے سیدھے سادے لوگوں کو ہپناٹائز کر لیا گیا تھا۔ لوگوں کو کچھ شعبدے بھی دکھائے گئے تھے۔ لوگ نہ سمجھ سکے کہ ان کے ذہنوں میں شیطانی نظریات ٹھونسے جا رہے ہیں۔ لوگوں کو انہیں بتائے بغیر جس جڑی بوٹی کا دھواں دیا جاتا تھا وہ مؤرخوں کے کہنے کے مطابق، حشیش کا پودا تھا۔ سینکڑوں جانبازوں کا جو گروہ تیار کیا گیا اسے انہیں بتائے بغیر حشیش پلائی جاتی تھی۔

○

احمد بن عطاش ابھی وہیں تھا کہ اطلاع دی گئی کہ ایک سوار آیا ہے جس کی حالت ٹھیک معلوم نہیں ہوتی..... اُسے فوراً اندر بلا لیا گیا۔ اُس کی حالت بہت ہی بُری تھی۔ اصفہان تک جلدی پہنچنے کے ارادے سے اس نے اتنے لمبے سفر میں پڑاؤ کیا ہی نہیں تھا گھوڑے کو چند جگہوں پر روک کر پانی پلایا اور سفر جاری رکھا۔ اُس سے بولا بھی نہیں جاتا تھا۔

"سلطان کے پانچ چھ سو سوار آ رہے ہیں" ــــ اس نے بڑی مشکل سے کہا ــــ "آپ کو گرفتار کریں گے۔ اچھا ہوا آپ پہلے نکل آئے تھے۔ کسی نے بتا دیا ہے کہ آپ اصفہان چلے گئے ہیں..... وہ اِدھر آ رہے ہیں" ــــ اور وہ بیہوش ہو گیا۔

"مجھے یہاں سے نکل جانا چاہئے" ــــ حسن بن صباح نے کہا ــــ "لیکن جاؤں کہاں؟..... خلجان؟..... شاہ در؟"

"نہیں!" ــــ احمد بن عطاش نے کہا ــــ "کسی بھی بڑے شہر میں جانا خطرناک ہو گا۔ قلعہ تبرز گمنام سا قلعہ ہے، دور بھی نہیں۔ وہاں اپنے آدمی ہیں۔ سب قابلِ اعتماد ہیں اور ضرورت پڑی تو جانیں قربان کر دیں گے"۔

تاریخ بتاتی ہے کہ حسن بن صباح کو رات کے سیاہ پردے میں قلعہ تبرز پہنچا دیا گیا۔ صرف ایک دن اور گزرا تو سالار امیر ارسلان پانچ سو سواروں کے ساتھ پہنچ گیا۔ یہ دستہ طوفان کی طرح اصفہان کی گلیوں میں بکھر گیا۔ سوار اعلان کرتے پھر رہے تھے کہ حسن بن صباح باہر آ جائے۔ ہم ہر گھر کی تلاشی لیں گے۔ جس گھر سے حسن بن صباح برآمد ہو گا اُس گھر کے ہر مرد اور عورت کو ساری عمر کے لئے قید میں ڈال دیا جائے گا۔

اُس وقت اصفہان سلجوقیوں کے زیرِ نگیں تھا۔ کوئی خاندان کسی مشکوک آدمی کو پناہ کہاں دے سکتا تھا۔ اس قلعہ نما مکان پر کوئی شک نہیں کر سکتا تھا جہاں حسن بن صباح

ٹھہرا اور احمد بن عطاش اسے آکر ملا تھا۔ اس مکان میں مذہب پرست لوگ رہتے تھے لیکن وہ تجارت پیشہ تھے۔ وہ مسلمان تھے۔ احمد بن عطاش اب بھی وہاں موجود تھا لیکن اُس نے اپنا حلیہ بدل لیا تھا۔ وہ اس مکان کے اصطبل کا سائیس بن گیا تھا۔ سر اور داڑھی کے بال بکھیر لئے تھے۔ کپڑے بوسیدہ سے پہن لئے اور ان پر گھوڑوں کی لید کے داغ دھبے لگا لئے تھے۔ وہ ذرا اکھڑ بن گیا تھا۔

بہت دیر کے بعد جب کسی نے بھی نہ کہا کہ حسن بن صباح اُس کے گھر میں ہے، ایک ضعیف بڑھیا امیر ارسلان کے پاس آئی۔

"میں گذشتہ رات قلعہ تبریز سے آئی ہوں" ——بڑھیا نے کہا —— "میرا ایک نوجوان پوتا وہاں رہتا ہے۔ اُس سے مجھے بہت پیار ہے۔ کبھی کبھی اپنی گھوڑی پر اسے دیکھنے جاتی ہوں۔ وہاں وہ کوئی کام نہیں کرتا لیکن رہتا بڑی شان سے ہے۔ میں اُسے ملنے گئی تھی۔ رات سے پہلے واپسی سفر کو روانہ ہوئی۔ دروازہ کھلا ہوا تھا۔ میں دروازے سے نکلنے لگی تو چھ گھوڑ سوار دروازے میں داخل ہوئے۔ انہوں نے مجھے روک لیا اور پوچھا کون ہو.....

"میں نے کہا' خود ہی دیکھ لو۔ قبر میں پاؤں لٹکائے بیٹھی ہوں۔ پوتے سے ملنے آئی تھی' واپس اصفہان جا رہی ہوں..... ان میں سے ایک نے کہا' جانے دو اسے۔ اسے تو اپنی ہوش نہیں..... اندر سے سات آٹھ آدمی دوڑے آئے۔ میں دروازے سے باہر آگئی۔ ان میں سے ایک آدمی نے کہا' خوش آمدید حسن بن صباح' آج ہماری قسمت جاگ اٹھی ہے..... ایک اور آدمی کی آواز سنائی دی' نام مت لو احمق' تمہاری آواز اصفہان تک پہنچ سکتی ہے..... معلوم نہیں یہ وہی حسن بن صباح ہے جسے تم ڈھونڈ رہے ہو یا یہ کوئی اور ہے"۔

امیر ارسلان نے اس بڑھیا کے بیٹوں کو بلایا اور پوچھا کہ ان میں سے کس کا بیٹا قلعہ تبریز میں ہے۔

"وہ میرا بیٹا ہے" ——ایک آدمی نے کہا۔

"وہ وہاں کیا کر رہا ہے؟"

"گمراہ ہو گیا ہے" ——اُس نے جواب دیا —— "باطنیوں کے جال میں آگیا ہے اور خدا کے ایلچی کا جانباز بن گیا ہے۔ ہم صحیح العقیدہ مسلمان ہیں۔ معلوم نہیں ہمارے بیٹے

کو ایسا سبز باغ دکھائے گئے ہیں کہ وہ حسن بن صباح کے نام کا ہی ورد کرتا رہتا ہے"۔

اس طرح کڑی سے کڑی ملاتے یہ یقین ہو گیا کہ حسن بن صباح قلعہ تبریز میں ہے۔ سالار امیر ارسلان نے اُسی وقت کوچ کا اور قلعہ تبریز کو محاصرے میں لینے کا حکم دے دیا۔

○

یہاں ایک دو وضاحتیں ضروری ہیں۔ یہ قلعہ تبریز ایران کا آج والا شہر تبریز نہیں۔ یہ ایک گمنام سی بستی تھی جس کا نام و نشان ہی مٹ گیا ہے۔

دوسری وضاحت یہ کہ بعض مؤرخوں نے لکھا ہے کہ حسن بن صباح قلعہ الموت میں جا چھپا تھا اور امیر ارسلان نے وہاں حملہ کیا تھا۔ یہ صحیح نہیں۔ اُس وقت حسن بن صباح کے فرقے نے قلعہ الموت پر قبضہ ہی نہیں کیا تھا۔ قلعہ الموت پر اس فرقے کا قبضہ سال دو سال بعد ہوا تھا اور وہاں خواجہ حسن طوسی نظام الملک نے حملہ کیا تھا۔

بعد کے اکثر تاریخ نویسوں نے قلعوں کے نام لکھنے میں غلطیاں کی ہیں۔ وہاں بہت سے چھوٹے بڑے قلعے تھے۔ ان میں سے بیشتر پر حسن بن صباح کے فرقے کا قبضہ ہو گیا تھا۔

تو یہ تھا قلعہ تبریز جسے سالار امیر ارسلان کے پانچ سو سواروں نے محاصرے میں لے لیا۔ انہوں نے دیواروں پر کمندیں پھینکنے کے لئے رسّے اور دیواریں توڑنے کے لئے سامان' کمانیں اور تیروں کا ذخیرہ اصفہان سے لے لیا تھا۔

"آثار تلبیس" اور "سنین اسلام" کے مطابق حسن بن صباح کے پاس لڑنے والے صرف ستر آدمی تھے اور یہ سب جانباز تھے۔ چھوٹے سے اس قلعے کے دو دروازے کھلے ہوئے تھے جو اُس وقت بند ہونے لگے جب امیر ارسلان کا سوار دستہ بالکل قریب پہنچ گیا تھا۔ چند ایک سواروں نے گھوڑوں کو ایڑ لگا دی کہ وہ دونوں دروازوں سے اندر چلے جائیں۔

دروازے بند ہو رہے تھے۔ اندر کے جانبازوں نے ایسی بے خوفی اور بے جگری سے مقابلہ کیا کہ سوار دروازوں میں داخل نہ ہو سکے اور دروازے بند ہو گئے۔ یہ کوئی بڑا قلعہ نہیں تھا کہ اس کے دروازے لوہے اور شاہ بلوط کی لکڑی کے بنے ہوتے اور ٹوٹ ہی نہ سکتے۔ عام سی لکڑی کے دروازے تھے۔ سواروں نے گھوڑوں سے اُتر کر دروازے

توڑنے شروع کر دیئے۔

اُدھر سواروں نے دیوار پر کمندیں پھینکیں۔ کوئی کمند دیوار سے اٹک جاتی تو حسن بن صباح کے جانباز رسّہ کاٹ دیتے اور اوپر سے تیر بھی برساتے تھے۔ تیروں کے جواب میں سواروں نے بھی تیر اندازی شروع کر دی۔ تیروں کے سائے میں چند ایک سپاہی اوپر چلے گئے۔ دیوار اتنی چوڑی نہیں تھی کہ اس پر لڑا جا سکتا۔ وہ اندر کود گئے۔ جانبازوں نے انہیں نرغے میں لے لیا لیکن ایک آواز نے ان کا نرغہ توڑ دیا۔

"دروازے ٹوٹ گئے ہیں" — دونوں دروازوں سے للکار اٹھ رہی تھی — "دروازوں پر آجاؤ۔ دشمن اندر نہ آجائے"۔

حسن بن صباح کے جانباز دروازوں کی طرف اٹھ دوڑے۔ امیر ارسلان کے آدمیوں نے جو اب سوار نہیں پیادے بن گئے تھے' ان جانبازوں پر تابڑ توڑ حملے کئے حالانکہ وہ قلعے کے اندر تھے اور ان کی تعداد بہت ہی تھوڑی تھی۔

باطنی جانبازوں نے باہر کے سواروں کو اندر تو نہ آنے دیا' انہوں نے جانوں کی بازی لگا دی تھی لیکن یہ بھی نظر آ رہا تھا کہ وہ زیادہ دیر اسی طرح جم کر نہیں لڑ سکیں گے۔ مؤرخ لکھتے ہیں کہ یہ چھوٹی سی لڑائی تھی جو چھوٹی سی ایک بستی میں لڑی گئی تھی لیکن اس کی اہمیت اس وجہ سے ایک بڑی لڑائی جتنی تاریخی ہے کہ یہ حسن بن صباح کے باطنی فرقے اور سلجوقی مسلمانوں کا پہلا مسلح تصادم تھا اور اسی تصادم میں اندازہ ہو گیا تھا کہ حسن بن صباح کے پاس کتنی طاقت ہے اور یہ طاقت کس قسم کی ہے۔

○

حسن بن صباح دیکھ رہا تھا کہ اس کے ستر جانباز اتنے بڑے سوار دستے کو روک نہیں سکیں گے۔ ان کی تعداد کم ہوتی جا رہی تھی۔ حسن بن صباح ایک بلند چبوترے پر چڑھ گیا اور دونوں ہاتھ آسمان کی طرف اٹھا کر اور آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے بڑی ہی بلند آواز سے کہہ رہا تھا — "تیرا ایلچی مشکل میں آگیا ہے اللہ!..... فرشتوں کو بھیج اللہ..... اپنے نام پر جانیں قربان کرنے والوں کو اتنے سخت امتحان میں نہ ڈال اللہ!..... فرشتے اُتار اللہ..... کفّار کے طوفان سے بچا اللہ!"

وہ چُپ ہو گیا اور آسمان کی طرف دیکھتا رہا۔ اُس کے سمت سے جانبازوں نے اسے دیکھا۔

"یا حسن!" — اُس کے ایک آدمی نے قریب آ کر گھبراہٹ سے کانپتی ہوئی آواز میں کہا — "اپنے فدائین دل چھوڑ بیٹھے ہیں۔ وہ باہر کو بھاگنے کا راستہ دیکھ رہے ہیں"۔

حسن بن صباح نے اس شخص کو دیکھا۔ اس کے کپڑے خون سے لال ہو گئے تھے۔

حسن بن صباح نے آنکھیں بند کر کے آسمان کی طرف دیکھا۔

"وحی نازل ہو گئی ہے" — اُس نے بلند آواز سے کہا — "اللہ کا حکم آیا ہے کوئی شخص باہر نہ نکلے۔ جو نکلے گا وہ دنیا میں بھٹکے گا اور جو ہمارے ساتھ رہے گا وہ دنیا میں فردوس بریں دیکھے گا۔ حوریں اُتر رہی ہیں۔ فرشتے اُتر رہے ہیں۔ ہمارا ساتھ چھوڑنے والوں کے لئے آگ اُتر رہی ہے..... مدد آ رہی ہے"۔

یہ "وحی" تمام جانبازوں تک پہنچا دی گئی۔ وہ فوراً" ثابت قدم ہو گئے اور جم کر لڑنے لگے۔

"ہم حسن بن صباح کے ساتھ رہیں گے" — باطنیوں نے نعرے لگانے شروع کر دیئے۔

لڑائی میں نیا ہی جوش اور قہر پیدا ہو گیا۔ امیر ارسلان کے جو آدمی کمندوں کے ذریعے اندر اُتر گئے تھے انہیں باطنیوں نے کاٹ ڈالا۔

اور آسمان سے فرشتے بھی اتر آئے۔

یہ تین سو سوار اچانک کہیں سے نکلے۔ ان کے سرپٹ ٹاپوں کی آوازیں دُور سے سنائی دی تھیں۔ امیر ارسلان کو ذرا سا بھی شبہ نہیں ہُوا تھا کہ یہ ان کے دشمن سوار ہیں۔ اسے یہ توقع بھی نہیں تھی کہ اس کے لئے کہیں سے کمک آئے گی۔ اسے کمک کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ پھر یہ بھی تو کسی کو معلوم نہیں تھا کہ امیر ارسلان کہاں ہے۔ بہرحال اُس کے ذہن میں یہ خدشہ آیا ہی نہیں کہ یہ سوار جو چلے آ رہے ہیں یہ اس کے لئے ایک مصیبت چلی آ رہی ہے جس کا وہ سامنا نہیں کر سکے گا۔ ان تین سو سواروں کی رفتار اتنی تیز تھی کہ امیر ارسلان کو کچھ سوچنے کا موقع ہی نہ ملا۔ گھنے جنگل کی ہری بھری جھاڑیوں' درختوں اور اونچی گھاس سے یہ سوار بے ترتیب سے گروہوں کی صورت میں سیلاب کی طرح چلے آ رہے تھے۔ وہ جُوں جُوں قریب آتے گئے' پھیلتے گئے۔ بعض کے ہاتھوں میں برچھیاں تھیں اور باقیوں کے پاس تلواریں تھیں۔ انہوں نے یہ ہتھیار آگے کو کر رکھے تھے جس سے صاف ظاہر ہوتا تھا کہ وہ حملہ کرنے آ رہے ہیں۔

اُس وقت بھی امیر ارسلان نے کوئی دفاعی اقدام نہ کیا۔ حتیٰ کہ وہ سوار اُن کے سر پر آگئے اور انہوں نے نعرہ لگایا ـــ "حسن بن صباح زندہ باد" ـــ اُس وقت امیر ارسلان اور اس کے سواروں کو ہوش آئی لیکن سنبھلنے اور سنبھل کر مقابلے میں آنے کا وقت گزر چکا تھا۔ ان سواروں نے امیر ارسلان کے پانچ سو سواروں کو بے بس کر دیا۔ سلجوقیوں نے مقابلے میں جمنے کی بہت کوشش کی لیکن حملہ آوروں کے انداز میں للکار اور غضب تھا کہ انہوں نے سلجوقی سواروں کو بالکل ہی بے بس کر کے کاٹ ڈالا۔ انہیں پتہ ہی نہ چلا کہ ان کا سالار امیر ارسلان مارا جا چکا ہے۔

امیر ارسلان کے سواروں میں سے چند ایک سوار نکل بھاگنے میں کامیاب ہوئے۔ یہ سب زخمی حالت میں تھے۔ ان میں مزمل آفندی بھی تھا۔ وہ بھی زخمی تھا۔ باقی زخمی اِدھر اُدھر چھپ گئے۔ ان میں بھاگنے کی بھی ہمت نہیں تھی لیکن مزمل آفندی نے گھوڑے کا رخ مَرو کی طرف کر دیا اور ایڑ لگا دی۔

○

ذہن میں قدرتی طور پر سوال اٹھتا ہے کہ کیا یہ تین سو سوار واقعی فرشتے تھے جو خدا نے حسن بن صباح کی مدد کے لئے بھیجے تھے؟ اور کیا واقعی اُس پر وحی نازل ہوئی تھی؟ نہیں..... یہ پہلے سے کیا ہوا ایک انتظام تھا، اور یہ انتظام احمد بن غطاش نے کیا تھا۔

داستان گو سارا قصہ پہلے سنا چکا ہے۔ قافلے سے نکلے ہوئے ایک سوار نے اصفہان پہنچ کر حسن بن صباح کو خبردار کر دیا تھا کہ سلجوقی سلطان نے اس کی گرفتاری کے لئے پانچ چھ سو گھوڑ سواروں کا دستہ بھیجا ہے اور یہ دستہ اصفہان کی طرف آ رہا ہے۔

احمد بن غطاش بھی حسن بن صباح کے ساتھ تھا۔ انہوں نے فیصلہ کر لیا کہ حسن بن صباح قلعہ تبریز میں چلا جائے۔ وہ چلا گیا۔ ان لوگوں کو خداوند تعالیٰ نے بڑے ہی تیز اور بہت دُور تک سوچنے والے دماغ اور بہت دُور تک دیکھنے والی نگاہیں دی تھیں۔ انہوں نے اُسی وقت سوچ لیا تھا کہ آگے کیا ہوگا۔ خطرہ یہی تھا کہ امیر ارسلان اصفہان میں آکر حسن بن صباح کو ڈھونڈے گا اور کسی نہ کسی طرح اسے پتہ چل جائے گا کہ حسن بن صباح قلعہ تبریز میں چلا گیا ہے۔

یہ بھی بیان ہو چکا ہے کہ احمد بن غطاش نے اسی مکان میں جہاں وہ اور حسن بن صباح ٹھہرے تھے، سائیس کا بہروپ دھار لیا تھا۔ یہ ایک قبیلے کے سردار کا مکان تھا اور یہ

سردار حسن بن صباح کا پیروکار باطنی تھا۔

احمد بن غطاش نے اس سردار سے کہا تھا کہ حسن بن صباح کو بچانے کے لئے زیادہ سے زیادہ ایسے سواروں کی ضرورت ہے جو شہسوار ہوں، تیغ زنی اور برچھی بازی کی مہارت رکھتے ہوں اور لڑائی میں جان کی بازی لگا دینے والے ہوں۔

یہ سردار اُسی وقت ایک گھوڑے پر سوار ہوا۔ اُس کے پیچھے ایک اور گھوڑا تھا جس کی باگ سائیس کے ہاتھ میں تھی اور سائیس پیدل چل رہا تھا۔ لوگ جو راستے میں آتے تھے، اس سردار کو جھک کر سلام کرتے تھے اور وہ سائیس کی طرف دیکھتے ہی نہیں تھے کیونکہ وہ اس سردار کا سائیس تھا۔ کسی کو ذرا سا بھی شبہ نہ ہُوا کہ یہ سائیس ابلیس کا چیلا نہیں بلکہ سرتاپا اور اندر سے بھی وہی ابلیس ہے جسے خداوند تعالیٰ نے آدم کو سجدہ نہ کرنے کی پاداش میں دھتکار دیا اور اس پر لعنت بھیجی تھی۔ اب وہ ابلیس آدم کی اولاد کے لئے بڑا ہی دلکش اور اسلام کے لئے بہت ہی خطرناک دھوکہ بنا ہُوا تھا اور اولادِ آدم اس کے تخلیق کئے ہوئے ابلیس حسن بن صباح کی ایسی مرید اور معتقد بنتی جا رہی تھی کہ اُس پر جانیں قربان کر رہی تھی۔

شہر سے کچھ دور جا کر یہ سائیس جو دراصل احمد بن غطاش تھا گھوڑے پر چڑھ بیٹھا اور پھر سردار نے اور احمد بن غطاش نے گھوڑے دوڑا دیئے۔ اصفہان سے تھوڑی ہی دور قزوین نام کا ایک قصبہ تھا۔ آج کے نقشوں میں اس نام کا کوئی مقام نہیں ملتا اس لئے یہ بتانا ناممکن ہے کہ یہ اصفہان سے کتنی دور تھا۔ تاریخ میں اس قصبے کا نام موجود ہے۔ یہ مقام ان دونوں کی منزل تھی۔

قزوین کا رئیسِ شہر ابو علی تھا جس کا اس سارے علاقے میں اثر و رسوخ تھا۔ کچھ عرصہ پہلے اس شخص نے حسن بن صباح کے ہاتھ پر بیعت کر لی تھی۔ یہ حسن بن صباح کی تربیت یافتہ ایک لڑکی کا اور اُس حشیش کا کارنامہ تھا جو یہ لڑکی اسے دھوکے میں پلاتی رہتی تھی۔ احمد بن غطاش اور اس کا ساتھی سردار ابو علی کے گھر گئے اور اسے اس صورتِ حال سے آگاہ کیا کہ سلجوقی سلطان نے حسن بن صباح کی گرفتاری کے لئے سینکڑوں سواروں کا ایک دستہ بھیجا ہے۔ اسے بتایا کہ صورتِ حال کیا بن سکتی ہے اور اس کے لئے ہمیں کیا کرنا چاہئے۔

ان تینوں نے فوراً فیصلہ کر لیا۔ ابو علی نے کہا کہ وہ جس قدر سوار مل سکے تیار کر

لے گئے۔ تاریخ میں یہ بھی آیا ہے کہ اُس نے بہت ہی تھوڑے سے وقت میں تین سو سوار تیار کر لئے اور پھر کمال یہ کیا کہ انہیں ایک جگہ اکٹھا کر لیا جو قلعہ تبریز سے کچھ دور تھی۔ ان سواروں کو بتایا گیا کہ وہ ہر لمحہ تیاری کی حالت میں رہیں اور اشارہ ملتے ہی قلعہ تبریز پہنچ جائیں۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ باطنیوں کی جڑیں کتنی مضبوط ہو کر کتنی دُور تک پہنچ گئی تھیں۔

ان کا جاسوسی کا نظام بھی بڑا تیز اور قابلِ اعتماد تھا۔ سالار امیر ارسلان کا دستہ اصفہان سے قلعہ تبریز پہنچا تو کسانوں اور تھکے ماندے مسافروں کے بہروپ میں باطنی جاسوس اسے دُور دُور سے دیکھ رہے تھے۔ انہوں نے لڑائی بھی دیکھی تھی۔ ان ہی میں سے کسی نے دیکھا کہ سلجوقی سوار قلعے میں داخل ہو جائیں گے اور اندر تمام باطنی مارے جائیں گے اور حسن بن صباح گرفتار ہو جائے گا...... اس جاسوس نے ابو علی کو جا اطلاع دی۔ تین سو سوار تیار تھے۔ انہیں پہلے ہی بتا دیا گیا تھا کہ انہوں نے کیا کرنا ہے۔ ان کے دلوں میں سلجوقیوں کی اتنی نفرت پیدا کی گئی تھی کہ وہ اس انتظار میں تھے کہ سلجوقی سامنے آئیں تو ان کے جسموں کے پرخچے اڑا دیں۔

اب انہیں موقع مل گیا۔ اشارہ ملتے ہی وہ قلعہ تبریز پہنچے اور سلجوقیوں کو بے خبری میں جا لیا۔ سلجوقی بے خبری اور غلط فہمی میں مارے گئے ورنہ سلجوقیوں نے تو جنگجوئی میں دور دور تک دھاک بٹھائی ہوئی تھی مگر دھاک حسن بن صباح کی بیٹھ گئی۔ اس کے جانبازوں اور بستی تبریز کے باشندوں کو معلوم ہی نہیں تھا کہ "آسمان سے اترنے والے تین سو گھوڑ سوار فرشتوں" کا انتظام پہلے سے کر لیا گیا تھا۔ انہیں یقین ہو گیا تھا کہ حسن بن صباح پر وحی نازل ہوئی تھی اور یہ مدد بھی حسن کے کہنے پر خدا نے بھیجی تھی۔

○

مزمل آفندی گھوڑا دوڑاتا مرو جا رہا تھا۔ اُس نے اپنے زخموں پر کپڑے کس کر باندھ لئے تھے پھر بھی زخموں سے خون رِس رہا تھا۔ وہ اس کوشش میں تھا کہ زندہ سلطان ملک شاہ تک پہنچ جائے اور ہوش میں رہے تاکہ اسے قلعہ تبریز کی لڑائی کی خبر دے سکے اور اسے کہے کہ وہ فوراً جوابی حملے کے لئے فوج بھیجے۔

یہ ایک دن اور ایک رات کی مسافت تھی جو مزمل آفندی نے کم سے کم وقت میں طے کی اور رات کو مرو پہنچا۔ سلطان ملک شاہ سو گیا تھا۔ سلطان کو جگانے کی جرأت کوئی

بھی نہیں کر سکتا تھا لیکن مزمل خون میں نہایا ہوا اور نیم جاں تھا اور وہ سالار امیر ارسلان اور اس کے سوار دستے کی خبر لایا تھا۔ سلطان کو جگا کر بتایا گیا تو وہ بستر سے کود کر اٹھا اور ملاقات والے کمرے میں گیا۔

مزمل دروازے میں داخل ہوا تو اس کا وجود گرنے والے درخت کی طرح ڈول رہا تھا اور سر کبھی دائیں کبھی بائیں ڈھلک جاتا تھا۔ اُس کے کپڑے خون سے لال ہو گئے اور زخموں سے تازہ خون رِس رہا تھا۔ سلطان دوڑ کر اُس تک پہنچا اور اسے اپنے بازوؤں میں لے لیا۔

"اسے دیوان پر لٹاؤ" ___ سلطان ملک شاہ نے دربان سے کہا اور خود ہی مزمل کو اٹھا لیا۔

دربان نے بھی مدد کی اور مزمل کو دیوان پر لٹا دیا گیا۔ سلطان کے کپڑے بھی سامنے سے لال ہو گئے۔

"اسے دو شربت پلاؤ" ___ سلطان نے دربان سے کہا ___ "طبیب کو اور جراح کو بھی فوراً ساتھ لے آؤ"۔

سلطان ملک شاہ نے شربت کا گلاس دربان کے ہاتھ سے لیا اور اُسے دوڑا دیا پھر مزمل کو سہارا دے کر اٹھایا اور اسے اپنے ہاتھ سے شربت پلایا۔

"اب لیٹ جاؤ" ___ سلطان نے مزمل آفندی کو لٹا کر پوچھا ___ "تم بہت زخمی ہو"۔

"میں انشاء اللہ زندہ رہوں گا" ___ مزمل آفندی نے بڑی مشکل سے ہانپتی کانپتی آواز میں کہا ___ "میں نے حسن بن صباح کو قتل کرنے کا عہد کر رکھا ہے..... میرا نام مزمل آفندی ہے۔ آپ کی فوج کے ساتھ میرا کوئی تعلق نہیں..... پہلے اپنے سوار دستے اور سالار امیر ارسلان کی خبر سن لیں..... امیر ارسلان مارا گیا ہے اور اپنے دستے کے شاید سارے ہی سوار بھی مارے گئے ہیں"۔

"کیا کہا؟" ___ سلطان نے حیرت زدہ ہو کر کہا ___ "ارسلان مارا گیا ہے؟..... یہ ہوا کیسے؟ یہ لڑائی کہاں لڑی گئی ہے؟"

"قلعہ تبریز میں!" ___ مزمل آفندی نے جواب دیا۔

طبیب اور جراح دوڑے آئے۔ سلطان کے کہنے پر انہوں نے مزمل کے زخموں کو

دھونا شروع کر دیا۔ سلطان نے مزمل کے لئے پھل اور میوے منگوائے' پھر زخموں کی مرہم پٹی ہوتی رہی' مزمل پھل اور میوے کھاتا رہا اور سلطان کو سناتا رہا کہ وہ کس طرح میمونہ کو حسن بن صباح کی قید سے فرار کرا کے لایا تھا اور رے میں ابو مسلم رازی کے ہاں میمونہ کو اپنی بیٹی شمونہ مل گئی تھی۔ پھر اس نے حسن بن صباح کے تعاقب کا اور قلعہ تبریز کی لڑائی کا مکمل احوال سنا دیا۔

سلطان ملک شاہ آگ بگولہ ہو گیا۔ اُس نے اُسی وقت اپنے ایک سالار قزل سارو ق کو بلایا۔ یہ سالار تُرک تھا۔ ابن اثیر نے لکھا ہے کہ قزل سارو ق نامور سالار اور مشہور سلجوقی جنگجو تھا۔ سلطان نے اسے کہا کہ وہ کم از کم ایک ہزار سواروں کا دستہ لے کر ابھی قلعہ تبریز کو روانہ ہو جائے۔

قزل سارو ق سمجھ گیا کہ بہت جلدی تبریز پہنچنا ہے۔

وہ ایک ہزار منتخب سواروں کے ساتھ حیران کُن کم وقت میں قلعہ تبریز پہنچ گیا لیکن وہاں سالار امیر ارسلان اور اس کے سواروں کی لاشوں کے سوا کچھ بھی نہ ملا۔ کسی بھی لاش کے ساتھ ہتھیار نہیں تھا۔ ایک بھی گھوڑا نہیں تھا۔ ہتھیار بھی اور گھوڑے بھی باطنی لے گئے تھے۔

قزل سارو ق قلعے کے اندر گیا۔ کوئی ایک بھی انسان نظر نہ آیا۔ مکان خالی پڑے تھے۔

"آگ لگا دو" — قزل سارو ق نے کہا۔

کچھ ہی دیر بعد مکانوں سے شعلے اٹھنے لگے اور دھواں آسمان تک پہنچنے لگا۔

"قبریں کھودو اور اپنے ساتھیوں کو دفن کر دو" — قزل سارو ق نے اپنے سواروں سے کہا — "ہم یہاں شاید اسی لئے آئے ہیں کہ اپنے ساتھیوں کو دفن کریں اور اس بستی کو آگ لگا دیں اور واپس چلے چلیں..... ہم یہاں کچھ دن ٹھہریں گے"۔

داستان گو

جس دَور کی داستان سنا رہا ہے وہ ابلیس کا دَور تھا۔ قرآن حکیم کی وہ پیش گوئی جو سورۃ الاعراف کی آیات 11 سے 23 تک واضح الفاظ میں آئی ہے' حرف بہ حرف صحیح ثابت ہو رہی تھی۔ ان آیات کا مفہوم یہ ہے کہ خداوند تعالیٰ نے ابلیس کو سجدہ نہ کرنے کی پاداش میں دھتکار دیا اور اُسے کہا تو ذلیل و خوار ہوتا رہے گا تو ابلیس نے کہا کہ مجھے روزِ قیامت تک مہلت دے۔ اللہ نے اسے مہلت دے دی۔ ابلیس نے کہا اب دیکھنا میں تیرے ان انسانوں کو کس طرح گمراہی میں ڈالتا ہوں۔ میں تیرے سیدھے راستے پر گھات لگا کر بیٹھوں گا اور تیرے انسانوں کو آگے سے' پیچھے سے' دائیں سے' بائیں سے اور ہر طرف سے گھیروں گا پھر تو دیکھے گا کہ اُن میں سے بہت سے تمہارے شکر گزار نہیں رہیں گے۔

اللہ تعالیٰ نے آدم اور حوّا سے کہا کہ جنت میں رہو لیکن اُس درخت کے قریب نہ جانا ورنہ گنہگاروں میں لکھے جاؤ گے۔ شیطان نے آدم سے کہا کہ اللہ نے اس درخت کو تمہارے لئے اس لئے شجرِ ممنوعہ قرار دیا ہے کہ تم فرشتے نہ بن جاؤ اور تمہیں وہ زندگی نہ مل جائے جس کی موت ہوتی ہی نہیں یعنی کبھی نہ ختم ہونے والی زندگی..... ابلیس نے قسم کھا کر کہا کہ میں تمہارا سچا خیر خواہ ہوں۔

ابلیس نے زبان کا ایسا جادو چلایا اور الفاظ کا ایسا طلسم پیدا کیا کہ آدم اور حوّا کو شیشے میں اتار لیا۔ انہوں نے شجرِ ممنوعہ کا پھل چکھا اور اس حکم عدولی کے نتیجے میں آدم اور حوّا کے ستر بے نقاب ہو گئے اور وہ درختوں کے پتوں سے ستر ڈھانپنے لگے۔

بات یہ سامنے آئی کہ یہ ابلیس تھا جس نے آدم اور حوّا کو ایک دوسرے کی شرمگاہوں سے روشناس کیا۔ انسان میں تجسس کی بیتابی پیدا آئی اور یہ جذبہ بھی کہ اللہ

جس کام سے منع کرے وہ ضرور کر کے دیکھو اور شجرِ ممنوعہ کا پھل ضرور چکھو۔

حسن بن صباح نے یہی ابلیسی حربے استعمال کئے اور انسان کی ستر پوشی کو برہنگی میں بدل دیا۔ مرد پر عورت کی برہنگی کا طلسم طاری کیا اور یہ تاثر پیدا کیا کہ شجرِ ممنوعہ کا پھل ضرور کھاؤ۔

ابلیس اپنا یہ عہد پورا کر رہا تھا کہ اللہ کے سیدھے راستے پر گھات لگا کر بیٹھوں گا اور اللہ کے بندوں کو ہر طرف سے گھیر کر اپنے راستے پر چلاؤں گا۔

پانچویں صدی ہجری میں حسن بن صباح اللہ کے سیدھے راستے پر گھات لگا کر اور اللہ کے بندوں کو ہر طرف سے گھیر کر اپنے راستے پر چلا رہا تھا۔

○

قلعہ تبریز کی لڑائی میں سلجوقی سالار امیر ارسلان مارا گیا' اُس کے پانچ سو مجاہدین ہلاک یا زخمی ہو گئے تو مزمل آفندی نے شدید زخمی حالت میں مرو پہنچ کر سلطان ملک شاہ کو لڑائی کے اس انجام کی اطلاع دی۔ اُس کا زندہ رہنا معجزہ تھا۔

جب سے مزمل آفندی سالار امیر ارسلان اور اُس کے پانچ سو سواروں کے ساتھ چلا گیا تھا' رے میں شمونہ نے روز مرہ کا معمول بنا لیا تھا کہ بار بار چھت پر چلی جاتی اور اُس راستے کو دیکھنے لگتی جس راستے پر مزمل آفندی چلا گیا تھا۔ شمونہ کو معلوم تھا کہ دو چار دنوں میں اُدھر سے کوئی اطلاع نہیں آئے گی۔ بغداد سے اتنی جلدی اطلاع آ ہی نہیں سکتی تھی لیکن شمونہ مزمل آفندی کی محبت میں پاگل ہوئی جا رہی تھی۔ وہ حقائق کو تو قبول ہی نہیں کر رہی تھی۔ وہ چھت پر جا کر کبھی بالائی منزل کا اُس طرف والا دریچہ کھول کر اس راستے کو دیکھنے لگتی تھی۔ اُسے قاصد کا انتظار تھا۔

اور اسے انتظار تھا کہ مزمل آفندی اسی راستے سے واپس آئے گا۔ اُس کے چہرے پر فاتحانہ تاثر ہو گا۔ سینہ پھیلا ہوا اور گردن تنی ہوئی ہو گی' اور حسن بن صباح اس کے ساتھ ہو گا...... زندہ یا مُردہ!

دنوں پہ دن گزرتے جا رہے تھے۔ نہ جانے کتنی راتیں بیت گئیں' مزمل آفندی نہ آیا۔ مرو سے کوئی قاصد نہ آیا۔

"شمونہ!" — دو تین بار اُس کی ماں میمونہ نے اُسے کہا — "ایک آدمی کی محبت میں گرفتار ہو کر تم دنیا کو بھول گئی ہو۔ تمہیں دن اور رات کا ہوش نہیں رہا۔ یوں تو

زندگی اجیرن ہو جاتی ہے"۔

"میں صرف اُس کا انتظار نہیں کر رہی جسے میں چاہتی ہوں" — شمونہ نے ماں سے کہا تھا — "میں حسن بن صباح کے انتظار میں ہوں۔ اگر وہ زندہ آیا تو میں اُسے زنجیروں میں بندھا دیکھنا چاہوں گی اور اگر اُس کی لاش آئی تو میں سمجھوں گی کہ میرا زندگی کا مقصد پورا ہو گیا ہے۔ مزمل اسے زندہ یا مُردہ لے ہی آئے گا"۔

شمونہ کو کوئی قاصد یا مزمل آفندی آتا نظر نہیں آتا تھا۔ راستہ ہر روز کی طرح شہر سے نکل کر درختوں اور کھیتوں میں بل کھاتا گزر ایک پہاڑی میں گم ہو جاتا تھا۔ اسے ہر روز ویسے ہی اونٹ' گھوڑے' بوجھ اٹھائے ہوئے ٹٹو اور پیدل چلتے ہوئے لوگ نظر آتے تھے۔ شمونہ کی بے چینی اور بے تابی بڑھتی جا رہی تھی اور وہ اکتانے بھی لگی تھی۔ اُس کی مزاجی کیفیت بھی کچھ اکھڑی سی گئی تھی۔ آخر ایک روز دن کے پچھلے پہر دُور سے ایک گھوڑ سوار آتا نظر آیا۔ گھوڑے کی رفتار اور انداز بتاتا تھا کہ وہ کوئی عام سا مسافر نہیں۔ شمونہ کی نظریں اُس پر جم گئیں اور اُس کے ساتھ ساتھ شہر کی طرف آنے لگیں۔

گھوڑ سوار شہر میں داخل ہُوا تو شمونہ کی نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ وہ شہر کی گلیوں میں گم ہو گیا تھا۔ کچھ دیر بعد وہ امیرِ شہر ابو مسلم رازی کے گھر کے قریب ایک گلی سے نکلا۔ شمونہ دوڑتی نیچے آئی۔ گھوڑ سوار اس شاہانہ حویلی کے احاطے میں داخل ہو رہا تھا۔

"تم قاصد تو نہیں ہو!" — شمونہ نے اس سے پوچھا۔

"ہاں بی بی!" — سوار نے گھوڑے سے اترتے ہوئے کہا — "میں قاصد ہوں۔ امیرِ شہر سے فوراً ملنا ہے"۔

"کہاں سے آئے ہو؟"

"مرو سے آیا ہوں"۔

"سالار امیر ارسلان اور مزمل آفندی کی کوئی خبر لائے ہو؟" — شمونہ نے بچوں کے سے بے تابانہ اشتیاق سے پوچھا۔

"اُن ہی کی خبر لایا ہوں"۔

"کیا خبر ہے؟" — شمونہ نے تڑپ کر پوچھا۔

"امیرِ شہر کے سوا کسی اور کو بتانے والی خبر نہیں" — قاصد نے جواب دیا۔

شمونہ دوڑتی اندر گئی۔ دربان کے روکنے پر بھی نہ رکی۔ ابو مسلم رازی اپنے کسی کام میں مصروف تھا۔ شمونہ نے ایسی زور سے دروازہ کھولا کہ ابو مسلم رازی چونک اٹھا۔

"مرو سے قاصد آیا ہے" ۔۔۔ شمونہ نے بڑی تیزی سے کہا ۔۔۔ "اُسے فوراً بلا لیں"۔

ابو مسلم رازی نے ابھی کچھ جواب نہیں دیا تھا کہ شمونہ باہر کو دوڑ پڑی اور قاصد کو ابو مسلم رازی کے پاس لے گئی۔

"کیا خبر لائے ہو؟" ۔۔۔ ابو مسلم رازی نے پوچھا۔

قاصد نے شمونہ کی طرف دیکھا اور پھر ابو مسلم رازی کی طرف دیکھا۔ بات بالکل صاف تھی۔ قاصد شمونہ کے سامنے پیغام نہیں دینا چاہتا تھا۔

"تم ذرا باہر چلی جاؤ شمونہ!" ۔۔۔ ابو مسلم رازی نے کہا۔

شمونہ وہاں سے ہلی بھی نہیں اور کچھ بولی بھی نہیں۔ اس کی نظریں ابو مسلم رازی کے چہرے پر جم گئی تھیں اور اُس کے اپنے چہرے کا تاثر یکلخت بدل گیا تھا۔ رازی کی دانشمندی نے راز پالیا۔ وہ شمونہ کی اس بات کو سمجھتا تھا۔ اس لڑکی نے ابو مسلم رازی کے دل میں اپنی قدر و منزلت پیدا کرلی تھی۔

"ہاں!" ۔۔۔ ابو مسلم رازی نے قاصد سے پوچھا ۔۔۔ "کیا خبر لائے ہو"۔

"خبر اچھی نہیں امیرِ شہر!" ۔۔۔ قاصد نے کہا ۔۔۔ "سالار امیر ارسلان مارے گئے ہیں اور ان کے پانچسو سواروں میں سے شاید ہی کوئی زندہ بچا ہو"۔

"مزمل آفندی کی کیا خبر ہے؟" ۔۔۔ شمونہ نے تیزی سے اٹھ کر پوچھا۔

"خاموش رہو شمونہ!" ۔۔۔ ابو مسلم رازی نے اُسے ڈانٹتے ہوئے کہا ۔۔۔ "میں تمہیں باہر بھیج دوں گا۔ تم ایک آدمی کا غم لئے بیٹھی ہو اور ہم اس سلطنت اور دینِ اسلام کے لئے پریشان ہو رہے ہیں" ۔۔۔ اُس نے قاصد سے کہا ۔۔۔ "آگے بولو"۔

"مزمل آفندی زندہ ہیں" ۔۔۔ قاصد نے کہا ۔۔۔ "لیکن بہت بری طرح زخمی ہیں۔ وہ مرو میں سلطانِ عالی مقام کے پاس ہیں۔ وہی آگے کی خبر لائے تھے"۔

قاصد نے ابو مسلم رازی کو تفصیل سے وہ خبر سنائی جو مزمل آفندی نے سلطان ملک شاہ کو سنائی تھی۔ پھر اُس نے یہ بتایا کہ اب سلطانِ مکرم نے سالار قزل ساروق کو ایک ہزار سوار دے کر حسن بن صباح کی گرفتاری اور اُس کے پیروکاروں کی تباہی کے لئے بھیج

رہا ہے"۔

قاصد پیغام دے چکا تو ابو مسلم رازی نے اُسے جانے کی اجازت دے دی۔

"میں مرو جانا چاہتی ہوں" ۔۔۔ شمونہ نے کہا ۔۔۔ "آپ مجھے اسی قاصد کے ساتھ بھیج دیں"۔

"تم وہاں جا کر کیا کرو گی؟" ۔۔۔ ابو مسلم رازی نے پوچھا۔

"میں مزمل آفندی کی تیمارداری کروں گی" ۔۔۔ شمونہ نے جواب دیا ۔۔۔ "اس شخص نے مجھ پر جو احسان کیا ہے کیا میں یہ بھول سکتی ہوں؟ اس نے مجھے بچھڑی ہوئی ماں سے ملایا ہے ..... اور امیرِ شہر! میں نے اور مزمل آفندی نے عہد کیا ہے اور قسم کھائی ہے کہ حسن بن صباح کو ہم دونوں قتل کریں گے۔ اس مقصد کے لئے میں مزمل کے ساتھ رہنا چاہتی ہوں"۔

"ایسے کام جذبات کے جوش سے نہیں ہوا کرتے شمونہ!" ۔۔۔ ابو مسلم رازی نے کہا ۔۔۔ "اس کے لئے تجربے کی اور دور اندیشی سے ہر پہلو پر غور کرنے کی ضرورت ہے۔ تم میرے ساتھ رہو۔ تمہاری ماں یہیں ہے۔ میرا بھی یہی مقصد ہے۔ حسن بن صباح جب یہاں آیا تھا تو میں نے اس کی گرفتاری کا حکم دے دیا تھا لیکن اسے قبل از وقت پتہ چل گیا اور وہ فرار ہو گیا۔ میں نے بھی حسن بن صباح کے قتل کو اپنی زندگی کا مقصد بنا رکھا ہے۔ پھر اس لئے بھی میں تمہیں وہاں نہیں بھیج سکتا کہ مزمل آفندی سلطان کے پاس ہے۔ میری بات اور ہے' سلطان کے ہاں فضا اور ماحول کچھ اور ہے۔ انہوں نے مزمل آفندی کو اپنی نگرانی میں رکھا ہو گا اور وہ پریشان بھی ہوں گے کہ امیر ارسلان جیسا سالار اپنے تمام سواروں کے ساتھ مارا گیا ہے۔ یہ پریشانی اب مجھے بھی لاحق ہو گئی ہے کہ حسن بن صباح کے پاس اتنی فوجی طاقت اکٹھی ہو گئی ہے کہ اُس نے پانچ سو سلجوقی سواروں کو ختم کر دیا ہے۔ کسی کو سلجوقی کہنے کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ وہ جان کی بازی لگا دینے والا جنگجو ہے اور ناقابلِ تسخیر۔ میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ حسن بن صباح کے پیروکار سلجوقیوں سے زیادہ سرفروش ہیں..... تم یہیں رہو۔ ہو سکتا ہے سلطان تمہارا وہاں جانا پسند نہ کریں' اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ تمہیں اس بنا پر شک کی نظروں سے دیکھیں کہ تم نے حسن بن صباح کے زیرِ سایہ تربیت حاصل کی ہے"۔

ابو مسلم رازی نے شمونہ کی ماں کو بلایا اور اسے کہا کہ وہ اپنی بیٹی کے جذبات کو اپنے

قابو میں لے لے ورنہ یہ جذبات سے مغلوب ہو کر کوئی اُلٹی سیدھی حرکت کر بیٹھے گی۔

○

سالار قزل سارق نے تبریز کی قلعہ نما بستی کو نذرِ آتش تو کر دیا لیکن وہ اس بستی کو نذرِ آتش کرنے کے لئے نہیں گیا تھا۔ یہ تو غصے کا اظہار تھا جو اُس نے کیا۔ اصل مسئلہ یہ تھا کہ حسن بن صباح اور اس کے جنگجو پیروکار کہاں گئے۔ اُس نے جو لاشیں دیکھی تھیں ان میں سالار امیر ارسلان کے سواروں کی لاشیں زیادہ تھیں اور حسن بن صباح کے آدمیوں کی لاشیں بہت ہی تھوڑی تھیں۔

سالار قزل سارق کے ساتھ جاسوسی کرنے والے آدمی بھی تھے۔ بھیس اور حلیہ بدلنے کا بھی ان کے پاس انتظام تھا۔ قزل سارق نے اپنے چار آدمیوں کو جاسوسی کے لئے تیار کیا اور انہیں ضروری ہدایات دے کر اِدھر اُدھر بھیج دیا۔ اُس نے خود ذرا سا بھی آرام نہ کیا۔ اپنے دو تین ماتحت کمانداروں کو ساتھ لے کر تبریز سے کچھ دُور زمین کو کھوجنے کے لئے چلا گیا۔ اُس نے ہر طرف زمین دیکھی۔ حسن بن صباح اکیلا ہی تو نہیں تھا کہ اُس کا کھرا کھوج نہ ملتا۔ اُس کے ساتھ بہت سے لوگ تھے جن میں گھوڑ سوار بھی تھے۔

ایک جگہ مل ہی گئی۔ زمین گواہی دے رہی تھی کہ یہاں سے ایک قافلہ یا لشکر گزرا ہے۔ قزل سارق زمین کے یہ نشان دیکھتا ہوا آگے ہی آگے چلتا گیا۔ یہ کوئی عام راستہ نہیں تھا۔ یہ لوگ اونچی نیچی زمین پر چلتے گئے۔ آگے ایک ندی تھی۔ وہ اس ندی میں سے بھی گزرے تھے۔ اگر یہ کوئی پُرامن لوگوں کا قافلہ ہوتا تو کسی باقاعدہ پگڈنڈی پر جا رہا ہوتا یا ہموار زمین پر چلتا۔ یہ قافلے لوٹنے والے ڈاکوؤں کا گروہ بھی ہو سکتا تھا اور یہ حسن بن صباح کا گروہ بھی ہو سکتا تھا۔

زمین کے ان نشانات سے تو صاف پتہ چل رہا تھا کہ وہ کس سمت کو جا رہے ہیں لیکن اصل بات تو یہ معلوم کرنی تھی کہ وہ گئے کہاں۔ آگے ایسا پہاڑی سلسلہ شروع ہو جاتا تھا جس کے اندر کسی آبادی کا گماں نہیں کیا جا سکتا تھا۔

سالار قزل سارق ایک جگہ رُک گیا۔ اس کا آگے جانا ٹھیک نہیں تھا کیونکہ وہ دُور سے پہچانا جاتا تھا کہ یہ کسی شہر کا امیر یا فوج کا سالار ہے۔ اُس نے اپنے ماتحتوں سے کہا کہ اس طرف اپنا کوئی آدمی بھیس بدل کر جائے تو کچھ سراغ مل سکتا ہے۔ ایک ماتحت نے

نے کہا کہ تبریز واپس چل کر ایک اور آدمی کو اس سمت میں روانہ کر دیتے ہیں۔

وہ واپس تبریز آ گئے۔

بہت دیر بعد ایک شتر سوار آتا نظر آیا۔ وہ بڑی تیز رفتار سے آ رہا تھا۔ قریب آیا تو وہ ان کا ایک جاسوس نکلا جسے علی الصبح بھیجا گیا تھا۔ وہ اونٹ سے اُترا اور اپنے سالار کے پاس گیا۔

"سراغ مل گیا ہے" ـــــ جاسوس نے کہا ـــــ "میں نے گھوڑوں، اونٹوں اور آدمیوں کے پاؤں کے نشان دیکھے اور ان پر چلتا گیا۔ یہ نشان مجھے ایک جگہ لے گئے جہاں تین مکان تھے جن کے مکینوں کے بچے مکانوں سے کچھ دُور کھیل رہے تھے۔ میں اونٹ سے اُترا اور ان بچوں سے پوچھا کہ ادھر ایک قافلہ گیا ہے۔ میں اس قافلے سے بچھڑ گیا تھا کیا تم بتا سکتے ہو کہ وہ قافلہ کدھر گیا ہے۔ بچوں نے مجھے صرف سمت بتائی"۔

اس جاسوس نے اپنے سالار کو جو تفصیل بتائی وہ یوں تھی کہ جب یہ شخص بچوں سے پوچھ رہا تھا اُس وقت ان مکانوں کے رہنے والے کسی آدمی نے دیکھ لیا اور اس کے پاس آ کر پوچھا کہ وہ کون ہے اور کیا چاہتا ہے۔ اُس نے وہی بات کہی جو وہ بچوں سے کہہ چکا تھا کہ وہ اس قافلے سے بچھڑ گیا تھا۔

"وہ ایک عجیب قافلہ تھا" ـــــ اُس آدمی نے کہا ـــــ "اس میں بہت سے آدمی تھے جو زخمی تھے۔ ان کے کپڑے خون سے لال تھے۔ ان میں کچھ گھوڑوں پر سوار تھے اور کچھ اونٹوں پر اور چند ایک پیدل بھی چلے جا رہے تھے۔ ہمیں تو وہ قافلوں کو لوٹنے والے ڈاکو لگتے تھے۔ ان کے ساتھ جو اونٹ تھے ان میں سے دو اونٹوں پر پالکیاں تھیں۔ دونوں میں ایک ایک یا شاید دو دو عورتیں تھیں۔ ہمیں شک ہے کہ وہ ڈاکو تھے۔ انہوں نے کسی قافلے کو لوٹنے کی کوشش کی ہو گی اور قافلے والوں نے مقابلہ کر کے انہیں مار بھگایا ہو گا"۔

"تم ٹھیک کہہ رہے ہو میرے دوست!" ـــــ جاسوس نے کہا ـــــ "وہ ڈاکوؤں کا ہی گروہ ہے۔ انہوں نے ایک قافلے پر حملہ کیا تھا لیکن ناکام رہے کیونکہ قافلے میں لڑنے والے بہت سے آدمی تھے۔ انہوں نے ان ڈاکوؤں کے کئی ایک آدمی مار ڈالے اور باقی بھاگ آئے۔ میں سلجوقی فوج کا آدمی ہوں اور اس قافلے کا سراغ لیتا پھر رہا ہوں۔ اگر تم بتا سکو کہ یہ لوگ آگے کہاں گئے ہیں تو تمہیں سلطان کی طرف سے جھولی بھر کر انعام

ملے گا"۔

"میں یہ تو نہیں بتا سکتا کہ وہ کہاں گئے ہیں' میں صرف یہ بتا سکتا ہوں کہ اس پہاڑی علاقے کے اندر پرانے زمانے کا ایک چھوٹا سا قلعہ ہے جو دراصل قلعے کے کھنڈرات ہیں۔ ہو سکتا ہے وہ اس قلعے میں گئے ہوں۔ ان پہاڑیوں کے اندر کوئی اور آبادی نہیں۔ بڑے بڑے غار ہیں جہاں صرف ڈاکو ہی جا سکتے ہیں' کسی اور نے وہاں جا کر کیا کرنا ہے"۔

قزل سارق کا جاسوس وہیں سے واپس آگیا اور اپنے سالار کو بتایا۔

اس جاسوس کو یہ معلوم نہیں تھا کہ وہ جب وہاں سے قافلے کا سراغ لے کر آیا تھا تو پیچھے کیا ہُوا تھا۔ ہُوا یہ تھا کہ جب جاسوس وہاں سے چلا تو ایک بوڑھا آدمی مکان سے نکلا اور اس نے اپنے اس آدمی کو بلایا اور پوچھا کہ یہ شتر سوار کون تھا اور کیا کہتا تھا۔ اس نے اس بوڑھے کو بتا دیا کہ وہ کیا پوچھ رہا تھا اور اس نے کیا بتایا تھا۔

"بیوقوف آدمی!" ——بوڑھے نے کہا——"جانتے ہو تم نے کیا کیا ہے؟"

"یہ سلطان کی فوج کا آدمی تھا" ——اُس آدمی نے کہا——"وہ ڈاکوؤں کے اس گروہ کی تلاش میں تھا۔ میں جو جانتا تھا وہ اسے بتا دیا ہے۔ اگر سلطان کی فوج نے ان ڈاکوؤں کو پکڑ لیا تو مجھے انعام ملے گا"۔

"تمہیں انعام بعد میں ملے گا" ——بوڑھے نے کہا——"لیکن انعام لینے کے لئے نہ تم زندہ رہو گے نہ ہم میں سے کوئی زندہ رہے گا۔ تم نے ہم سے پوچھ کر بات کرنی تھی۔ تم نے جس کی نشاندہی کی ہے وہ حسن بن صباح تھا۔ کیا تم نہیں جانتے حسن بن صباح کون ہے؟"

"ہاں!" ——اُس نے کہا——"وہ آسمان سے اُترا ہے اور خدا نے اسے اپنا ایلچی بنا کر بھیجا ہے"۔

"وہ خدا کے بندوں کو سیدھا راستہ دکھانے آیا ہے" ——بوڑھے نے کہا——"اس کے مقابلے میں کتنا ہی بڑا لشکر آ جائے وہ تباہ و برباد ہو جاتا ہے۔ آسمان سے معلوم نہیں جنات اُترتے ہیں یا قہر برسانے والے فرشتے آ جاتے ہیں جو لشکر کو کاٹ کر پھینک جاتے ہیں۔ کیا تم نے تبریز کی لڑائی نہیں سنی؟ ابھی چند دن ہی تو گزرے ہیں۔ سلطان کا پورے کا پورا لشکر اپنے ہی خون میں ڈوب گیا ہے"۔

"ہاں سنا تھا" ——اُس نے کہا۔

مکانوں سے ایک اور آدمی نکل آیا۔ بوڑھے نے اُسے بتایا کہ اس نے سلطان کے ایک جاسوس کو بتا دیا ہے کہ حسن بن صباح ادھر چلا گیا ہے۔

"یہ تو نیم پاگل ہے" ——دوسرے آدمی نے کہا۔

"یہ تو میں جانتا ہوں" ——بوڑھے نے کہا——"لیکن سوچنے والی بات یہ ہے کہ سلطان نے حسن بن صباح کے پیچھے فوج بھیج دی تو کیا ہم نہ مارے جائیں گے؟..... سوچو ہم کیا کریں!"

وہ حسن بن صباح ہی تھا جو تبریز سے اپنے تمام پیروکاروں کو اور ابو علی کے قزوین سے بھیجے ہوئے تین سو سواروں کو اپنے ساتھ لے کر یہاں سے گزرا تھا۔ ان مکانوں کے قریب آیا تو تمام مکین باہر آکر راستے میں کھڑے ہو گئے تھے۔ حسن بن صباح نے انہیں دیکھا۔ اپنے دو مصاحبوں سے کہا کہ ان لوگوں سے کہہ دو کہ کسی کو پتہ نہ چلنے دیں کہ ہم ادھر سے گزرے ہیں۔ اگر انہوں نے کسی کو بتایا تو ان کے بچے سے بوڑھے تک کو قتل کر دیا جائے گا اور ان کے مکانوں کو آگ لگا دی جائے گی۔

اب ان کے لئے یہ صورت پیدا ہو گئی تھی کہ ان کے ایک آدمی نے جسے وہ نیم پاگل کہہ رہے تھے' ایک جاسوس کو بتا دیا تھا کہ وہ لوگ آگے گئے ہیں اور یہ بھی بتا دیا تھا کہ ان پہاڑیوں کے اندر ایک قدیم قلعے کے کھنڈرات ہیں اور ہو سکتا ہے کہ وہ اسی قلعے میں گئے ہوں۔

○

دوسرے جاسوس کسی اور طرف چلے گئے تھے۔ ان کی واپسی کے انتظار میں پوری رات گزر گئی۔ وہ اگلے روز یکے بعد دیگرے آئے تو آدھا دن گزر چکا تھا۔ ان سب نے یہی خبر دی کہ حسن بن صباح ان پہاڑیوں کے اندر گیا ہے۔ اس طرح تصدیق ہو گئی کہ اس وقت اُن کا شکار کہاں ہے۔ تبریز سے اُس جگہ کا فاصلہ کم و بیش چالیس میل بتایا گیا تھا۔

آدھا دن گزر چکا تھا جب قزل سارق نے اپنے ایک ہزار سواروں کے لشکر کو کُوچ کا حکم دیا۔

لشکر انہی مکانوں کے قریب سے گزرا۔ ایک جاسوس نے راستہ معلوم کر لیا تھا۔ لشکر پہاڑی علاقے میں داخل ہو گیا۔ آگے راستہ بہت ہی دشوار تھا اس لئے لشکر کی رفتار

بہت ہی سُست رہی۔ ابھی پندرہ سولہ میل بھی طے نہیں ہوئے تھے کہ سورج غروب ہو گیا۔ چونکہ علاقہ پہاڑی اور جنگلاتی تھا اس لئے شام بہت جلدی گہری ہو گئی پھر بھی قزل ساروق نے سفر جاری رکھا۔ آگے راستہ دشوار ہوتا چلا گیا۔ یہ راستہ پہاڑی کے ساتھ ساتھ بل کھاتا جا رہا تھا۔ رات بالکل تاریک تھی پھر بھی سالار نے لشکر کو نہ روکا۔

ابھی تھوڑا ہی اور آگے گئے ہوں گے بشکر میں شور سا سنائی دیا۔ ایک گھوڑا بڑی زور سے ہنہنایا۔ دو تین آوازیں سنائی دیں کہ ایک سوار کا گھوڑا پھسل کر نیچے چلا گیا ہے۔ اس جگہ راستہ تنگ تھا۔ ایک طرف پہاڑی اور دوسری طرف وادی کی گہرائی تھی۔ اس طرف پہاڑ کی ڈھلان تقریباً عمودی تھی۔ پہاڑ پر درخت تو تھے لیکن اتنے زیادہ نہیں تھے جو گھوڑے یا سوار کو روک لیتے۔ کچھ دیر تک گھوڑے کے گرنے اور لڑھکتے ہوئے نیچے جانے کی آوازیں سنائی دیتی رہیں۔

قزل ساروق نے لشکر کو روک لیا۔ اُس کے کہنے پر اُس سوار کو آوازیں دی گئیں جو گر پڑا تھا۔ اُس کی طرف سے کوئی جواب نہ آیا۔ وہ بے ہوش ہو گیا یا مر گیا تھا۔

سالار قزل ساروق نے یہ کہہ کر کوچ کا حکم دے دیا کہ ایک سوار کے لئے پورے لشکر کی پیش قدمی نہیں روکی جا سکتی۔

سوار اور زیادہ محتاط ہو کر چلنے لگے۔ وہ چار اور موڑ مڑے تو راستہ نیچے کو جانے لگا۔ آخر وہ اُس پہاڑ سے اُترے تو آگے خاصی چوڑی وادی تھی جہاں قزل ساروق نے سواروں کو صبح تک کے لئے روک لیا۔ سواروں نے گھوڑوں کی زینیں اتاریں اور باقی رات آرام کرنے کے لئے بوھر اُدھر لیٹ گئے۔

صبح طلوع ہوئی تو کوچ کی تیاری کا حکم ملا۔ سوار گھوڑوں پر زینیں کس رہے تھے کہ ایک طرف سے ایک ادھیڑ عمر آدمی ایک عورت کے ساتھ آتا نظر آیا۔ اُن کے ساتھ دو لڑکے تھے جن میں سے ایک چودہ پندرہ سال کا اور دوسرا گیارہ بارہ سال کا تھا۔ آدمی نے ایک ٹٹو کی باگ پکڑ رکھی تھی اور ٹٹو پر کچھ سامان لدا ہُوا تھا۔ اُنہوں نے وہیں سے گزرنا تھا جہاں لشکر کوچ کے لئے تیار ہو رہا تھا۔ وہ ایک طرف سے گزرتے گئے۔ سالار قزل ساروق لشکر سے تھوڑا پرے تھا۔ وہ خود تیار ہو چکا تھا۔ اُس کا سائیس اُس کے گھوڑے کو تیار کر رہا تھا۔

کچھ دیر بعد اُس کے تین چار ماتحت کماندار اُس کے پاس آ گئے۔ وہ بالکل تیار ہو کر

آئے تھے۔

"یہ کون ہے؟" — قزل ساروق نے ادھیڑ عمر آدمی اور عورت کو دیکھ کر پوچھا۔

"ہم نے پوچھا نہیں" — ایک کماندار نے جواب دیا۔

"ان سے پوچھو" — قزل ساروق نے کہا — "ان کے ادھر سے گزرنے کا مطلب ہے کہ آگے یا اس علاقے میں کہیں کوئی آبادی ہے۔ اگر یہ یہاں کے رہنے والے ہیں تو انہیں معلوم ہو گا کہ وہ قدیم قلعہ کہاں ہے۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ ہم غلط راستے پر جا رہے ہوں"۔

وہ لوگ قریب آئے تو اُنہیں روک لیا گیا۔

"السلام علیکم" — ادھیڑ عمر آدمی نے کہا — "آپ اس لشکر کے سالار معلوم ہوتے ہیں۔ آپ نہ روکتے تو بھی میں نے رُکنا تھا"۔

"آپ کہیں سے آ رہے ہیں یا کہیں جا رہے ہیں!" — قزل ساروق نے پوچھا۔

"ہم آ رہے ہیں سالارِ محترم!" — اُس نے جواب دیا — "ہم تقریباً ایک سال بعد واپس اپنے گھر آ رہے ہیں۔ الحمد للہ ہم فریضۂ حج ادا کرنے گئے تھے"۔

"کیا آپ پیدل ہی گئے تھے؟"

"پیدل بھی سمجھیں اور سوار بھی سمجھیں" — اس نے جواب دیا — "یہ ایک ٹٹو ساتھ تھا۔ باری باری اسی پر سوار ہوتے گئے۔ کہیں سب کو کرائے کی سواری مل گئی اور یوں ارضِ حجاز تک پہنچے، مقاماتِ مقدسہ کی زیارت کی، فریضۂ حج ادا کیا اور پھر جنگوں کے وہ میدان دیکھے جہاں رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کفار سے لڑے تھے۔ بدر کا میدان دیکھا، اُحد کا میدان دیکھا اور پھر اُس جگہ کو سجدے میں جا کر چُوما جہاں ہمارے رسول زخمی ہو کر گرے تھے ..... خدا کی قسم، وہاں سے واپس آنے کو جی نہیں چاہتا تھا لیکن پیچھے بوڑھے ماں باپ کو نوکروں کے سپرد کر گئے تھے۔ ان کی خاطر واپس آ گئے ہیں"۔

"اللہ آپ کا حج قبول فرمائے" — قزل ساروق نے کہا — "آپ خوش نصیب ہیں جو اللہ کے گھر میں رکوع و سجود کر کے آئے ہیں ..... کیا آپ کی بستی یہاں کہیں قریب ہی ہے؟"

"ابھی قریب بھی نہیں" — حج سے آنے والے نے جواب دیا — "تقریباً

پورے دن کی مسافت ہے"۔

"کیا اس علاقے میں کوئی بہت پرانا قلعہ بھی ہے؟" ـــــ قزل ساروق نے پوچھا اور خود ہی کہا ـــــ "سنا ہے اس کے کھنڈر باقی ہیں"۔

"ہاں محترم سالار!" ـــــ حاجی نے جواب دیا ـــــ "کہنے کو تو اس پہاڑی کے دوسری طرف ہے لیکن وہاں تک پہنچتے آج کا دن گزر چکا ہو گا..... کیا آپ اس قلعے تک جانا چاہتے ہیں؟"

"ہاں!" ـــــ قزل ساروق نے کہا ـــــ "قصد تو وہیں کا ہے' راستہ معلوم نہیں"۔

"راستہ مجھ سے پوچھیں" ـــــ حاجی نے کہا ـــــ "میرے ساتھ بیوی بچے نہ ہوتے تو میں آپ کے ساتھ چلتا تاکہ کہیں آپ بھٹک نہ جائیں۔ آپ جو فرض ادا کر رہے ہیں اسے میں تو فریضۂ حج کے برابر سمجھتا ہوں..... آپ یقیناً سلجوقی ہیں"۔

"اہل حجاز کے مسافر!" ـــــ قزل ساروق نے کہا ـــــ "میں سب سے پہلے مسلمان ہوں اس کے بعد سلجوق ہوں"۔

○

اُس اجنبی نے قزل ساروق کو اس قدیم قلعے کا راستہ سمجھانا شروع کر دیا۔ راستہ کوئی پیچیدہ تو نہیں تھا البتہ دشوار تھا۔ قزل ساروق کو اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ وہ اُس وادی سے کسی اور رخ چلنے والا تھا۔

"آپ تو فرشتہ معلوم ہوتے ہیں" ـــــ قزل ساروق نے کہا ـــــ "ہم تو کسی اور ہی طرف چلنے والے تھے۔ اللہ نے آپ کو ہماری رہنمائی کے لئے بھیجا ہے"۔

"اللہ مسبب الاسباب ہے" ـــــ حاجی نے کہا ـــــ "اللہ نے یہ سعادت بھی میری قسمت میں لکھی تھی کہ مجاہدین کی رہنمائی کروں۔ مجھے آپ کے کام میں دخل تو نہیں دینا چاہئے لیکن پوچھنا چاہوں گا کہ آپ اُس قدیم قلعے میں کیوں جا رہے ہیں؟"

"کیا آپ نے حسن بن صباح کا نام سنا ہے؟" ـــــ قزل ساروق نے پوچھا۔

"اُس ابلیس کا نام کس نے نہیں سنا ہو گا!" ـــــ حاجی نے کہا ـــــ "میں بغداد پہنچا تو وہاں سے یہاں تک اُسی کا نام سنتا آ رہا ہوں۔ افسوس یہ ہو رہا ہے کہ لوگ اُسے نبی اور اللہ کا ایلچی مان رہے ہیں۔ یہاں سے دور پیچھے مجھے پتہ چلا ہے کہ وہ انہی قدیم قلعے میں ہے اور اس کے ساتھ بڑے خونخوار قسم کے جانباز ہیں..... اگر آپ اُس ابلیس کو ختم کر

دیں تو میں یقین دلاتا ہوں کہ آپ کو حج اکبر کا ثواب ملے گا"۔

"ہماری کامیابی کی دعا کریں" ـــــ سالار قزل ساروق نے عقیدت مندی کے لہجے میں کہا۔

"انہیں مکہ کی ایک ایک کھجور کھلا دیں" ـــــ حاجی کی بیوی بولی ـــــ "اور زم زم کے پانی کا ایک ایک گھونٹ پلا دیں"۔

اس شخص نے ٹٹو کی پیٹھ پر لدے ہوئے سامان میں سے چھوٹا سا ایک تھیلا نکالا۔ اس میں سے کچھ کھجوریں نکالیں۔ ایک ایک کھجور سالار قزل ساروق اور اُس کے ماتحتوں کو دی۔

"ان کی گٹھلیاں نکلی ہوئی ہیں" ـــــ حاجی نے کہا ـــــ "وہاں سے ایسے ہی ملتی ہیں۔ بڑی خاص قسم کی کھجوریں ہیں..... اگر آپ کے لشکر کے پاس بہت بڑا ڈول یا مٹکا ہو تو وہ پانی سے بھر لیا جائے تو میں اس میں زم زم کا پانی ملا دوں گا۔ پورے لشکر کو دو دو گھونٹ پلائیں"۔

یہ ایک ہزار کا لشکر تھا جس کے کھانے پینے کا انتظام اور برتن وغیرہ ساتھ تھے۔ پانی سے بھرے ہوئے بڑے مشکیزے اونٹوں پر لدے ہوئے تھے۔ قزل ساروق کے حکم سے دو تین مشکیزے لائے گئے۔ حاجی نے خشک چمڑے کی بنی ہوئی ایک صراحی نکالی جس کا منہ بڑی مضبوطی سے بند تھا۔ حاجی نے یہ صراحی تینوں مشکیزوں میں خالی کر دی اور کہا کہ کوچ سے پہلے ہر آدمی یہ پانی پی لے۔

"پھر آپ دیکھنا سالارِ محترم!" ـــــ حاجی نے کہا ـــــ "آپ کو راستے کی دشواریوں کا احساس تک نہیں ہو گا اور آپ اور آپ کا ہر سوار یہ محسوس کرے گا کہ وہ اُڑ کر اس قلعے تک پہنچ گیا ہے"۔

قزل ساروق اور اُس کے ماتحتوں نے ایک ایک کھجور کھائی پھر انہوں نے مشکیزے سارے لشکر میں اس حکم کے ساتھ گھمائے کہ ہر سوار پانی پیئے۔ لشکر کو یہ بھی بتایا گیا کہ یہ آبِ زم زم ہے۔

حاجی اپنی بیوی اور بیٹوں کے ساتھ رخصت ہو گیا۔ سالار قزل ساروق نے صرف اس خیال سے اپنے آپ میں ایک نئی توانائی محسوس کی کہ اس نے مکے کی کھجور کھائی ہے اور آبِ زم زم پیا ہے۔ لشکر کے ہر سوار نے عقیدت مندی سے آبِ زم زم پیا اور پھر

لشکر اُس راستے پر چل پڑا جو حاجی نے بتایا تھا۔ حاجی نظروں سے اوجھل ہو چکا تھا۔

○

لشکر کو ایک بار پھر پہاڑی راستے پر اوپر جانا پڑا۔ گزشتہ رات ان کا ایک گھوڑا اور اس کا سوار ضائع ہو چکے تھے۔ یہ راستہ اُس سے زیادہ تنگ اور خطرناک تھا۔ گھوڑے ایک دوسرے کے پیچھے جا رہے تھے۔ اُن کی رفتار بہت ہی سست تھی۔ وہ جوں جوں آگے بڑھتے جا رہے تھے، راستہ تنگ ہی ہوتا جا رہا تھا اور آگے جا کر راستہ ختم ہو گیا۔ آگے پہاڑی دیوار کی طرح کھڑی تھی۔

"کیا اُس حاجی نے یہی راستہ بتایا تھا؟" — سالار قزل سارق نے اپنے ماتحتوں سے پوچھا جو اس کے پیچھے پیچھے آ رہے تھے۔

"اُس نے کہا تھا کہ یہ راستہ اوپر جا کر نیچے اُترے گا" — ایک ماتحت نے کہا — "یہاں اور کوئی راستہ ہے ہی نہیں"۔

قزل سارق نے اس پہاڑی کی ڈھلان کو دیکھا۔ اس سے آدمی سنبھل سنبھل کر اُتر سکتا اور گھوڑے بھی اُتر سکتے تھے لیکن سواروں کے بغیر۔

"کسی ایک سوار کو نیچے اُتارو" — قزل سارق نے اپنے ماتحت کمانڈروں سے کہا — "گھوڑے سے اتر کر..... گھوڑے کو ساتھ رکھے"۔

ایک جگہ ایسی مل گئی جہاں ڈھلان کا زاویہ زیادہ خطرناک نہیں تھا۔ ایک سوار گھوڑے سے اُترا اور باگ پکڑ کر ڈھلان سے اُترنے لگا۔ وہ کبھی دائیں ہوتا کبھی بائیں، جہاں پاؤں جمانے کو جگہ ملتی یوں جا کر اُتر آیا۔ گھوڑے، خچر اور گدھے کو پہاڑی پر چڑھنے اور اُترنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آتی۔ قدرت نے ان کے پاؤں ایسے بنائے ہیں کہ پہاڑی سے پھسلتے نہیں۔

بلندی خاصی زیادہ تھی۔ وہ سوار آخر اُتر گیا۔ قزل سارق نے حکم دیا کہ تمام سوار اسی طرح نیچے اتریں۔ یوں لگا جیسے پہاڑ کا بالائی حصہ ٹوٹ کر بہت بڑے بڑے تودوں کی طرح نیچے کو سرک رہا ہو۔ چند ایک گھوڑے گرے، لڑھکے اور سنبھل کر کھڑے ہو گئے۔ آدمی گرتے سنبھلتے اُترتے گئے اور جب سب اُتر گئے تو سورج اپنا بہت سا سفر طے کر گیا تھا۔

سواروں کو اکٹھا کر کے کوچ شروع ہوا۔ حاجی کی بتائی ہوئی نشانیوں کو دیکھتے وہ چلتے

گئے۔ بہت دور جا کر ایک پہاڑی کے درمیان سے انہیں راستہ مل گیا۔ قدرت نے یہاں سے پہاڑی کو کاٹ رکھا تھا۔ اس سے نکل کر آگے گئے تو ایک پُرشور ندی نے راستہ روک لیا۔ چونکہ یہ علاقہ پہاڑی تھا اس لئے ندی کا بہاؤ بہت ہی تیز تھا۔ پانی اتنا شفاف کہ اس کی تہہ میں کنکریاں بھی دکھائی دے رہی تھیں۔ ندی کم و بیش بیس گز چوڑی تھی۔ درمیان میں اس کا بہاؤ بہت ہی تیز تھا۔ گہرائی اتنی نہیں تھی کہ گھوڑے ڈوب جاتے۔

گھوڑے ندی میں ڈال دیئے گئے۔ درمیان میں گہرائی اتنی ہی تھی کہ پانی رکابوں تک آ گیا تھا لیکن بہاؤ اتنا تیز کہ گھوڑوں کے پاؤں اکھڑنے لگے اور گھوڑے پہلو بہ پہلو ایک دوسرے سے ٹکرانے لگے۔ بعض گھوڑے بہاؤ کے ساتھ ہی چلے گئے اور دور جا کر کنارے لگے۔

آگے گھنا جنگل تھا۔ ایسا گھنا بھی نہیں کہ اس میں سے گزرا ہی نہ جا سکتا لیکن زمین ہموار نہیں تھی۔ نشیب فراز تھے، گھاٹیاں اور ٹیکریاں تھیں، اور جگہ جگہ پانی جمع تھا۔ اس کے ارد گرد پھسلن اور دلدل تھی۔ گھوڑوں کو اس میں سے گزارا گیا۔

○

یہ بہت ہی پرانا قلعہ تھا اور یہ کوئی بڑا قلعہ نہ تھا۔ ایک جگہ سے دیوار کے پتھر گر پڑے تھے اور دیوار کی بلندی آدھی بھی نہیں رہ گئی تھی۔ آدمی گھوڑے کی پیٹھ پر کھڑا ہو کر قلعے کے اندر دیکھ سکتا تھا۔ دروازوں کی لکڑی کو دیمک نے چاٹ لیا تھا۔ ان کے لوہے کے فریم سلامت تھے۔ ان فریموں نے ادھ کھائی لکڑی کو تھام رکھا تھا۔

قلعے کے اندر بہت ہی وسیع کھلی زمین تھی۔ اس پر مکانوں کا ملبہ بکھرا ہوا تھا۔ یہ ان لوگوں کے کچے پکے مکان تھے جو کبھی یہاں آباد تھے۔ اس ملبے کے ارد گرد قلعے کے کمرے تھے۔ زیادہ تر کمروں کی چھتیں بیٹھ گئی تھیں۔ کئی ایک کمرے ابھی سلامت تھے۔ ان کی چھتوں میں چمگادڑوں نے بسیرا کر رکھا تھا۔

بڑے دروازے کے پیچھے ڈیوڑھی تھی۔ اس کے پہلو میں بڑے کمرے تھے۔ دیواروں کا رنگ سیاہ ہو گیا تھا۔ فرش اور دیواروں پر کائی اُگ کر خشک ہو گئی تھی۔ معلوم نہیں وہ کون تھے جنہوں نے یہ قلعہ بنایا تھا۔ اس سوال کا جواب بھی نہیں ملتا تھا کہ اس دشوار گزار علاقے میں آکر یہ قلعہ کیوں تعمیر کیا گیا تھا۔ علاقہ سرسبز اور خوبصورت تھا۔ شاید صدیوں پہلے یہ علاقہ آباد ہو گا۔ اب تو یہ چمگادڑوں اور بدروحوں کا مسکن تھا۔ کوئی

زندہ انسان تو اس میں جھانکنے کی بھی جرأت نہیں کرتا تھا نہ جھانکنے کی ضرورت محسوس کرتا تھا۔

یہ قلعہ گزرگاہوں سے بہت دُور تھا۔ شاید ڈاکو اور رہزن کبھی یہاں چھپنے کے لئے آتے ہوں گے..... لیکن کچھ دنوں سے یہ قلعہ پھر سے آباد ہو گیا تھا۔ آباد ہونے والوں کی تعداد کم و بیش تین سو تھی۔ ان میں سات آٹھ عورتیں بھی تھیں۔ آدمی جو تھے' ان میں کئی ایک زخمی تھے۔ شدید زخمی بھی تھے۔ ان کے گھوڑے بھی تھے اور اونٹ بھی۔

وہ عارضی طور پر یہاں آئے تھے۔ یہاں سے انہوں نے اپنی منزل کو روانہ ہونا تھا لیکن ابھی انہوں نے منزل کے راستے کا تعین نہیں کیا تھا۔

سلجوقی سالار قزل ساروق کی یہی منزل تھی اور یہی اُس کا ہدف تھا۔ اُس کا شکار اسی قلعے میں موجود تھا۔ وہ حسن بن صباح تھا۔

حسن بن صباح تبریز خالی کر آیا تھا۔ اُسے معلوم تھا کہ پانچ سو سلجوقی سواروں اور ان کے سالار کو مار کر اس کا راستہ صاف نہیں ہو گیا بلکہ راستے کی دشواریاں اب پیدا ہوئی ہیں۔ سلجوقیوں کے ساتھ اُس کا یہ پہلا تصادم تھا۔ اس نے سلجوقیوں کو اپنا خونی دشمن بنا لیا تھا۔ پہلے تو ان کے ساتھ اس کا نظریاتی اختلاف تھا۔ حسن بن صباح باطل عقیدے کا بانی اور علمبردار تھا۔ سلجوقی صحیح العقیدہ مسلمان تھے۔ وہ ایک اسلامی سلطنت میں حسن بن صباح کا وجود برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ اب نظریاتی اختلاف مرنے مارنے والی عداوت کی شکل اختیار کر گیا تھا۔

تبریز کے خونریز تصادم کے بعد حسن بن صباح خلجان' شاہ در اور اپنے پیر و مرشد احمد بن عطاش کی تحویل میں کسی بھی قلعے میں جا سکتا تھا مگر وہ جانتا تھا کہ سلطان ملک شاہ اور خصوصاً" ابو مسلم رازی جوابی کارروائی کریں گے اور فوراً" کریں گے اور اُسے زمین کی ساتویں تہہ میں سے بھی ڈھونڈ نکالیں گے۔

یہ سوچ کر تبریز میں اس کے جتنے پیروکار' فدائین اور وہاں تھوڑے سے جو لوگ آباد تھے' ان سب کو ساتھ لے کر اس قدیم قلعے میں آ گیا تھا۔ یہ بتانا مشکل ہے کہ اُسے کس نے مشورہ دیا تھا یا اُسے کس نے اس قلعے کی نشاندہی کر کے کہا تھا کہ وہاں جا کر روپوش ہو جائے۔

تاریخوں میں آیا ہے کہ اُس نے احمد بن عطاش کو اطلاع دے دی تھی کہ تبریز میں

کیسی خون ریزی ہوئی ہے اور اب وہ ایک ایسے قلعے کے کھنڈروں میں روپوش ہے جہاں تک کوئی نہیں پہنچ سکتا۔

O

سورج غروب ہونے میں ابھی بہت وقت رہتا تھا۔ حسن بن صباح ایک کمرے میں فرش پر بیٹھا تھا۔ یہ کمرہ اُس کے لئے خاص طور پر صاف کیا گیا تھا۔ اُس کے ساتھ جو لوگ آئے تھے' انہوں نے فرش پر کمبل' کھیس اور ان پر صاف ستھری چادریں بچھا دی تھیں۔ تکیے بھی رکھ دیئے۔ وہ ان لوگوں کا سردار یا سالار نہیں بلکہ ان کا روحانی پیشوا تھا۔ بعض نے اُسے 'پیغمبری' کا درجہ دے دیا تھا۔ تبریز والوں نے دیکھا تھا کہ وہ بھاگنے کا راستہ دیکھ رہے تھے تو حسن بن صباح نے اللہ کو پکارا تھا۔ پھر اُس نے اعلان کیا تھا کہ وحی آئی ہے۔ اللہ کی مدد آ رہی ہے' پھر تین سو سوار آ گئے تھے جنہوں نے سلجوقی سواروں کو بے خبری میں آلیا اور انہیں ان کے سالار سمیت کاٹ کر پھینک ڈالا تھا۔

"..... اور تم جانتے ہو" ــــ حسن بن صباح کمرے میں اپنے سامنے بیٹھے ہوئے چار ایک آدمیوں سے کہہ رہا تھا ــــ "کہ ہر پیغمبر کو بھاگنا پڑا' روپوش ہونا پڑا' مصائب برداشت کرنے پڑے اور انہیں کہیں پناہ لینی پڑی۔ حضرت عیسیٰؑ کو صلیب پر چڑھا لیا گیا' حضرت موسیٰؑ کو فرعون نے قتل کرنے کی کوشش کی' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مکہ سے نکل کر مدینہ میں پناہ لینی پڑی۔ اگر میں آج ان کھنڈروں میں آن بیٹھا ہوں تو یہ نہ سمجھنا کہ مجھے اللہ نے فراموش کر دیا ہے۔ یہ اللہ کا اشارہ تھا کہ میں یہاں آ گیا ہوں۔ پیغمبروں کے ساتھیوں کو اللہ نے عام لوگوں سے زیادہ اونچا رتبہ دیا ہے۔ تم سب اللہ کی نگاہ میں اُونچے رتبے کے افراد ہو۔ تم پر جب بھی مشکل وقت آئے گا' اللہ تمہاری مدد کو پہنچے گا....."

وہ یہیں تک کہہ پایا تھا کہ باہر سے ایک آدمی کی بڑی بلند آواز سنائی دی ــــ "حملہ آ رہا ہے..... ہوشیار ہو جاؤ"۔

حسن بن صباح چپ ہو گیا اور اس کے کان کھڑے ہو گئے۔

"سلجوقیوں کا لشکر آ رہا ہے"۔

"بہت بڑا لشکر ہے"۔

"سب کو اطلاع دے دو"۔

ان آوازوں کے ساتھ جب دوڑتے قدموں کی آہٹیں سنائی دینے لگیں تو حسن بن صباح اٹھا اور باہر نکل گیا۔ اُس نے اپنے آدمیوں میں بڑی کھلبلی دیکھی۔ کچھ آدمی قلعے کی ٹوٹی ہوئی خستہ حال سیڑھیوں سے اوپر جا رہے تھے اور کچھ دوسری طرف کی سیڑھیوں سے دوڑتے اُتر رہے تھے۔ انہوں نے گھبراہٹ کے عالم میں شور و غل بپا کر رکھا تھا۔

"زخمیوں کا کیا بنے گا"

"ہم اتنے بڑے لشکر سے نہیں لڑ سکتے"۔

"رُک جاؤ" — حسن بن صباح نے اپنی مخصوص گرجدار آواز میں کہا — "جو جہاں ہے وہیں رہے"۔

حسن بن صباح بڑے تحمل اور اطمینان سے سیڑھیاں چڑھ گیا اور اُس طرف دیکھا جس طرف اس کے آدمی دیکھ رہے تھے۔ کم و بیش ڈیڑھ میل دور ایک ہزار سوار طوفانی سمندر کی لہر کی طرح چلے آ رہے تھے۔ ایک ہزار سوار بہت بڑی طاقت تھی۔ قلعہ تو محض ایک کھنڈر تھا جس کے دروازے دیمک نے کھا لئے تھے۔ حسن بن صباح کے ساتھ تین سو سے کچھ ہی زائد آدمی تھے جن میں آدھے تبریز کی لڑائی کے زخمی تھے۔ ابو علی نے قزوین سے تین سو آدمی بھیجے تھے ان میں سے زیادہ تر واپس چلے گئے تھے۔ زخمیوں میں چند ایک ہی تھے جو لڑنے کے قابل تھے۔ ان سب کا یہ واویلا بجا تھا کہ وہ اتنے بڑے لشکر سے نہیں لڑ سکیں گے لیکن وہ اپنے پیر و مرشد یا امام حسن بن صباح کے چہرے پر سکون اور اطمینان دیکھ رہے تھے۔

سالار قزل ساروق کے ایک ہزار سوار قریب آتے گئے۔ اُن کی رفتار اتنی سست تھی جیسے وہ آرام آرام سے سفر پر جا رہے ہوں۔

"کیا خیال ہے" — حسن بن صباح نے ایک آدمی سے پوچھا جو اُس کے ساتھ لگا کھڑا تھا۔

"اور قریب آنے دیں" — ساتھ والے آدمی نے کہا — "ان کی رفتار بتاتی ہے کہ وار خالی نہیں گیا"۔

"یہ تو میں دیکھ رہا ہوں" — حسن بن صباح نے کہا — "یہاں سے انہیں گھوڑے دوڑا دینے چاہئیں تھے۔ میں کچھ اثر دیکھ رہا ہوں"۔

قلعے کی دیوار پر اور نیچے حسن بن صباح کے آدمیوں نے ایسا غل غپاڑہ بپا کر رکھا تھا

کہ کانوں پڑی آواز سنائی نہیں دیتی تھی۔

"ہر آدمی اپنا ہتھیار لے کر لڑنے کے لئے تیار ہو جائے" — حسن بن صباح نے دیوار سے اندر کی طرف منہ کر کے اپنے آدمیوں کو حکم دیا — "تیر انداز اوپر آ جائیں"۔

چونکہ یہ حسن بن صباح کا حکم تھا اور سب اسے نبی بھی مانتے تھے' امام بھی اور بعض نے تو اسے پیغمبر بھی بنا دیا تھا۔ انہوں نے حکم کی تعمیل کی لیکن بد دلی اور بزدلی اُن کے چہروں پر صاف نظر آ رہی تھی۔ زخمیوں نے الگ ہنگامہ بپا کر رکھا تھا۔ وہ جانتے تھے کہ وہ تو معذوری اور بے بسی کی حالت میں ہی مارے جائیں گے۔

"دوسری طرف سے نکل بھاگو" — قلعے سے ایک آواز اٹھی۔

"ہمیں ساتھ لے چلو بھائیو" — یہ زخمیوں کی آہ و بکا تھی۔

حسن بن صباح نے دیوار پر کھڑے تیر اندازوں کو دیکھا۔ پھر اندر کی طرف اپنے آدمیوں کو دیکھا اور ان کی باتیں سنیں۔ باہر دیکھا تو ایک ہزار سواروں کا لشکر قلعے کے قریب آ گیا تھا اور گھوڑے قلعے کے دائیں بائیں پھیلتے جا رہے تھے۔ سالار قزل ساروق اور اس کے سواروں کے چہروں پر وہ غیظ و غضب نہیں تھا جو حملہ آوروں کے چہروں پر ہوا کرتا ہے۔ قزل ساروق کو تو آگ بگولہ ہونا چاہئے تھا کیونکہ ان باطنیوں نے اس کے ساتھی سالار امیر ارسلان کو قتل کیا تھا اور انہوں نے پانچ سو سلجوقی سوار مار ڈالے تھے لیکن قزل ساروق کے چہرے پر اطمینان سا تھا۔

○

حسن بن صباح نے اپنے آدمیوں کا جائزہ لے لیا تھا۔ اُس نے دیکھ لیا تھا کہ ان میں لڑنے کا دم نہیں اور نہ ہی ان میں جذبہ ہے۔ اس حقیقت سے تو وہ آگاہ تھا کہ اتنے تھوڑے سے آدمی ایک ہزار سواروں کا مقابلہ نہیں کر سکیں گے۔ وہ اچانک دیوار سے ہٹ کر پیچھے کو مڑا اور وہیں سے اندر کی طرف منہ کر کے کھڑا ہو گیا۔

"اللہ ..... مجھے زمین پر اتارنے والے اللہ" — حسن بن صباح نے دونوں ہاتھ اور منہ آسمان کی طرف کر کے بڑی ہی بلند آواز میں کہا — "تیرا ایلچی جسے تو نے امامت بخشی ہے بہت بڑی مشکل میں آ گیا ہے۔ اپنی راہ میں لڑ کر زخمی ہونے والے بندوں پر رحم فرما..... فرشتے اتار دے۔ میری امامت اور اپنی خدائی کی لاج رکھ لے"۔

حسن بن صباح پلٹ کر دیوار کی بیرونی طرف چلا گیا۔ سالار قزل ساروق اُس کے

سامنے تھا۔ اس سلجوقی سالار نے اپنے سواروں کو کوئی حکم نہیں دیا تھا۔ وہ حسن بن صباح کو یوں دیکھ رہا تھا جیسے اسے پہچاننے کی کوشش کر رہا ہو۔

"تم لوگ یہاں کیا لینے آئے ہو؟" ۔۔۔ حسن بن صباح نے پوچھا۔

"ہم لوگ یہاں کیا لینے آئے ہیں؟" ۔۔۔ قزل ساروق نے اپنے ایک ماتحت سے پوچھا جو اُس کے پاس موجود تھا۔

ماتحت نے اُس کے منہ کی طرف دیکھا اور پھر منہ اُوپر کر کے دیوار پر کھڑے حسن بن صباح کو دیکھنے لگا۔

حسن بن صباح ایک بار پھر پیچھے کو مڑا۔ اُس نے بازو اُوپر کئے اور بڑی ہی گرجدار آواز میں اعلان کیا۔۔۔ "فرشتے اُتر آئے ہیں۔ حوصلوں کو مضبوط رکھو۔ دشمن بھاگ رہا ہے"۔

وہ پھر دیوار کے باہر کی طرف مڑا، دو تیر اندازوں کو بلایا، انہیں کچھ کہا، اُنھوں نے ایک ایک تیر چلایا۔ ایک تیر ایک سوار کے سینے میں اور دوسرا ایک اور سوار کی شہ رگ میں اتر گیا۔ دونوں سوار گھوڑوں سے گر پڑے۔

"تم نے میرے سواروں کو کیوں مروایا ہے؟" ۔۔۔ سالار قزل ساروق نے حسن بن صباح سے پوچھا۔

"اپنے سواروں کو یہاں سے لے جاؤ" ۔۔۔ حسن بن صباح نے کہا۔۔۔ "ورنہ تمہارا ہر سوار اسی طرح مارا جائے گا پھر تمہیں گھوڑے کے پیچھے باندھ کر گھوڑے کو بھگا دیا جائے گا"۔

سالار قزل ساروق نے کچھ بھی نہ کہا۔ اُس نے اپنا گھوڑا پیچھے کو موڑا اور چل دیا۔ تمام سوار اُس کے پیچھے پیچھے چل پڑے۔

"امام نے دشمن بھگا دیا ہے" ۔۔۔ قلعے کی دیوار سے بڑی ہی بلند آواز اٹھی۔۔۔ "اوپر آکر دیکھو"۔

"اپنے پیر، مرشد کا معجزہ دیکھو" ۔۔۔ ایک اور آواز اٹھی۔

"پیر و مرشد نہیں" ۔۔۔ کسی نے گلا پھاڑ کر کہا۔۔۔ "نبی کہو۔۔۔۔ خدا کا بھیجا ہوا امام کہو"۔

نیچے والے تمام آدمی جن میں چند ایک عورتیں بھی تھیں، دوڑتے ہوئے اوپر گئے

اور حیرت زدگی کے عالم میں جاتے ہوئے سواروں کو دیکھنے لگے۔ سلجوقی سوار جاتے جاتے جنگل کی ہریالی میں تحلیل ہو گئے اور اس کے ساتھ ہی سورج مغرب والی بلند و بالا پہاڑیوں کے پیچھے چلا گیا۔

O

حسن بن صباح دیوار پر ہی کھڑا رہا اور اس کی نظریں اُدھر ہی لگی رہیں جدھر سالار قزل ساروق اور اس کے سوار نظروں سے اوجھل ہو گئے تھے۔

"امام کو سجدہ کرو" ۔۔۔ کسی کی آواز اٹھی۔

سب لوگ جیسے اسی آواز کے منتظر تھے۔ جو دیوار پر تھے وہ دوڑتے آئے اور حسن بن صباح کے سامنے سجدہ ریز ہو گئے۔ نیچے والے آدمی جہاں تھے وہیں سے انہوں نے منہ حسن بن صباح کی طرف کر لئے اور سجدے میں چلے گئے۔

حسن بن صباح کا سینہ تن گیا۔ شروع سے اس کے ساتھ جو ادھیڑ عمر آدمی موجود رہا تھا جسے اُس نے کہا تھا کہ میں کچھ اثر دیکھ رہا ہوں، وہ بھی سجدے میں تھا۔ حسن بن صباح نے اُسے آہستہ سے پاؤں کی ٹھوکر ماری۔ اُس آدمی نے سر اٹھا کر دیکھا۔ حسن بن صباح نے اُسے اٹھنے کا اشارہ کیا۔ وہ آدمی اٹھا تو حسن بن صباح نے اُس کے کان میں کوئی بات کہی۔

"کیا ہم اپنے فرشتوں کو واپس بلا لیں؟" ۔۔۔ اُس آدمی نے اپنی آواز کو بھاری کر کے جلالی لہجے میں کہا۔۔۔ "بولو میرے امام؟"

"اے خداوند دو عالم!" ۔۔۔ حسن بن صباح نے کہا۔۔۔ "میں اپنے ان بندوں کی طرف سے تیری ذاتِ باری کا شکر ادا کرتا ہوں۔ تیرے فرشتوں نے ہمارے دشمن کو بھگا دیا ہے"۔

سب لوگ ابھی تک سجدے میں تھے۔ وہ حسن بن صباح کے ساتھی کی آواز کو خدا کی آواز سمجھے تھے۔

"اٹھو" ۔۔۔ حسن بن صباح نے کہا۔۔۔ "تم نے اللہ کی آواز سن لی ہے"۔

سب سجدے سے اُٹھے۔ اب اُن کے چہروں پر کچھ اور ہی تاثر تھا۔ بعض کے منہ حیرت سے یا جوشِ عقیدت سے کھل گئے تھے اور وہ حسن بن صباح کو یوں دیکھ رہے تھے جیسے وہ بھی اللہ کا بھیجا ہوا فرشتہ تھا اور وہ ابھی غائب ہو جائے گا اور آسمان پر جا پہنچے گا۔

عورتیں جو نیچے تھیں، دوڑتی اوپر آئیں۔ ہر ایک نے باری باری آگے بڑھ کر حسن بن صباح کا دایاں ہاتھ پکڑا، آنکھوں سے لگایا اور چوما۔

شام کا دھندلکا گہرا ہو رہا تھا۔ قلعے کے اندر مشعلیں جل اٹھی تھیں۔ حسن بن صباح آہستہ آہستہ چلتا سیڑھیوں سے اترا۔ اُس کی چال میں اور اُس کے چہرے پر جلالی تاثر تھا۔ اُس کے ہر آدمی کی یہ کوشش تھی کہ وہ اس کے قریب ہو کر اُسے ہاتھ لگائے اور دیکھے کہ یہ شخص انسان ہے یا اللہ کی پسندیدہ کوئی آسمانی مخلوق ہے۔ تبریز میں بھی اس نے اللہ سے مدد مانگی تھی تو "اللہ" نے ایسی مدد بھیجی تھی کہ سلجوقیوں کے تمام کے تمام سوار مارے گئے تھے۔

○

شام کھانے کے بعد قلعے میں جشن کا سماں بندھ گیا۔ عورتوں نے گیت گائے، آدمی پاگلوں کی طرح ناچے۔ انہوں نے ایک اونٹ ذبح کر لیا تھا اور تھوڑے سے وقت میں پکا بھی لیا تھا۔ وہاں کوئی چیز نہیں تھی تو شراب نہیں تھی۔ شراب حسن بن صباح نے اپنے لئے رکھی ہوئی تھی۔ اُس کے پیروکار اور مرید اس شراب کو اللہ کے حضور پہنچنے کا ذریعہ سمجھتے تھے۔

فتح کا یہ جشن بہت دیر بعد ختم ہوا۔ سب سے زیادہ خوش تو وہ زخمی تھے جو لڑنا تو دور کی بات ہے، چلنے پھرنے کے قابل نہیں تھے۔ وہ بال بال بچ گئے تھے۔

وقت آدھی رات کا تھا۔ حسن بن صباح اپنے کمرے میں بیٹھا تھا۔ فانوس جل رہا تھا۔ شراب کی صراحی اور پیالے سامنے رکھے تھے۔ وہ اکیلا نہیں تھا۔ اس کے پاس ایک اُدھیڑ عمر آدمی بیٹھا تھا اور ایک جواں سال عورت بھی تھی۔ وہ ایک حسین عورت تھی جس کی آنکھیں مسکراتی تھیں۔ اس کے ہونٹوں کے تبسم میں ایسا تاثر تھا کہ دیکھنے والا اُس سے نظریں ہٹا نہیں سکتا تھا۔

یہ ادھیڑ عمر آدمی وہی تھا جو قزل ساروق کو صبح سویرے وادی میں ملا تھا اور اُس نے اپنا تعارف کرایا تھا کہ وہ اپنی بیوی اور ان دو بیٹوں کے ساتھ حج کر کے آیا ہے۔ اُس کے ساتھ جو بیوی تھی وہ یہی عورت تھی جو حسن بن صباح کے پاس بیٹھی شراب پی رہی تھی۔ یہ اُس شخص کی بیوی نہیں تھی۔ یہ حسن بن صباح کے خصوصی اور خفیہ گروہ کی عورت تھی اور ان کے ساتھ صبح وادی میں جو دو لڑکے تھے وہ ان کے کچھ نہیں لگتے

تھے۔ وہ تبریز سے آئے ہوئے ایک آدمی کے بیٹے تھے۔

"یہ صرف تمہارا کمال ہے اسماعیل!" — حسن بن صباح نے اس ادھیڑ عمر آدمی سے کہا — "مجھے توقع نہیں تھی کہ تم اتنی جلدی یہ کام کر سکو گے۔ نہ کر سکتے تو میں تمہیں بے قصور اور مجبور سمجھتا"۔

"وہاں نہ سہی" — عورت نے کہا — "یہ سلجوقی وہاں نہ ملتے تو کہیں اور مل جاتے۔ خوش نصیبی یہ ہوئی کہ یہ ہمیں جلدی مل گئے"۔

"میں نے انہیں غلط راستے پر ڈال دیا تھا" — اسماعیل نے کہا — "وہ ٹھیک راستے پر آ رہے تھے۔ اس راستے سے وہ جلدی یہاں تک پہنچ جاتے۔ میں نے یہ سوچ کر انہیں غلط راستے پر ڈال دیا تھا کہ کھجوروں اور پانی کو اپنا اثر پورا کرنے کا وقت مل جائے۔ آپ نے بتایا تھا کہ ان میں جو چیز ملائی گئی ہے، اس کا اثر دیر سے شروع ہوتا ہے"۔

"میں تمہیں خراج تحسین پیش کرتا ہوں" — حسن بن صباح نے کہا — "مجھے ایک خوشی یہ بھی ہے کہ اس دوائی کا یہ پہلا تجربہ کیا گیا ہے۔ مجھے یقین نہیں تھا کہ یہ اس حد تک کامیاب ہو گا کہ ایک ہزار کے لشکر کو ذہنی طور پر مفلوج کر دے گا، اور مفلوج بھی اس طرح کرے گا کہ متاثرہ آدمی ہر کام ٹھیک ٹھاک کرے گا لیکن جذباتی لحاظ سے اتنا سرد ہو جائے گا کہ کسی کو لڑنے جھگڑنے کے لئے نہیں للکارے گا اور اگر اُسے کوئی للکارے گا تو وہ بزدلوں کی طرح منہ موڑ جائے گا"۔

"تو کیا یہ لشکر صحیح و سلامت اپنی منزل پر پہنچ جائے گا؟" — اسماعیل نے پوچھا۔

"کیا وہ یہاں تک صحیح و سلامت نہیں پہنچ گئے تھے؟" — حسن بن صباح نے کہا — "وہ جو تمہارے بتائے ہوئے اتنے دشوار راستے سے یہاں تک پہنچ گئے تھے، واپس بھی چلے جائیں گے"۔

"یہ اثر کب تک رہے گا؟" — اسماعیل نے پوچھا۔

"شاید دو دن تک" — حسن بن صباح نے جواب دیا۔

"ایک اور بات امام!" — اس جواں سال عورت نے پوچھا جو اس کام میں شامل تھی — "ایسا کیوں نہ کیا گیا کہ اسی دوائی کی زیادہ مقدار کھجوروں اور پانی میں ملا دی جاتی تاکہ یہ لشکر جہاں تھا وہیں سے واپس چلا جاتا؟"۔

"اس میں ایک راز ہے" — حسن بن صباح نے ہنستے ہوئے کہا — "اس لشکر کو

دنیں سے واپس بھیجا جا سکتا تھا اور جس عقیدت سے انہوں نے تمہاری دی ہوئی کھجوریں اور ندی کے پانی کو آبِ زم زم سمجھ کے منہ میں ڈال لیا تھا" انہیں اِنہی کھجوروں اور پانی میں ایسا زہر بھی دیا جا سکتا تھا جس کا نہ کوئی ذائقہ ہوتا ہے نہ بُو لیکن انہیں مکے تک زندہ آنے اور زندہ واپس جانے دیا گیا..... ولی اور پیغمبر ہر کوئی نہیں بن سکتا' بنتا وہ ہے جس کی سوچ آسمانوں تک چلی جاتی ہے۔ میں نے ان لوگوں کو یہ معجزہ دکھانا تھا جو ہمارے ساتھ ہیں۔ انہوں نے یہ دیکھا کہ میرے کہنے پر آسمان سے مدد آئی جو نظر نہیں آتی تھی پھر ان آدمیوں نے دیکھا کہ اتنا طاقتور گھوڑ سوار لشکر میری ہلکی سی ٹھوکر پر واپس چلا گیا۔ اب یہ لوگ جہاں جائیں گے میرا یہ معجزہ سنائیں گے۔ انسانی فطرت میں زیبِ داستان بھی موجود ہے اس لئے یہ لوگ میرا معجزہ بیان کرتے زیبِ داستان کے لئے مبالغہ آرائی بھی کریں گے۔ یہ تین سو انسان تین ہزار بلکہ اس سے بھی زیادہ تعداد کو میرے پاس کھینچ لائیں گے"۔

"بلکہ یہ تعداد بڑھتی ہوئی آئے گی" ——— اسماعیل نے کہا ——— "مسلمین کی عقیدت مندی کی بھی کوئی حد نہیں۔ اُسے کہیں کی ذرا سی مٹی پڑیا میں باندھ کر دے دو اور کہو کہ یہ مکہ اور مدینہ کی سوغات ہے تو وہ بلا سوچے سمجھے یہ مٹی کھا لے گا۔ ایسے ہی اس سلجوقی سالار اور اس کے ساتھیوں نے میری دی ہوئی کھجوریں حجاز کی کھجوریں سمجھ کر بڑے احترام سے کھا لیں اور جب میں نے ندی میں سے بھری ہوئی صراحی دکھا کر کہا کہ یہ زم زم کا پانی ہے تو سالار نے فوراً" ایسا انتظام کر لیا کہ سارے لشکر کو پانی پلا دیا"۔

"تم بڑے کام کی چیز ہو خدیجہ!" ——— حسن بن صباح نے اس جوان سال اور دلنشیں عورت کو بازو سے پکڑ کر اپنے قریب کرتے ہوئے کہا ——— "ابھی تو میں نے تم سے بہت کام لینا ہے" ——— حسن بن صباح نے خدیجہ کو اپنے بازو کے گھیرے میں لے لیا اور اسماعیل کی طرف دیکھا۔

اسماعیل اشارہ سمجھ گیا اور وہ کمرے سے نکل گیا۔

○

بیشتر مؤرخوں نے تبریز کی لڑائی کا ذکر کیا ہے۔ انہوں نے لکھا ہے کہ سالار امیر ارسلان اور اس کے سوار مارے گئے۔ انہوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ ایک باطنی سردار' علی نے قزوین سے تین سو باطنی سواروں کی کمک بھیجی تھی۔ پھر انہوں نے یہ بھی لکھا

ہے کہ سلطان ملک شاہ نے غصے کے عالم میں سالار قزل ساروق کو ایک ہزار سوار دے کر بھیجا تھا اور ان کے ساتھ حکم یہ دیا تھا کہ واپس آؤ تو حسن بن صباح تمہارے ساتھ ہو' زندہ یا مُردہ۔

یہ سب باتیں تو ان مؤرخوں نے لکھی ہیں اور یہ بھی لکھا ہے کہ یہ کوئی گمنام سا قلعہ تھا' یہاں سے بھی حسن بن صباح کے پیروکار بھاگ نکلنے پر اُتر آئے تھے اور حسن بن صباح نے تبریز والا مظاہرہ کیا تھا کہ وحی نازل ہو گئی ہے اور خدائی مدد آ رہی ہے۔ یہ سن کر سب کے حوصلے قائم ہو گئے تھے۔ اس کے بعد کیا ہُوا؟ ان مؤرخوں میں سے کسی نے بھی نہیں لکھا کہ اس لڑائی کا انجام کیا ہُوا۔ یہاں آکر ان کی لکھی ہوئی تاریخ ایسے اندھیرے میں چلی جاتی ہے جہاں کچھ نظر نہیں آتا۔ البتہ یہ بتایا گیا ہے کہ حسن بن صباح قلعہ الموت میں پہنچ گیا۔

داستان گو نے قزل ساروق اور اس کے سواروں کو ذہنی طور پر مفلوج کرنے کا جو واقعہ سنایا ہے یہ تین غیر معروف سے مؤرخوں نے کچھ ایسے حوالوں اور دلائل سے لکھا ہے کہ یہ قابلِ قبول اور مستند سمجھا جاتا ہے۔ ان میں اٹلی کا ایک تاریخ نویس ہانسولیکی خاص طور پر قابلِ ذکر ہے۔ اس کی تحریریں اطالوی زبان میں ملتی ہیں جن کا ترجمہ انگریزی زبان میں کیا گیا ہے۔

بظاہر یہ واقعہ افسانوی سا لگتا ہے لیکن حسن بن صباح کو خدا نے ایسا دماغ دیا تھا جسے اگر مافوق الفطرت یا بالائے سطحِ انسانی کہا جائے تو غلط نہ ہو گا۔ اُس کی تاریخ کا مطالعہ گہرائی میں جا کر کیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ اُس نے اپنے ابلیسی فرقے کی بنیاد انسان کی فطری کمزوریوں پر رکھی تھی۔ ان میں ایک تو عورت اور دوسری تھی نشہ۔ یہ دونوں چیزیں جب انسان کے دماغ پر غالب آجاتی ہیں تو پھر وہ انسان اگر ضرورت پڑے تو اپنے بچوں تک کو قتل کر دیتا ہے۔ پہلے بیان ہو چکا ہے کہ حسن بن صباح کی کامیابی کا راز حشیش اور حسین عورت تھی۔

حسن بن صباح جہاں بھی جاتا تھا' اُس کا جاسوسی کا نظام اُس کے ساتھ ہوتا تھا۔ وہ تبریز سے نکلا تو اُس نے اپنے دو تین آدمی اس علاقے میں چھوڑ دیئے تھے۔ سالار قزل ساروق تبریز پہنچا تو اتنی دُور بیٹھے ہوئے حسن بن صباح کو اطلاع مل گئی۔ اگر نیم پاگل سا شخص قزل ساروق کے جاسوس کو نہ بتاتا کہ حسن بن صباح کا قافلہ فلاں طرف گیا ہے تو

وہاں تک کوئی بھی نہ پہنچ سکتا لیکن انہی دو تین مکانوں میں سے ایک آدمی نے حسن بن صباح تک اطلاع پہنچا دی کہ اس کی نشاندہی ہو گئی ہے اور ایک ہزار سواروں کا لشکر آ رہا ہے۔

حسن بن صباح کو اطلاع ملی تو اُس نے وہاں سے کہیں اور بھاگ جانے کی بجائے یہ طریقہ سوچ لیا جو بیان کیا گیا ہے۔ اُس نے اپنا خفیہ گروہ ساتھ رکھا ہوا تھا جس میں اسماعیل بھی تھا اور خدیجہ بھی۔ فوراً یہ طریقہ سوچ لیا گیا پھر جس طرح اسماعیل اور خدیجہ میاں بیوی کے روپ میں دو لڑکوں اور ایک ٹٹو کے ساتھ روانہ ہو گئے۔ یہ حسن بن صباح کے دماغ کا بے مثال کمال تھا۔ اسماعیل اور خدیجہ رات بھر ان سواروں کے انتظار میں ایک جگہ بیٹھے رہے تھے۔ صبح انہیں یہ لشکر مل گیا۔

○

سالار قزل ساروق اپنے سواروں کے آگے آگے گھوڑے پر سوار چلا گیا۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے اس کے ذہن سے یہ اُتر ہی گیا ہو کہ وہ کس مقصد کے لئے ادھر آیا تھا۔ اُس کا انداز ایسا تھا جیسے لوگ سیر سپاٹے کے لئے آئے ہوں۔ ان کے دماغ صحیح کام کر رہے تھے۔ وہ راستہ بھولے نہیں تھے۔ ان کے دماغ کسی وقت بھی حاضر تھے جب وہ بڑی خطرناک حد تک تنگ پہاڑی راستوں پر جا رہے تھے، البتہ انہیں یہ احساس نہیں تھا کہ کہیں رات بھر کے لئے پڑاؤ بھی کرنا ہے۔

انہوں نے دن کے وقت پڑاؤ کیا۔ کھانا تیار کیا، کھایا بھی اور سو گئے۔ چونکہ ان کا احساس زندہ نہیں تھا یا احساس سویا ہوا تھا، وہ ایسے سوئے کہ اگلی صبح جاگے اور چل پڑے۔

تاریخوں میں یہ کھوج نہیں ملتا کہ وہ کتنے پڑاؤ کر کے مرو پہنچے، یہ سراغ ملتا ہے کہ وہ مرو سے ابھی کچھ دور ہی تھے تو سالار قزل ساروق نے اپنے سر کو زور سے ہلایا اور گھوڑا روک لیا۔ اُس نے اپنے ماتحتوں کو بلایا۔ وہی ماتحت جو خوش و خرم چلے آ رہے تھے، اب کسی اور ہی ذہنی کیفیت میں تھے۔ ان کے چہروں پر حیرت اور تذبذب کے تاثرات تھے۔

"تم کیا محسوس کر رہے ہو؟" — سالار قزل ساروق نے ان سے پوچھا اور اپنی کیفیت یوں بیان کی — "لگتا ہے ہم خواب میں کہیں گھومتے پھرتے رہے ہیں اور شاید حسن بن صباح کو دیکھا تھا"۔

"ہمیں بھی یہی محسوس کر رہا ہوں" — ایک ادھیڑ عمر ماتحت نے کہا — "کچھ کچھ یاد آ رہا ہے کہ ہم وہاں تک پہنچے تھے"۔

"مجھے یاد ہے کہ ایک حاجی، اس کی بیوی اور دو بیٹے ملے تھے" — ایک اور ماتحت کماندار نے کہا — "پھر مجھے ندی تک یاد ہے"۔

سالار قزل ساروق یوں چونک کر سیدھا ہو گیا جیسے اسے سب کچھ یاد آ گیا ہو۔

"ہمارے ساتھ دھوکا ہوا ہے" — اُس نے کہا — "ہم سلطان کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہے لیکن میرے رفیقو! سلطان کے آگے جھوٹ نہیں بولنا۔ جو ہوا ہے وہ من و عن بیان کرنا ہے۔ اگر سلطان کو رحم آ گیا تو وہ ہمیں معاف کر دے گا ورنہ وہ جو بھی سزا دے گا وہ ہم دل و جان سے قبول کریں گے"۔

"پھر یوں کرو دوستو!" — ایک ماتحت کماندار نے کہا — "اگر سلطان نے ہمیں سبکدوش کر دیا تو آؤ حلفیہ عہد کریں کہ ہم اپنے طور پر سب مل کر حسن بن صباح کو زندہ یا مردہ سلطان کے سامنے پیش کریں گے اور اس کے گروہ کے ایک بھی آدمی کو زندہ نہیں چھوڑیں گے"۔

"اگر سلطان نے ہمیں قید میں ڈال دیا" — ایک اور کماندار نے کہا — "تو ہم اُسے کہیں گے کہ ہمیں اپنی اس غلطی کا کفارہ ادا کرنے کے لئے آزاد کرے"۔

"یہ بھی سوچ لو دوستو!" — سالار قزل ساروق نے کہا — "حسن بن صباح کی جگہ کوئی اور دشمن ہوتا تو سلطان ہماری اس غلطی کو جو ہم سے دھوکے میں ہوئی، معاف کر دیتا لیکن یہاں معاملہ حسن بن صباح اور اسلام کے تحفظ کا ہے، سلطان مجھے اور تم سب کمانداروں کو سزائے موت بھی دے سکتا ہے اور مجھے توقع سزائے موت کی ہی ہے لیکن ہماری وفاداری یہ ہے کہ ہم اُس کے سامنے جائیں گے اور مرنے کے لئے تیار ہو کر جائیں گے"۔

سلطان ملک شاہ کو سالار قزل ساروق پر اتنا زیادہ اعتماد تھا کہ اُس نے ایک بار بھی ایسے شک کا اظہار نہیں کیا تھا کہ اُس کا یہ سالار ناکام لوٹے گا۔ اُس کا دانشمند وزیر خواجہ حسن طوسی نظام الملک دو تین بار کہہ چکا تھا کہ قزل ساروق کا کوئی پیغام نہیں آیا۔ کم از کم ایک پیغام تو آنا چاہیے تھا۔

"لومڑی کا شکار آسان نہیں ہوتا خواجہ!" ـــــ سلطان ملک شاہ نے کہا تھا ـــــ "کیا آپ نہیں جانتے کہ حسن بن صباح جنگجو دشمن نہیں؟ وہ لومڑی ہے۔ وہ دکھاتا تلوار ہے اور مارتا برچھی ہے۔ ہمارا سالار امیر ارسلان اس کے دھوکے میں مارا گیا ہے۔ وہ ان باطنیوں سے دو بدو لڑائی لڑا ہے۔ لیکن اُس پر وار پیٹھ پیچھے سے ہوا تھا۔ قزل ساروق دھوکے میں نہیں آئے گا۔ وہ وثوق سے کہہ گیا تھا کہ وہ واپس آئے گا تو حسن بن صباح زندہ یا مُردہ اُس کے ساتھ ہوگا' نہ ہوا تو وہ خود بھی واپس نہیں آئے گا"۔

نظام الملک خاموش رہا تھا جیسے سلطان ملک شاہ کی اس بات کو وہ خوش فہمی سمجھا ہو اور اسے قزل ساروق کی کامیابی مشکوک نظر آرہی ہو۔ تاریخ شاہد ہے کہ خواجہ حسن طوسی دانشمند اور دُور اندیش تھا۔ اُس کی نگاہیں اس حد سے آگے نکل جایا کرتی تھیں جس حد تک ملک شاہ کی نگاہیں دیکھ سکتی تھیں۔ ملک شاہ اُس کی دُور اندیشی کا قائل تھا۔ یہ الفاظ سلطان ملک شاہ کے ہی ہیں کہ خواجہ حسن طوسی روح کی آنکھ سے دیکھتا اور روحانی طاقت سے مشکلات پر قابو پالیتا ہے۔

پھر ایک روز جب سورج ڈھل رہا تھا' سلطان ملک شاہ کے محل کے قریب ایک بڑی ہی بلند آواز اُٹھی ـــــ "لشکر واپس آرہا ہے"۔

پھر دوڑتے قدموں کے ساتھ آوازوں کا طوفان آگیا۔

"سالار قزل ساروق آرہا ہے"۔

"لشکر پورا معلوم ہوتا ہے"۔

"فاتح آرہے ہیں"۔

"سلطانِ عالی مقام!" ـــــ دربان نے سلطان ملک شاہ کو اطلاع دی ـــــ "سالار قزل ساروق کا لشکر واپس آرہا ہے۔ شہر سے ابھی کچھ دور ہے"۔

"ہمارا اور نظام الملک کا گھوڑا فوراً تیار کرو" ـــــ ملک شاہ نے کہا۔

نظام الملک باہر کی آوازیں سُن کر ملک شاہ کے پاس پہنچ گیا۔

"ہم قزل ساروق کا استقبال شہر سے باہر کریں گے" ـــــ سلطان ملک شاہ نے کہا۔

سلطان اور نظام الملک گھوڑوں پر سوار شہر سے نکل گئے۔ محافظ دستے کے چار سوار اُن کے آگے اور بارہ پیچھے جا رہے تھے۔ سالار قزل ساروق اور اُس کے ایک ہزار سوار شہر سے تھوڑی ہی دُور رہ گئے تھے۔

"قزل ساروق نے ہمیں دیکھ کر بھی اپنے گھوڑے کو ایڑ نہیں لگائی" ـــــ ملک شاہ نے نظام الملک سے کہا ـــــ "کیا یہ فتح کے نشے کا اظہار ہے؟"

"اس کا چہرہ اور اس کا انداز فتح والا نہیں لگتا" ـــــ نظام الملک نے کہا ـــــ "اگر یہ فتح کے نشے سے سرشار ہوتا تو ہمیں دیکھتے ہی گھوڑے کو سرپٹ دوڑاتا ہم تک پہنچ چکا ہوتا۔ یہ تو لگتا ہے بڑی مشکل سے گھوڑے پر بیٹھا ہوا ہے"۔

"اور لشکر بھی خاموشی سے آرہا ہے" ـــــ سلطان ملک شاہ نے کہا اور گھوڑے کو ہلکی سی ایڑ لگائی۔

قریب آکر قزل ساروق نے اپنا گھوڑا لشکر کے آگے سے ایک طرف کرلیا اور ملک شاہ کے سامنے رُک گیا۔

○

"خوش آمدید ساروق!" ـــــ سلطان ملک شاہ نے اپنا ہاتھ اُس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا ـــــ "اگر تم حسن بن صباح کو زندہ یا مردہ اپنے ساتھ نہیں لا سکے تو یہ شرمساری کی معقول وجہ نہیں"۔

سلطان ملک شاہ نے دیکھا کہ اُس نے مصافحہ کے لئے ہاتھ بڑھایا اور قزل ساروق نے اپنا ہاتھ آگے نہیں کیا۔

"سالار قزل ساروق؟" — نظام الملک نے کہا — "سلطان محترم نے مصافحے کے لئے ہاتھ آگے کر رکھا ہے۔ میرا خیال ہے سالار کا رتبہ اتنا اونچا نہیں کہ وہ سلطان کے ہاتھ کو یوں نظر انداز کر دے"۔

"ٹھیک فرمایا محترم وزیرِ اعظم!" — قزل ساروق نے کہا — "لیکن آپ کا یہ سالار اس قابل نہیں رہا کہ سلطانِ عالی مقام کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے"۔

"کیوں؟" — سلطان ملک شاہ نے اپنا ہاتھ پیچھے کرتے ہوئے پوچھا — "کیا ہم غلط سمجھ رہے ہیں کہ تم فاتح لوٹے ہو؟..... سلجوق سالار شکست سے ناآشنا ہوتا ہے"۔

"سلطانِ محترم" — سالار قزل ساروق نے کہا — "میری فتح یہی ہے کہ میں پورے دستے کو زندہ لے آیا ہوں۔ صرف دو سوار ضائع ہوئے ہیں لیکن یہ فتح حسن بن صباح کی ہے کہ ہم لڑے بغیر واپس آگئے ہیں۔ اگر وہ ہم پر حملہ کر دیتا تو ہم میں سے کوئی بھی زندہ واپس نہ آتا..... کیا سلطانِ محترم اجازت دیں گے کہ آرام سے بیٹھ کر پورا واقعہ سناؤں؟"

ایک ہزار سواروں کا لشکر جس میں سے صرف دو آدمی کم ہوئے تھے، ان کے قریب سے گزر تا جا رہا تھا۔ سلطان ملک شاہ سواروں کے چہرے دیکھ رہا تھا۔ ہر چہرہ سپاٹ تھا۔ یہ ماتمی جلوس لگتا تھا۔

"ہمارے ساتھ آؤ" — سلطان ملک شاہ نے کہا۔

سلطان کے ہاں جا کر سالار قزل ساروق نے سلطان اور نظام الملک کو تمام واقعہ من و عن سنا دیا۔ کچھ بھی نہ چھپایا۔

"اس قدیم قلعے کی دیوار سے دو تیر آئے" — سالار قزل ساروق نے کہا — "اور میرے دو سوار مارے گئے۔ میں بہت حیران ہوا کہ ان تیر اندازوں نے ان سواروں کو کیوں مار ڈالا ہے۔ دیوار پر ایک اور آدمی کھڑا تھا۔ وہ حسن بن صباح تھا لیکن اس وقت وہ کوئی اور لگ رہا تھا۔ اس نے پوچھا تم یہاں کیوں آئے ہو؟ میں نے اپنے ساتھیوں سے پوچھا ہم یہاں کیوں آئے ہیں۔ حسن بن صباح نے کہا یہاں سے چلے جاؤ....."

"اور تم واپس چلے آئے" — سلطان ملک شاہ نے کہا۔

"ہاں سلطانِ محترم!" — قزل ساروق نے کہا — "میں کچھ نہیں سمجھ سکا" — اس کے آنسو بہہ نکلے۔

"کیا آپ کو یاد ہے وہاں اور کیا کچھ ہوا تھا؟" — نظام الملک نے پوچھا۔

"یاد ہے" — قزل ساروق نے رندھی ہوئی آواز میں کہا — "سب کچھ یاد ہے بلند خواب کی طرح!"

"وضاحت کرو ساروق!" — سلطان ملک شاہ نے کہا — "ہم جاننا چاہتے ہیں یہ کیا ہوا تھا۔ یہ بتاؤ کہ واپسی سفر کے دوران تم اپنے آپ میں آئے تو تم نے یہ نہیں سوچا تھا کہ واپس جا کر قلعے پر حملہ کر دو؟"

"سوچا تھا سلطانِ عالی مقام!" — قزل ساروق نے جواب دیا — "اپنے ساتھی کمانداروں کے ساتھ صلاح مشورہ کیا تو سب نے کہا کہ واپس جانا بیکار ہے۔ جس طرح باطنی تبریز میں سالار امیر ارسلان اور اس کے پانچ سو سواروں کو قتل کر کے آگے نکل گئے تھے، اسی طرح ان کھنڈروں سے نکل کر کہیں اور چلے گئے ہوں گے۔ حقیقت یہ ہے سلطانِ محترم! مجھے ایسا صدمہ ہوا کہ میں کچھ بھی فیصلہ نہ کر سکا۔ میں نے جو لڑائیاں لڑی ہیں وہ آپ کو یاد ہوں گی۔ میں خود بھی نہیں گن سکتا کہ میرے جسم پر کتنے زخموں کے نشان ہیں۔ سلطنتِ سلجوقیہ کی بنیادوں میں میرا اتنا زیادہ خون رچا بسا ہوا ہے کہ آج آپ بھی اس کی بو سونگھ سکتے ہیں۔ کیا کوئی مان سکتا ہے کہ میں ڈر کر بغیر لڑے واپس آگیا ہوں؟"

"تم پر کوئی الزام نہیں ساروق!" — نظام الملک نے کہا — "تمہارے اور تمہارے لشکر کے ہوش و حواس ان کھجوروں نے گم کئے تھے جو تم کئی منزل کی مسافت سے کھا گئے تھے اور تم سب کی سوچنے کی صلاحیت اس پانی نے سلب کی تھی جسے تم آبِ زم زم سمجھے تھے"۔

"خواجہ طوسی!" — سلطان ملک شاہ نے کہا — "فوج کے لئے آج حکم جاری کر دو کہ باہر جا کر کوئی فوجی، وہ سالار ہے یا سپاہی، کسی اجنبی کے ہاتھ سے کوئی چیز نہیں کھائے گا، نہ کسی بھی قسم کا مشروب پئے گا، نہ پانی..... قزل ساروق! تم اچھے میں آگئے تھے۔ جاؤ، آرام کرو۔ اپنے تمام لشکر سے کہہ دینا کہ تم پر کوئی الزام نہیں..... اور تمام سواروں کو بتا دینا کہ تمہیں کھجوروں اور پانی میں کوئی ایسا نشہ پلایا گیا تھا جس نے تمہاری عقل اور جذبے کو سُلا دیا تھا۔ انہیں یہ بتانا اس لئے ضروری ہے کہ وہ اس وہم میں مبتلا نہ ہو جائیں کہ حسن بن صباح کے پاس کوئی ایسی طاقت ہے جس سے وہ دشمن کی پوری

فوج کو ذہنی طور پر مفلوج کر دیتا ہے"۔

"لشکر کے متعلق تو میں نے بتایا ہی نہیں" — قزل ساروق نے کہا — "میں نے اور میرے ماتحت کمانداروں نے سواروں کو یہ بتایا تھا لیکن مجھے بتایا گیا ہے کہ کئی ایک سوار اس وہم کو قبول کر چکے ہیں کہ حسن بن صباح کو خدا نے ایسی روحانی طاقت دی ہے کہ وہ اپنے جس دشمن کی طرف دیکھتا ہے وہ دشمن ہلاک ہو جاتا ہے یا ہماری طرح حسن بن صباح کی طرف پیٹھ کر کے وہاں سے غائب ہو جاتا ہے...... یہ سب سوار میرے ساتھ آ گئے ہیں لیکن ان کے دلوں میں وہم موجود ہے"۔

"ہم اس کا انتظام بھی کر لیں گے" — سلطان ملک شاہ نے کہا — "تم جاؤ"۔

"میں آپ کا ممنون ہوں سلطانِ عالی مقام!" — قزل ساروق نے کہا — "آپ نے میری خطا معاف کی، لیکن میں اپنے آپ کو معاف نہیں کر سکتا۔ میں اس دھوکے کا انتقام لوں گا، میں گناہ کا کفارہ ادا کروں گا"۔

"میں تمہارے جذبات کو سمجھتا ہوں ساروق!" — سلطان ملک شاہ نے کہا — "لیکن تم نے وہ دشمن دیکھ لیا ہے جس سے تم انتقام لینا چاہتے ہو۔ یہ آمنے سامنے آ کر لڑنے والا دشمن نہیں۔ اس کے لئے ہمیں کوئی اور طریقہ سوچنا پڑے گا۔ اللہ کا شکر ادا کرو کہ تم جو تجربہ کار سالار ہو، اپنے منتخب سواروں کے ساتھ زندہ واپس آ گئے ہو، امیر ارسلان کی طرح تمام سواروں کے ساتھ مارے نہیں گئے۔ اس دشمن کی سرکوبی میرا فرض ہے، اور اس فرض کی ادائیگی جہاد ہے۔ حسن بن صباح اور احمد بن عطاش نے اسلام کے نام پر ایک اور فرقہ بنا لیا ہے اور لوگ دھڑا دھڑ اس فرقے میں شامل ہو رہے ہیں"۔

سالار قزل ساروق وہاں سے چلا تو گیا لیکن اس کے چہرے پر ایسے تاثرات تھے جیسے وہ سلطان ملک شاہ اور اس کے وزیر اعظم نظام الملک کی باتوں سے مطمئن نہ ہوا ہو۔ اس کا سوار دستہ اپنے ٹھکانے پر پہنچ کر گھوڑے کھول چکا تھا۔ ہر سوار کو آٹھ دس فوجیوں نے گھیر لیا اور ان سے سن رہے تھے کہ وہ کیا کر کے آئے ہیں۔

○

"آپ نے کیا سوچا ہے خواجہ؟" — سلطان ملک شاہ نے نظام الملک سے پوچھا۔

"ہمارے پاس فوج ہے" — نظام الملک نے کہا — "باطنیوں کی کوئی فوج نہیں

لیکن ہم نے ان پر دوبارہ حملہ کر کے کیا حاصل کیا ہے؟ ہمارے ایک سالار اور پانچ سو سواروں کو کس نے قتل کیا ہے؟...... ان لوگوں نے جن پر حسن بن صباح نے اپنی عقیدت مندی کا جنون طاری کر رکھا ہے۔ انہوں نے اپنی جانیں اس شخص کے لئے وقف کر رکھی ہیں۔ دوسرے حملے کا انجام دیکھ لیں۔ اس نے ہمیں یہ سبق دیا ہے کہ یہ شخص جس کا نام حسن بن صباح ہے، اپنے مریدوں اور اندھی عقیدت رکھنے والے پیروکاروں سے ہماری فوج کو خون میں نہلا سکتا ہے، جس طرح اس نے سالار قزل ساروق اور اس کے دستے کو بیکار کیا ہے"۔

"لیکن خواجہ!" — سلطان ملک شاہ نے کہا — "میں آپ کا یہ مشورہ تو نہیں مانوں گا کہ حسن بن صباح کو ہم بھول جائیں"۔

"میں ایسا مشورہ دوں گا بھی نہیں عالی مقام!" — نظام الملک نے کہا — "میں نے عہد کر رکھا ہے کہ حسن بن صباح کو گرفتار کر کے اسے جلاد کے حوالے کر دوں گا"۔

"گرفتار کیسے کریں گے؟"

"ابھی اس سوال کا جواب نہیں دے سکوں گا" — نظام الملک نے جواب دیا — "ابھی یہی کہوں گا کہ ضروری نہیں حسن بن صباح کی سرکوبی کے لئے فوج ہی استعمال کی جائے گی۔ میں ادھر سے غافل نہیں عالی جاہ! میں نے جاسوس بھیج رکھے ہیں۔ اب تک مجھے جو اطلاعیں ملی ہیں، ان سے بڑی بھدی اور خطرناک تصویر سامنے آتی ہے۔ یہ آپ کو پہلے ہی معلوم ہے کہ حسن بن صباح ان علاقوں کا بے تاج بادشاہ بن چکا ہے اور وہ لوگوں کے دلوں پر حکومت کرتا ہے اور اس کی مقبولیت بڑی تیزی سے بڑھتی جا رہی ہے"۔

"خواجہ حسن طوسی!" — سلطان ملک شاہ نے یوں کہا جیسے اچانک بیدار ہو گیا ہو — "ہم نے کوئی علاقہ اور کوئی ملک فتح نہیں کرنا۔ آپ کہتے ہیں کہ حسن بن صباح لوگوں کے دلوں پر حکومت کرتا ہے۔ ہم نے لوگوں کے دلوں کو باطل اور ابلیسیت سے آزاد کرنا ہے، اور یہ مہم تبلیغ سے سر نہیں ہو گی۔ یہ مبلغوں کا نہیں یہ مجاہدین کا کام ہے...... آپ کو ہماری سلطنت کی تاریخ تو معلوم ہی ہے خواجہ! آلِ سلجوق اسلام قبول کر کے یہ سلطنت قائم نہ کرتے تو اسلام کی بنیادیں ہل چکی ہوتیں اور اللہ کا یہ دین بڑا پرانا قصہ بن چکا ہوتا۔ پہلا دفاع اپنے دین کا پھر اپنی سلطنت کا۔ دین قائم و دائم ہے تو ہم سب

قائم ہیں۔ جس کا دین اور ایمان ہی نہ رہے اُس کی نگاہوں میں آزادی اور غلامی میں کوئی فرق نہیں رہتا...... اسلام کو سامنے رکھو۔ یہ جو کچھ ہو رہا ہے' اسلام کی بیخ کنی کے لئے ہو رہا ہے"۔

"سلطانِ عالی مقام!" — نظام الملک نے کہا — "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیش گوئی پوری ہو رہی ہے۔ آپؐ نے فرمایا تھا کہ میرے بعد میری اُمت فرقوں میں بٹ جائے گی..... اسلام کی بیخ کنی تو یہ فرقہ بندی کر رہی ہے"۔

"باتوں کا وقت نہیں رہا خواجہ!" — سلطان ملک شاہ نے کہا — "اب ہمیں کچھ کرنا ہو گا"۔

"سلطانِ معظم!" — نظام الملک نے کہا — "صرف دو آدمیوں کو رُوئے زمین سے اٹھا دیا جائے تو یہ فتنہ اپنے آپ ہی ختم ہو جائے گا"۔

"حسن بن صباح اور احمد بن عطاش کو!" — ملک شاہ نے کہا — "یہ میں سوچ چکا ہوں۔ کرنا یہی پڑے گا"۔

"لیکن یہ کام آسان نہیں" — نظام الملک نے کہا — "پھر بھی میں اس کا انتظام کروں گا..... یہ انتظام کرنا پڑے گا"۔

○

سلجوقی سلطان ملک شاہ اور اُس کے وزیرِ اعظم خواجہ حسن طوسی کا جذبہ قابلِ قدر تھا۔ ملک شاہ تو انتقام کی آگ میں جلنے لگا تھا۔ اُس کی جگہ کوئی اور ہوتا تو سلطانی یا بادشاہی کے نشے میں لاؤ لشکر لے کر چڑھ دوڑتا اور نقصان اٹھاتا۔ سلطان ملک شاہ دانشمند تھا اور ہر طرح کی صورتِ حال میں ہوش و حواس قائم رکھتا تھا۔ نظام الملک اس سے زیادہ دانشمند اور دُور اندیش تھا۔

نظام الملک نے کچھ عرصے سے ان علاقوں میں جاسوس بھیج رکھے تھے جن علاقوں میں لوگ حسن بن صباح کے مرید اور پیروکار ہو گئے تھے بلکہ بعض لوگوں نے اسے امام کی بجائے پیغمبر سمجھنا شروع کر دیا تھا۔ ان جاسوسوں میں سے کوئی نہ کوئی آتا اور اپنے مشاہدات بیان کر جاتا تھا۔ ان کا لُبِ لباب یہی ہوتا تھا کہ باطنیوں کا ایک گروہ سارے علاقوں میں پھیلا ہوا حسن بن صباح کے معجزے اور کرامات بیان کرتا ہے۔

یہ رپورٹ تو ہر جاسوس دیتا تھا کہ یہ لوگ اسلام کے حوالے سے بات کرتے ہیں

اپنے آپ کو صحیح العقیدہ مسلمان کہتے ہیں۔

"تلبیسِ ابلیس" اور "آئینۂ تلبیس" میں بھی یہی آیا ہے کہ حسن بن صباح کے پیروکاروں کو شک تک نہ ہوتا تھا کہ جسے وہ امام اور نبی مانتے ہیں وہ باطنی ہے۔ اس کے مبلغ بڑے ہی دردناک انداز میں لوگوں کو اس قسم کی حکایتیں سناتے تھے کہ کفار نے رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر کیا کیا ظلم کیے اور کیسے کیسے ستم ڈھائے اور صحابۂ کرام نے اور رسالتؐ کے دوسرے شیدائیوں نے کس طرح ناموسِ رسالتؐ پر جانیں قربان کی تھیں۔

مؤرخوں نے لکھا ہے کہ ان علاقوں میں غالب اکثریت مسلمانوں کی تھی اور یہ لوگ علم اور تعلیم سے بے بہرہ تھے اور اسلام کے معاملے میں بہت ہی جذباتی۔ انہیں رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر یہود و نصاریٰ کے ظلم و ستم اشتعال انگیز الفاظ اور دردناک لہجے میں سناتے تھے کہ لوگ بھڑک اٹھتے تھے۔ ظلم و ستم کی ان حکایتوں میں زیادہ تر من گھڑت ہوتی تھیں۔

یوں لوگوں کو مشتعل کر کے انہیں بتایا جاتا کہ حسن بن صباح وہ اسلام لے کر آسمان سے اُترا ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لے کر آئے تھے اور کفار نے سازش کے تحت اس کی روح بدل ڈالی اور چہرہ بگاڑ دیا ہے' اور اب حسن بن صباح پر کفار ہی نہیں بلکہ بگڑے ہوئے نظریات اور غلط عقیدوں کو صحیح ماننے والے مسلمان بھی حسن بن صباح اور اس کے معاون ساتھیوں پر ظلم و تشدد کر رہے ہیں۔

نظام الملک کے جاسوس اسی قسم کی خبریں دے کر پھر چلے جاتے تھے۔ تین چار جاسوس تو وہیں جا کر آباد ہو گئے تھے۔ وہ معلومات اور خبریں اکٹھی کرتے رہتے' اپنے ساتھی جاسوسوں کو دیتے اور یہ جاسوس باری باری خبریں مرو پہنچاتے رہتے تھے۔

"میرے دوستو!" — ایک بار نظام الملک نے اُدھر سے آئے ہوئے دو جاسوسوں سے کہا تھا — "آج تک تم جتنی خبریں لائے ہو ان میں کوئی نئی بات نہیں تھی۔ میں جانتا ہوں کہ وہاں درپردہ کیا ہوتا ہے۔ میں اتنا ہی جانتا ہوں کہ کسی نشے اور بڑی ہی خوبصورت اور چنچل لڑکیوں کے ذریعے بعض اہم افراد کو وہ اپنا مرید بنا لیتے ہیں۔ ہماری ضرورت یہ ہے کہ وہاں پردوں کے پیچھے بند کمروں میں جو کچھ ہو رہا ہے وہ معلوم ہو جائے اور یہ بھی دیکھا جائے کہ حسن بن صباح اور اُس کے اُستاد احمد بن عطاش کو قتل

کس طرح کیا جا سکتا ہے"۔

ابھی تک کوئی جاسوس حسن بن صباح کے اندرونی حلقے میں داخل نہیں ہو سکا تھا اس لئے یہ پتا لگانا ممکن نہیں تھا کہ پردوں کے پیچھے کیا ہوتا ہے۔

○

اب نظام الملک نے ایسے جاسوسوں کی تلاش شروع کر دی جو حسن بن صباح کے اتنے قریب پہنچ جائیں کہ اُن کے خاص مصاحبوں میں شامل ہو جائیں اور اندر کی خبریں لائیں۔

داستان گو موزوں سمجھتا ہے کہ اس داستان کو واپس قدیم قلعے کے اُن کھنڈرات میں لے جائے جہاں سے حسن بن صباح نے سلجوقی سالار قزل ساروق اور اُس کے سواروں کے لشکر کو پسپا کر کے واپس بھیج دیا تھا۔ پھر کیا حسن بن صباح انہی کھنڈرات میں بیٹھا رہا تھا؟

نہیں..... رات اُس کے پیروکاروں نے فتح کا جشن منایا اور اگلی صبح وہاں سے اُس سمت کوچ کر گیا تھا جس طرف مشہور تاریخی قلعہ الموت تھا۔ اُس کی اور اس کے پیرو مرشد کی نظریں اس قلعے پر لگی ہوئی تھیں۔ حسن بن صباح کی منزل یہی قلعہ تھا۔ اُسے اس نے اپنا مستقل اڈہ بنانا تھا' اور اسی قلعے کے اندر اور اس کے ارد گرد اُس نے اپنی جنت بنائی تھی..... وہ جنت جس نے تاریخ کو انگشت بدنداں کر دیا تھا۔ یہ جنت ایک حیران کن حقیقت تھی کہ آج کے دَور کے کچھ لوگ اسے محض ایک افسانہ اور مبالغہ کہتے ہیں۔

قلعہ الموت کے کھنڈرات آج بھی ایک وسیع و عریض ٹیکری کی بلندی پر موجود ہیں۔ ایران کے اس علاقے کو طالقان کہتے ہیں۔ یہ بلند ٹیکری شہر قزوین اور دریائے خزر کے درمیان ہے۔ یہ قلعہ یوں تعمیر ہُوا تھا کہ کسی زمانے میں اس خوبصورت خطے میں دَیلمی سلاطین کی حکمرانی تھی۔ ایک روز ایک سلطان اپنا عقاب ساتھ لے کر شکار کو گیا۔ اُس نے اُڑتے ہوئے ایک پرندے کے پیچھے عقاب چھوڑا۔ عقاب نے پرندے کو کچھ دُور جا کر پکڑ لیا لیکن پرندہ اس کے پنجوں سے نکل گیا۔ یہ اتنا زخمی تھا کہ زیادہ دُور تک اُڑ نہیں سکتا تھا۔ گرتے گرتے ٹیکری کی چوٹی پر جا گرا۔ یہ کوئی چھوٹا سا پرندہ نہیں ایک بڑا اور کیاب نسل کا پرندہ تھا۔

عقاب نے اس پر ایک بار پھر جھپٹا مارا اور اُسے وہیں دبوچ لیا۔ سلطان جو گھوڑے پر سوار تھا گھوڑا دوڑاتا ٹیکری پر چڑھ گیا۔ اس کے ساتھ اُس کے محافظ اور کچھ مصاحب تھے۔ سلطان نے پرندہ عقاب سے لے لیا اور جب ٹیکری کی اس بلندی سے چار سو نظر دوڑائی تو اُس کی تو جیسے روح بھی مخمور ہو گئی ہو۔ یہ خطہ ہریالی کی بدولت بہت ہی خوبصورت تھا۔ ایک طرف دریا تھا جس کا اپنا ہی حسن تھا۔

ٹیکری دامن سے اوپر تک گھنے درختوں اور مخمل جیسی گھاس سے ڈھکی ہوئی تھی۔ بعض درخت پھولدار تھے جن کی بھینی بھینی خوشبو خمار سا طاری کرتی تھی۔ ٹیکری کے چاروں طرف دُور دُور تک ایسا سبزہ زار تھا کہ اسے جنت نظیر ہی کہا جا سکتا تھا۔ دو جگہوں سے چشمے پھوٹتے تھے۔ دونوں جگہوں پر پچیس تیس گز چوڑی جھیلیں بنی ہوئی تھیں۔ ان کا شفاف پانی چھوٹی چھوٹی ندیوں کی شکل میں بہتا' پتھروں اور کنکریوں پر جلترنگ بجاتا دریا میں جا گرتا تھا۔ بعض جگہوں پر قریب قریب کھڑے تین تین چار چار درختوں کے تنوں کو پھولدار بیلوں نے کچھ اس طرح اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا کہ کٹیاں سی بن گئی تھیں۔ دائیں' بائیں اور پیچھے ہرے پتوں اور پھولوں کی دیواریں اور اوپر چھتیں بنی ہوئی تھیں۔ یوں لگتا تھا جیسے یہ کٹیاں انسانوں نے بیلوں کو تراش کر بنائی ہوں لیکن یہ قدرت کی مناعی کا شاہکار تھا۔ ایک یورپی مؤرخ نے لکھا ہے کہ کوئی کہے کہ یہ خطہ بہشت کا حصہ تھا اور کسی وجہ سے زمین پر آن گرا تھا یا یہ کہے کہ آدم اور حوا کو خدا نے بہشت کے اس حصے میں رکھا تھا تو میں اسے سچ مان لوں گا۔

سلطان کو اس خطے کے حُسن نے مسحُور تو کر ہی لیا تھا' اُس نے دیکھا کہ دفاعی لحاظ سے بھی یہ جگہ موزوں ہے۔ یہ ٹیکری اوپر سے نوکیلی یا گول نہیں بلکہ چپٹی تھی اور اس کا طول ایک میل سے ذرا ہی کم اور عرض بھی کچھ اتنا ہی تھا۔

"بلاشبہ میں نے اتنی دلفریب زمین آج ہی دیکھی ہے"۔ سلطان نے کہا۔ "کیا تم میں کوئی ہے جو مجھے یہ مشورہ نہ دینا چاہے کہ میں یہاں ایک ایسا قلعہ تعمیر کروں جو اس خطے جیسا دلنشیں اور چٹانوں جیسا مضبوط ہو؟"

"کوئی نہیں عالی جاہ!" ۔۔۔ مصاحبوں کی ملی جُلی آوازیں اُٹھیں ۔۔۔ "اس سے زیادہ دلفریب جگہ اور کہیں نہیں..... قلعہ جو یہاں بنے گا اس کی دیواروں اور اس کے دروازوں تک کوئی دشمن نہیں پہنچ سکے گا..... دشمن کا لشکر کتنا ہی بڑا کیوں نہ ہو' ٹیکری

پر چڑھتے ہمارے تیروں کی بوچھاڑوں سے لڑھکتا نیچے چلا جائے گا"۔

سلطان نے شکار سے واپس آکر پہلا کام یہ کیا کہ اس ٹیکری پر قلعے کی تعمیر کا حکم دیا۔ دُور دُور سے ماہر معمار بلوائے گئے۔ ان سے نقشے بنوائے گئے۔ ان میں ردّ و بدل کیا گیا' نقشے کو بڑی محنت سے آخری شکل دی۔ اس دیلمی سلطان نے نقشے میں جو نئی چیزیں شامل کیں' انہوں نے تعمیرات کے ماہرین کو حیران کر دیا۔ قلعے کی تعمیر کوئی پیچیدہ کام نہیں ہُوا کرتا تھا لیکن اس سلطان نے (جس کا تاریخ میں نام نہیں ملتا) جو نقشہ معماروں کو دیا وہ قلعہ بھی تھا' محل بھی اور رہائش جو کچھ تھا وہ پُراسرار تھا۔ اس میں تہ خانہ بھی تھا جس میں بے شمار کمرے تھے۔ ان کے آگے' پیچھے اور دائیں بائیں گلیاں تھیں جو بھول بھلیاں تھیں۔ ان میں چھوٹے کمرے تھے' بڑے بڑے بھی اور بہت بڑے بھی اور تہ خانے سے ایک سرنگ بھی نکلتی تھی۔ اسے اتنا کھلا اور اونچا رکھنا تھا کہ تین آدمی پہلو بہ پہلو اس میں سے گزر سکیں۔ سرنگ بھی بھول بھلیوں جیسی بنائی تھی۔

قلعے کی تعمیر شروع ہو گئی۔ ملک کے بے شمار معماروں کو اس کام پر لگا دیا گیا۔ ملک کی آدھی آبادی مزدوری کے لئے پہنچ گئی۔ اتنی زیادہ مخلوق چیونٹیوں کی طرح کام کرنے لگی۔

اس قلعے کا نام آلہ مُوت رکھا گیا۔ دیلمی زبان میں مُوت عقاب کو کہتے تھے اور آلہ کے معنی تربیت گاہ ہوتے تھے۔ سلطان عقاب کے پیچھے اس جگہ گیا تھا۔ اگر اس کے عقاب کا شکار اس ٹیکری پر نہ گرتا تو سلطان کبھی اس حسین ٹیکری کو نہ دیکھ سکتا نہ اسے ایسا قلعہ بنانے کا خیال آتا جو اُس دور کا ایک عجوبہ تھا اور جو بعد میں حسن بن صباح کی جنت بنا۔

اس قلعے کا نام آلہ مُوت رکھا گیا تھا جو بگڑتے بگڑتے اَلمُوت بن گیا۔

○

حسن بن صباح کے زمانے میں یہ قلعہ اپنی اصل حالت میں تھا۔ اس علاقے کا حکمران امیر جعفری تھا۔ کسی بھی مؤرخ نے اس کا پورا نام نہیں لکھا۔ امیر جعفری نے اپنی حیثیت کے ایک سرکردہ فرد مہدی علوی کو قلعہ الموت کا حاکم مقرر کر رکھا تھا۔

حسن بن صباح الموت سے تھوڑی ہی دور رُک گیا۔ اس کے ساتھ قدیم قلعے میں تین سو کے لگ بھگ آدمی تھے۔ ان سب نے اُس کے ساتھ جانا تھا لیکن ان میں سے

بہت سے آدمیوں کو پہلے ہی روانہ کر دیا گیا تھا۔ انہیں بتایا گیا تھا کہ وہ الموت کے راستے میں آنے والی آبادیوں میں جاکر لوگوں کو حسن بن صباح کے یہ معجزے سناتے جائیں کہ تبریز میں صرف ستر آدمی تھے جن پر سلجوقیوں کے پانچ سو سے زائد سواروں نے حملہ کر دیا۔ حسن بن صباح نے خدا سے مدد مانگی تو غیب سے سینکڑوں سوار آ گئے اور تمام کے تمام سلجوقی سواروں کو قتل کر دیا۔ پھر قدیم قلعے میں تین سو آدمیوں پر ایک ہزار سے زائد سواروں نے حملہ کر دیا۔ حسن بن صباح نے قلعے کی دیوار پر کھڑے ہو کر اُس گھوڑ سوار لشکر کے سالار کی طرف دیکھا پھر کہا' واپس چلے جاؤ۔ لشکر نے محاصرہ اٹھا لیا اور واپس چلا گیا۔

ان تین سو آدمیوں میں صرف تین آدمی تھے جو حقیقت سے آگاہ تھے اور ایک عورت تھی جو حسن بن صباح کی راز دار تھی۔ ان تین آدمیوں میں ایک اسماعیل تھا اور یہ عورت خدیجہ تھی۔ ان دونوں نے حج سے آئے ہوئے میاں بیوی بن کر سالار قزل ساروق اور اس کے لشکر کو "آبِ زم زم" پلایا اور ذہنی طور پر مفلوج کر دیا تھا۔

صرف یہ تین آدمی اور ایک عورت تھی جنہیں حسن بن صباح کے ان معجزوں کی حقیقت معلوم تھی' باقی سب نے ان "معجزوں" کو حقیقت تسلیم کر لیا تھا۔ انہیں یہ بتانے کی ضرورت نہیں تھی کہ وہ ان "معجزوں" کی تشہیر کریں۔ وہ تو انہوں نے کہے بغیر بھی کرنی تھی۔ یہ انسانی فطرت کا خاصا ہے اور یہ انسان کی کمزوری ہے کہ وہ کوئی عجوبہ دیکھتا ہے یا کوئی پُراسرار واقعہ اس کے سامنے رُونما ہوتا ہے تو وہ اُس کی تہ تک نہیں پہنچتا۔ اس کا تجزیہ نہیں کرتا بلکہ اپنے آپ پر ہیجانی کیفیت طاری کر کے یہ واقعہ ہر کسی کو سنسنی خیز لہجے میں سناتا ہے اور اس وہم میں مبتلا ہو کر کہ اس کی بات کو کچھ لوگ سچ نہیں مانیں گے' سنانے والا زیب داستان کا سہارا لیتا اور مبالغہ آرائی کرتا ہے۔

حسن بن صباح کو خدا نے ایسا دماغ دیا تھا کہ وہ انسان کی کمزوریوں کو سمجھتا اور انہیں اپنے مقاصد کے لئے استعمال کرنا جانتا تھا۔ اُس نے اپنے تین سو میں سے دو سو سے زائد آدمیوں کو خود اپنی زبان سے نہیں بلکہ اپنے خاص مصاحبوں کی زبان سے کہلوایا کہ وہ آبادیوں میں امام کے معجزے سناتے جائیں۔

"یہ حکم امام کا نہیں"۔۔۔ مصاحبوں نے ان تین سو افراد سے کہا۔۔۔ "یہ ہمارا فرض ہے کہ ہر کسی کو معلوم ہو جائے کہ وہ امام جسے خدا نے ملت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو

صحیح راستہ دکھلانے کے لئے آسمان سے اتارا ہے۔ اس نے کیا معجزے دکھائے ہیں۔ لوگوں سے کہو کہ وہ امام کو خدا کا بھیجا ہوا امام مان لیں"۔

حسن بن صباح جب الموت سے تھوڑی دور رکا، اس وقت اس کے ساتھ تین سو کی بجائے تین ہزار سے زائد لوگ تھے۔ تاریخ میں یہ پتہ نہیں ملتا کہ پہاڑیوں کے اندر قدیم قلعے سے الموت تک کتنا فاصلہ تھا، البتہ یہ بات صاف ہے کہ حسن بن صباح کے آدمیوں نے اس علاقے کی آبادیوں میں "خدا کے بھیجے ہوئے امام" کے "معجزے" ایسے انداز سے سنائے کہ لوگ حسن بن صباح کے پیچھے پیچھے چل پڑے۔ حسن بن صباح نے ایک جگہ رک کر ڈیرے ڈال دیئے۔ اس کے لئے بڑے سائز کا شاہانہ خیمہ لگا دیا گیا تھا۔

تشہیر اور پروپیگنڈے کا کام صرف حسن بن صباح نے ہی نہیں کیا تھا، احمد بن خناش اس کام میں ہمہ تن مصروف رہتا تھا۔ اس نے مبلغوں کی جماعتیں بنا رکھی تھیں جس کے ارکان اسلام کے حوالے سے باطنی نظریئے کی تبلیغ کرتے تھے۔ بڑے مورخوں، خصوصاً ابن خلدون، ابوالقاسم رفیق دلاوری، ابن اثیر نے تو یوں لکھا ہے کہ وہ باطنی نظریئے کی تبلیغ کرتے تھے۔ تفصیلات لکھنے والے وقائع نگاروں اور مبصروں نے لکھا ہے کہ یہ تبلیغ دراصل تشہیر تھی حسن بن صباح کی اور لوگ جوق در جوق حسن بن صباح کی ایک جھلک دیکھنے کے لئے اکٹھے ہوتے جا رہے تھے لیکن حسن بن صباح کی جھلک انہیں نظر نہیں آرہی تھی۔

حسن بن صباح کا خیمہ کپڑے کا ایک کمرہ تھا ..... چوکور اور خاصا کشادہ ..... چاروں طرف قناتیں تھیں اور ان پر مخملی شامیانہ تھا۔ لوگوں کو یہ بتایا جا رہا تھا کہ امام خیمے میں نہیں اور اس کے قریبی مصاحبوں کو بھی معلوم نہیں کہ وہ کہاں غائب ہو گیا ہے۔

"امام کو خدا کبھی کبھی اپنے پاس بلا لیتا ہے" — ایک مصاحب نے شوشہ چھوڑا — "وہ کسی بھی وقت واپس آسکتا ہے"۔

جس جگہ حسن بن صباح کا خیمہ تھا وہاں تک کسی کو جانے کی اجازت نہیں تھی۔ اس سے ذرا پرے ہٹ کر ان کے اپنے آدمیوں کے خیمے تھے۔ لوگوں کو حسن بن صباح کے خیمے سے دور روک لیا جاتا تھا۔

○

حسن بن صباح یہاں پہنچا تھا تو تیسری رات خلجان سے اس کا پیرو مرشد احمد بن

خناش اس کے پاس آگیا تھا۔ ان کی ملاقات دو اڑھائی سال بعد ہو رہی تھی۔ احمد بن خناش نے حسن بن صباح کو مصر بھیجا تھا۔ اس کے بعد یہ دونوں پہلی بار مل رہے تھے۔ حسن بن صباح نے اپنے استاد کو اپنی کارگزاری سنائی اور استاد نے جب حسن بن صباح کو بتایا کہ اس نے قلعہ خلجان میں کیسے کیسے خفیہ انتظام کئے ہیں تو حسن بن صباح حیران رہ گیا۔

"اب قلعہ الموت پر قبضہ کرنا ہے" — احمد بن خناش نے کہا — "جو بظاہر ناممکن نظر آتا ہے۔ امیر مہدی علوی کے پاس تین سو سواروں کا صرف ایک دستہ ہے۔ یہ اس کا محافظ دستہ ہے۔ اس کی فوج ہے ہی نہیں"۔

"پھر تو اس قلعے پر قبضہ کرلینا کوئی مشکل نہیں" — حسن بن صباح نے کہا — "میرے پاس تین سو سے کچھ زائد تجربہ کار لڑنے والے آدمی ہیں ..... اور یہ جو میری زیارت کے لئے ہجوم آگیا ہے، کئی سو اس میں لڑنے والے مل جائیں گے"۔

"نہیں حسن!" — احمد بن خناش نے کہا — "میں حیران ہوں کہ یہ بات تم کہہ رہے ہو۔ کیا ہم نے پہلے جو قلعے لئے ہیں وہ لڑ کر لئے ہیں؟ ..... خون کا ایک قطرہ نہیں بہے گا اور الموت ہمارا ہو گا ..... سنو، ہم کیا کریں گے"۔

احمد بن خناش اور حسن بن صباح کی باتیں سرگوشیوں میں بدل گئیں۔ سرگوشیاں بھی ایسی جو خیمے کی کپڑے کی دیواریں بھی نہ سن سکیں۔ احمد بن خناش سحری کے وقت خیمے سے نکلا اور خلجان کو چلا گیا۔

تین چار راتیں گزر گئیں۔ "اللہ کے امام" اور اس کے "معجزوں" کے چرچے اتنے زیادہ اور ایسے انداز سے کئے جا رہے تھے کہ تجسس اور پسماندگی کے ہاتھوں مجبور ہو کر لوگ حسن بن صباح کی زیارت کے لئے چلے آرہے تھے۔ داستان گو سنا چکا ہے کہ پہلے بھی لوگوں نے سنا تھا کہ خدا کا ایلچی آسمان سے اترنے والا ہے تو لوگ اسی طرح اکٹھے ہو گئے تھے اور انہوں نے وہیں ڈیرے ڈال دیئے تھے۔ لوگوں کی فطرت میں کوئی انقلاب تو نہیں آگیا تھا۔ ان میں فطری کمزوریاں جوں کی توں موجود تھیں۔ اب وہ اس جگہ ہجوم کر کے آگئے تھے۔

یہاں اس حقیقت کا بیان بے محل نہ ہوگا کہ امت کے ہاتھوں سے اسلام کا دامن چھوٹ گیا تھا اور اسلامی عقائد کی شکست و ریخت ہو رہی تھی۔ خلفائے راشدین کے

دَور میں اُمتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ کی رسّی مضبوطی سے پکڑے رکھی اور فاتح اور کامران رہے' پھر قرآن کی نافرمانی کرتے ہوئے قیادت' اقتدار اور دوسروں پر برتری حاصل کرنے والے ہوس کار سرداروں اور دین کے نام نہاد عالموں نے اپنے اپنے نظریات اور اپنے اپنے عقیدے وضع کرنے شروع کر دیئے' آیاتِ قرآنی کی تفسیریں بدل ڈالیں اور اُمت کو فرقوں میں بانٹ دیا۔

حسن بن صباح کے ابتدائی دَور تک مسلمان چھ بڑے فرقوں میں بٹ چکے تھے اور ہر فرقے کی بارہ بارہ شاخیں بن چکی تھیں' یعنی ہر فرقہ فرقوں میں بٹ گیا تھا اور یوں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی پیش گوئی کے مطابق اُمت 72 فرقوں میں تقسیم ہو چکی تھی۔

عبداللہ بن مسعودؓ راوی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے دستِ مبارک سے ایک سیدھی لکیر کھینچی اور فرمایا کہ یہ اللہ تعالیٰ کی راہِ مستقیم ہے' پھر آنحضورؐ نے اس لکیر کے دائیں بائیں اس طرح لکیریں کھینچیں جیسے درخت سے شاخیں نکلی ہیں اور فرمایا یہ سب راہیں ٹیڑھی ہیں اور ان میں کوئی ایک بھی راہ ایسی نہیں جس پر ایک شیطان موجود نہ ہو۔ یہ شیطان اپنی اپنی راہ پر بلاتے ہیں۔ پھر آپؐ نے یہ آیت پڑھی — "بے شک یہی میری (اللہ کی) راہ سیدھی ہے۔ تم اس پر چلو' دوسری راہوں پر نہ چلنا ورنہ وہ (شیطان) تمہیں میری راہ سے ہٹا کر تم میں تفرقہ ڈال دے گا"۔

ابو داؤد نے معاویہؓ بن ابی سفیانؓ کے حوالے سے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کھڑے ہو کر فرمایا' خبردار ہو جاؤ' اہلِ کتاب جو تم سے پہلے تھے وہ 72 فرقوں میں بانٹے گئے تھے' اور میری امت عنقریب 73 فرقوں میں تقسیم ہو جائے گی۔ ان میں سے 72 جہنم میں جائیں گے اور صرف ایک جنت میں جائے گا۔

داستان گو نے فرقوں کا ذکر اس لئے کیا ہے کہ جب مسلمان اللہ کی اُس سیدھی پر چلتے رہے جو اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے دکھائی تھی تو وہ روحانی طور پر مطمئن اور مسرور رہے اور اللہ کی حکمرانی کرۂ ارض پر پھیلتی چلی گئی مگر جب فرقوں میں بٹ گئے تو وہ اپنی فطرت میں بے اطمینانی' تشنگی اور خلاء سا محسوس کرنے لگے۔ وہ صاف محسوس کرنے لگے کہ وہ بھٹک گئے ہیں۔ ان کی ذہنی کیفیت یہ تھی جیسے — "یہ دَور اپنے ابراہیم کی تلاش میں ہے" — ان کے کانوں میں آواز پڑتی کہ فلاں جگہ ایک بزرگ آیا ہے جو

غیب کی باتیں سناتا ہے' یا یہ کہ فلاں جگہ ایک بزرگ کا ظہور ہُوا ہے اور یہ اُس کی کرامات ہیں تو لوگ کوسوں کی مسافت طے کر کے وہاں پہنچتے اور اُس بزرگ کے آگے سجدے کرتے تھے۔

یہ کیفیت مسلمان معاشرے میں شدت اختیار کرتی گئی جس نے آگے چل کر پیر پرستی' مزار پرستی اور خانقاہی نظام کی صورت اختیار کر لی۔ مملکتِ خداداد کے ملکی معاشرے کے بعض دُور افتادہ علاقوں میں یہ رواج مذہبی رنگ اختیار کئے ہوئے ہے کہ کوئی مشکل یا مصیبت آ پڑے تو لوگ خدا سے مدد مانگنے کی بجائے اپنے اپنے پیر کے آستانوں کی دہلیزوں پر اور اُن کے مرے ہوئے باپوں کے مزاروں پر جا سجدے کرتے ہیں۔ ان کی زبان پر یااللہ کی بجائے یادستگیر کا وِرد ہوتا ہے۔

○

داستان گو کہہ رہا تھا کہ لوگوں نے حسن بن صباح کی زیارت کے لئے وہیں ڈیرے ڈال دیئے تھے۔ احمد بن عطاش حسن بن صباح سے مل کر اور کوئی نیا منصوبہ تیار کر کے چلا گیا۔ تاریخ میں ایک شہادت یہ بھی ملتی ہے کہ احمد بن عطاش گیا نہیں تھا' وہیں رُوپوش رہا تھا۔ اس منصوبے میں اُسے پسِ منظر میں رکھنا تھا۔

ایک رات آدھی گزر گئی تھی۔ رات کے سناٹے کو تین چار دھماکہ نما آوازوں نے تہ وبالا کر ڈالا۔

"وہ دیکھو..... لوگو..... اُدھر دیکھو"۔

"زمین سے بادل اُٹھ رہے ہیں"۔

"لوگو' جاگو..... بادلوں کے رنگ دیکھو"۔

"یہ ضرور امام کا ظہور ہو رہا ہے"۔

پھر ایک ہڑبونگ تھی' ایک شور تھا' بھاگ دوڑ تھی' نفسا نفسی جیسی حالت تھی' لوگ دھکے دے رہے تھے' دھکے کھا رہے تھے اور اُس طرف دوڑے جا رہے تھے جدھر زمین سے بادل اُٹھ رہا تھا۔

وہ ہری سرسبز گھاس اور جھاڑیوں سے ڈھکی ہوئی ایک ٹیکری تھی جو زیادہ اونچی نہیں تھی۔ پندرہ نہیں تو سترہ ہاتھ اونچی ہو گی۔ اس کی لمبائی اڑھائی تین فرلانگ تھی۔ اُس کی ڈھلان پر اور اوپر بھی ایک دوسرے سے کچھ دُور دُور چھاتوں کی طرح پھیلے ہوئے

اور لمبوترے بھی' درخت تھے۔

اس ٹیکری کے پیچھے ایک اور ٹیکری تھی جو اگلی ٹیکری سے زیادہ بلند تھی۔ ان کے دامن آپس میں ملے ہوئے تھے۔

لوگوں نے زمین سے اٹھتا ہوا جو بادل دیکھا تھا بلکہ دیکھ رہے تھے' وہ آگے والی کم بلند ٹیکری کے عقب سے اٹھ رہا تھا۔ یہ آگ کے دھوئیں کا بادل نہیں تھا۔ یہ بادل بادلوں کے اُن ٹکڑوں جیسا تھا جو برسات کے بعد سرسبز پہاڑیوں سے نیچے آجاتے اور وادیوں میں منڈلاتے رہتے ہیں۔

وہ رات تھی اور رات تاریک تھی لیکن بادل کا یہ دودھ جیسا سفید اور بہت بڑا ٹکڑا روشن تھا اور صاف نظر آ رہا تھا۔ یہی نہیں بلکہ اس میں سرخ' سبز' نیلی اور پیلی روشنیاں تیر رہی تھیں۔ یوں لگتا تھا جیسے قوس و قزح کے رنگ بکھر کر اٹکھیلیاں کرتے پھر رہے ہوں۔

بادل ٹیکری پر آگیا اور آہستہ آہستہ فضا میں تحلیل ہونے لگا اور اس میں ایک آدمی کا ہیولا نظر آنے لگا۔ اُس کے بازو دائیں بائیں پھیلے ہوئے تھے۔

"لوگو!" — بڑی ہی بلند آواز میں کسی نے اعلان کیا — "بسم اللہ پڑھو۔ کلمۂ طیبہ پڑھو اور سجدے میں چلے جاؤ۔ اللہ تبارک و تعالیٰ نے امام حسن بن صباح کو زمین پر اُتار دیا ہے"۔

"جسے دشمن کے لشکر دیکھتے ہیں اور واپس چلے جاتے ہیں اُس کا ظہور ہو گیا ہے" — کسی اور نے اعلان کیا۔

لوگ سجدے میں چلے گئے تھے۔

حسن بن صباح کے تین سو آدمیوں کے جہاں خیمے لگے ہوئے تھے وہاں سے جلتی ہوئی دس بارہ مشعلیں نکلیں جو ٹیکری پر چڑھ گئیں۔ ہوا ذرا تیز چل رہی تھی اس لئے بادل کا یہ ٹکڑا ایک طرف ہٹتا گیا اور فضا میں تحلیل ہوتے ہوتے غائب ہو گیا اور اس جگہ ٹیکری پر حسن بن صباح رہ گیا جو بازو پھیلائے کھڑا تھا۔ وہ سبز رنگ کے چمکدار چغے میں ملبوس تھا۔ سر پر پگڑی اور اس پر اتنا بڑا سبز رومال پڑا ہوا تھا جس نے کندھے بھی ڈھانپ رکھے تھے۔

"سجدے سے اٹھو لوگو!" — ایک اعلان ہُوا — "اور ٹیکری کے قریب آجاؤ"۔

لوگ اٹھ دوڑے۔ انہیں تلواروں اور برچھیوں سے مسلح کچھ آدمیوں نے ٹیکری کے قریب روک کر بیٹھ جانے کو کہا۔ دس بارہ مشعلوں کی روشنی میں لوگوں کو حسن بن صباح کا چہرہ صاف دکھائی دے رہا تھا۔

"میں آگیا ہوں" — حسن بن صباح نے بلند آواز سے کہا — "اللہ سے یہ وعدہ لے کر آیا ہوں کہ ان مسلمانوں کو جو میرے دائرے میں آجائیں گے، دنیا میں ہی جنت دکھادی جائے گی۔ میں تم سب کے گناہ بخشوا آیا ہوں"۔

"اے اللہ کی طرف سے آنے والے!" — لوگوں میں سے ایک نے پوچھا — "ہم تجھے امام کہیں' نبی کہیں....."

"میں تم میں سے ہوں" — حسن بن صباح نے کہا — "مجھے جو کہنا چاہتے ہو کہہ لو' یہ سوچ لو کہ میرے راستے پر چلو گے تو رنج و آلام سے' مشکلات اور مصائب سے' تنگ دستی اور بیماری سے محفوظ رہو گے' شیطان سے اور جنات سے محفوظ رہو گے"۔

"ہم نے تجھے مان لیا" — ایک آدمی بولا — "امام بھی' نبی بھی' کوئی معجزہ دکھا"۔

لوگوں کے ہجوم پر ایسا سناٹا طاری تھا جیسے وہاں کوئی ایک بھی انسان نہ ہو۔ یہ تقدس اور عقیدت مندی کی انتہا تھی کہ لوگ جیسے اپنی سانسوں کو بھی روکنے کی کوشش کر رہے ہوں کہ امام ناراض ہو جائے گا۔ اُن کے کانوں میں جب کسی کی آواز پڑی کہ کوئی معجزہ دکھا تو سناٹا اور گہرا ہو گیا۔

"کیا یہ معجزہ نہیں جو تم نے دیکھا ہے؟" — حسن بن صباح نے کہا — "اللہ نے مجھے جنت کے بادلوں کے ایک ٹکڑے پر سوار کر کے زمین پر اُتارا ہے۔ کیا تم نے دیکھا نہیں کہ یہ بادل قوس و قزح کے رنگوں سے سجا ہُوا تھا؟..... مجھے زمین پر اُتار کر جنت کا بادل واپس چلا گیا ہے"۔

"ہم نے دیکھا ہے" — بہت سی آوازیں اٹھیں۔

"بے شک ہم نے دیکھا ہے یا امام" — اور بھی آوازیں اٹھیں۔

حسن بن صباح کو مشعل بردار ٹیکری سے اُتار کر اُس خیمے میں لے گئے جو کپڑے کی دیواروں اور کپڑے کی چھت کا خوشنما کمرہ تھا۔ اسی خیمے میں احمد بن عطاش سے اس کی ملاقات ہوئی تھی' اور شاید احمد بن عطاش ابھی وہیں تھا۔

زیارت کے لئے آئے ہوئے ہجوم میں مختلف قبیلوں کے سردار اور دیگر سرکردہ

افراد بھی تھے۔ اگلی صبح ان لوگوں نے حسن بن صباح کی بیعت کا سلسلہ شروع کر دیا۔

○

کیا حسن بن صباح واقعی بادل کے ٹکڑے پر سوار ہو کر آسمان سے زمین پر آیا تھا؟

اس سوال کا جواب پہلے ایک باب میں دیا جا چکا ہے۔ حسن بن صباح کا پہلے بھی ایک پہاڑی پر "ظہور" ہوا تھا۔ پہاڑی کے پیچھے ایک غار میں آگ جلا کر اُس کی چمک آئینوں پر ڈالی جاتی تھی۔ ان میں آئینے بھی تھے اور چمکتی ہوئی دھات کی چادریں اور ایسی چادریں بھی تھیں جن پر ابرق چپکایا گیا تھا۔ ایک آئینہ شاہ بلوط کے درخت میں رکھا گیا تھا۔ آئینے یا چمکدار دھات کی پلیٹ سے آگ کی چمک شاہ بلوط والے آئینے پر منعکس کی جاتی تو رات کو یوں لگتا تھا جیسے شاہ بلوط میں آسمان کا ستارہ چمک رہا ہو۔ سیدھے سادے پسماندہ لوگ اسے آسمان کے ستارے کی چمک سمجھتے رہے' اور ایک روز اس شاہ بلوط کے ستارے کی چمک میں سے حسن بن صباح کا ظہور ہوا۔

اب ایک ٹیکری سے بادل اٹھا اور ٹیکری پر آیا۔ اس میں رنگ تیر رہے تھے اور اس میں سے حسن بن صباح نکلا۔ یہ بھی آگ' چمکدار دھات یا ابرق کی چادروں اور آئینوں کا کرشمہ تھا۔ ٹیکری کے پیچھے دامن میں پندرہ بیس گز لمبائی میں دہکتے انگارے پھیلائے گئے تھے اور ان پر دھواں پیدا کرنے والا بارود یا کوئی اور کیمیائی مادہ پھینکا گیا تھا جو سفید بادل کی شکل کا دھواں بن کر اوپر اٹھا۔ تاریخ میں یہ سراغ نہیں ملتا کہ یہ بارود تھا یا سفوف یا سیال مادہ تھا۔ یہ تحریر ملتی ہے کہ اُس وقت تک مسلمانوں نے بارود سازی اور کیمیاگری میں یورپ والوں کے مقابلے میں بہت زیادہ ترقی کر لی تھی۔

چونکہ وہ علاقہ جنگلاتی تھا' سبزہ زار تھا اور رات تھی اس لئے فضا میں نمی زیادہ تھی۔ نمی کی وجہ سے دھواں فوراً" اوپر نہیں اٹھا اور نہ جلدی بکھرا۔ اس میں جو رنگ تیر رہے تھے آئینوں یا دھات کی چمکدار چادروں سے اس طرح دھوئیں میں شامل کئے گئے تھے کہ ٹیکری کے پیچھے آگ جلا کر اُس کی چمک منعکس کی گئی اور آئینوں وغیرہ کے آگے باریک رنگ دار کپڑے رکھے گئے تھے۔ تاریخ میں اس سے زیادہ تشریح اور وضاحت نہیں ملتی۔ ٹیکری کے پیچھے کسی کو جانے کی اجازت نہیں تھی۔

○

قلعہ الموت وہاں سے زیادہ دور نہیں تھا۔ اُس بلندی پر جہاں قلعہ تھا' ایک شہر آباد

ہو گیا تھا۔ امیر الموت مہدی علوی کو اطلاعیں مل رہی تھیں کہ فلاں جگہ ایک قافلہ پڑاؤ کئے ہوئے ہے جس کا امیر کارواں ایک برگزیدہ شخصیت ہے۔ مہدی علوی کو اس بزرگ کے معجزے بھی سنائے گئے لیکن اس نے دھیان سے نہ سنے اور کوئی اہمیت نہ دی۔

مہدی علوی کو یہ تو پتہ ہی نہ چل سکا کہ حسن بن صباح کی تشہیر اور تبلیغ کی تیز رو تند ہوا چلی ہے جس کا گزر الموت سے بھی ہوا ہے اور اس سے اس کا محافظ دستہ بھی متاثر ہوا ہے۔ یہ انتظام احمد بن غطاش کا تھا۔ مہدی علوی کو یہ بھی معلوم نہ تھا کہ حسن بن صباح نے بادل کے ٹکڑے میں سے اپنے ظہور کا جو ڈھونگ رچایا ہے' یہ الموت کے کچھ لوگوں نے بھی دیکھا ہے اور انہوں نے اُسے برحق مانا ہے۔

"امیرِ عالی مقام!" ـــ مہدی علوی کو اس کے ایک مشیر نے پریشانی کے سے عالم میں کہا ـــ "ہم نے تو ادھر توجہ ہی نہیں دی تھی لیکن اپنے تمام لوگوں میں اور آپ کے محافظ دستے میں یہ عجیب و غریب خبر پھیل گئی ہے کہ امام حسن بن صباح بادل کے ایک ٹکڑے میں آسمان سے اُترا ہے اور لوگ دھڑا دھڑ اُس کی بیعت کر رہے ہیں"۔

"ہم یہی کر سکتے ہیں کہ اسے اپنے علاقے سے نکال دیں" ـــ مہدی علوی نے کہا ـــ "کسی مسلمان کو یقین نہیں کرنا چاہئے کہ کوئی امام یا کوئی نبی یا کوئی بزرگ آسمان سے اترا ہے۔ ہم نبوت پر یقین رکھنے والے مسلمان ہیں اور نبوت کا سلسلہ ختم ہو چکا ہے"۔

"آپ نہ مانیں" ـــ مشیر نے کہا ـــ "میں بھی نہیں مانتا لیکن یہ صورتِ حال بڑی ہی خطرناک ہے کہ لوگوں نے بھی اسے سچ مان لیا ہے اور ہمارے سپاہیوں اور سواروں نے بھی ..... امیر محترم! میں نے جو معلومات فراہم کی ہیں ان سے پتہ چلتا ہے کہ یہ کوئی نیا فرقہ بن رہا ہے۔ اسے یہیں پر ختم کر دیا جائے تو اچھا ہے"۔

ان دونوں میں کچھ دیر تبادلۂ خیالات ہوا' کچھ بحث مباحثہ ہوا' آخر مہدی علوی نے اپنا حکم سنایا۔

"پچاس سواروں کا ایک دستہ لے جاؤ" ـــ اُس نے کہا ـــ "وہاں حسن بن صباح کے مرید اور معتقد بھی ہوں گے۔ تم ساتھ جاؤ۔ حسن بن صباح سے کہنا کہ وہ تمہارے ساتھ آجائے۔ نہ آئے تو اُسے میرا حکم سنانا کہ تم زیرِ حراست ہو۔ ہو سکتا ہے اُس کے مرید اور معتقد مزاحمت کریں۔ کوشش کرنا کہ خون خرابہ نہ ہو۔ ہونے کو وہاں بہت کچھ ہو سکتا ہے اور یہ بھی ممکن ہے کچھ بھی نہ ہو۔ اگر معاملہ بگڑتا نظر آئے تو ایک سوار کو

دو ڈال دیتا۔ میں اپنا تمام دستہ بھیج دوں گا۔ میں حسن بن صباح کو اپنے سامنے دیکھنا چاہتا ہوں"۔

مہدی علوی کے حکم کی تعمیل فوری طور پر ہوئی۔ مشیر پچاس سواروں کو ساتھ لے کر چلا گیا۔ فاصلہ زیادہ نہیں تھا۔ یہ دستہ دن کے پچھلے پہر چلا تھا' رات کو حسن بن صباح کی خیمہ گاہ میں پہنچ گیا۔ وہاں اب لوگوں کا اتنا ہجوم نہیں تھا۔ انہوں نے حسن بن صباح کی زیارت کرلی تھی اور وہ چلے گئے تھے۔ پیچھے حسن بن صباح کے اپنے آدمی رہ گئے تھے۔

سواروں نے خیمہ گاہ کو گھیرے میں لے لیا۔ حسن بن صباح اپنے مصاحبوں میں بیٹھا تھا۔ اس نے گھوڑوں کے ٹاپ سنے اور چونکا۔ اس کے مصاحبوں کے چہروں پر گھبراہٹ آ گئی۔ پیشتر اس کے کہ حسن بن صباح کوئی حرکت کرتا یا کوئی حکم دیتا' مہدی علوی کا مشیر خیمے میں داخل ہوا اور جھک کر سلام کیا۔

"یا امام!" ــــ مشیر عابد حبیبی نے حسن بن صباح سے مصافحہ کر کے اور اس کے سامنے دو زانو بیٹھ کر کہا ــــ "امیرِ الموت مہدی علوی نے امام کے حضور سلام بھیجا ہے اور یہ عرض بھی کہ امام جنگل میں پڑے اچھے نہیں لگتے۔ اگر امام قلعے میں آجائیں اور کچھ دن یہاں رہ کر دیکھیں۔ اگر یہ جگہ پسند آجائے تو قلعے میں ہی رہیں"۔

"کیا دعوت نامہ رات کے اس وقت دیا جاتا ہے؟" ــــ حسن بن صباح نے عابد حبیبی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مسکراتے ہوئے کہا ــــ "اور کیا تمہارے ہاں مہمان کو محاصرے میں لے کر اسے دعوت دی جاتی ہے؟"

"امیرِ شہر نے حکم دیا کہ ابھی روانہ ہو جاؤ" ــــ عابد حبیبی نے کہا ــــ "ہم ایسے وقت روانہ ہوئے کہ یہاں بے وقت پہنچے۔ اگر آپ کے خیمے میں روشنی نہ ہوتی تو میں کل صبح آپ کے حضور حاضر ہوتا..... اور یہ سوار؟..... یہ ہمارے ہاں رواج ہے کہ مہمان کے لئے ہم گھوڑ سوار بھیجا کرتے ہیں۔ آپ کے لئے پچاس گھوڑ سوار لایا ہوں"۔

"امیرِ شہر کو میرا سلام کہنا" ــــ حسن بن صباح نے کہا ــــ "اور ان کا شکریہ ادا کرنا پھر کہنا کہ میں آؤں گا لیکن میں اپنے رواج کے مطابق آؤں گا۔ رواج یہ ہے کہ پہلے امیرِ شہر کم از کم ایک رات کے لئے مجھے میزبانی کا شرف عطا کریں گے' پھر میں ان کے ساتھ

جس نے اسماعیل کے ساتھ مل کر سالار قزل ساروق کو کامیاب دھوکہ دیا تھا۔ خدیجہ (جوان لڑکی نہیں جوان عورت تھی۔ خوبصورت تو تھی ہی' اس کی ٹریننگ ایسی ہوئی تھی کہ پتھروں کو بھی موم کرلیتی اور فرعونوں کو بھی اپنے قدموں میں جھکا لیتی تھی۔

احمد بن عطاش اس کے پاس دو اور لڑکیاں لے آیا تھا۔ انہیں قلعہ الموت پر قبضے کے لئے استعمال کرنا تھا۔ یہ بھی تربیت یافتہ اور آزمائی ہوئی لڑکیاں تھیں۔ انہیں اچھی طرح معلوم تھا کہ کس صورتِ حال میں کیا کرنا ہے۔

تیسرے دن مہدی علوی آگیا۔ حسن بن صباح نے اس کا استقبال اس طرح کیا کہ اپنے آدمیوں کو مہدی علوی کے راستے میں دو رویہ کھڑا کیا۔ ان کے ہاتھوں میں ننگی تلواریں تھیں جو اوپر کر کے ان کی نوکیں آمنے سامنے کے آدمیوں نے ملا رکھی تھیں۔ مہدی علوی ان تلواروں کے سائے میں گزر کر خیمے تک پہنچا۔ وہاں حسن بن صباح نے اس کا استقبال کیا اور جب مہمان خیمے میں داخل ہوا تو خدیجہ اور دوسری دو لڑکیوں نے اس پر پھولوں کی پتیاں نچھاور کیں۔ مہدی علوی بڑی خوشگوار حیرت میں مبتلا ہو گیا۔

"کیا وہ آپ ہی ہیں جو آسمان سے اُترے ہیں؟" ــــ کھانے کے بعد مہدی علوی نے حسن بن صباح سے پوچھا۔

"کیا آپ کو یقین نہیں آرہا؟" ــــ حسن بن صباح نے پوچھا۔

"نہیں!" ــــ مہدی علوی نے کہا ــــ "کوئی مسلمان یقین نہیں کر سکتا کہ کوئی امام یا نبی آسمان سے اترا ہو"۔

"اور کوئی مسلمان آپ کی کوئی بات یقین سے نہیں سنے گا جب تک اسے یہ یقین نہ دلائیں کہ آپ آسمان سے اُترے ہیں" ــــ حسن بن صباح نے کہا ــــ "کیا آپ نہیں جانتے کہ نبیوں اور پیغمبروں کے ساتھ لوگوں نے کیا سلوک کیا تھا؟"

"آپ کیا چاہتے ہیں؟" ــــ مہدی علوی نے پوچھا ــــ "نبوت؟..... امامت؟"

"عبادت!" ــــ حسن بن صباح نے جواب دیا ــــ "میں اللہ کی عبادت اور اس کے رسولؐ کا عشق چاہتا ہوں..... اور میں چاہتا ہوں کوئی ایک جگہ مل جائے جہاں سکون ہو' الگ تھلگ ہو اور میں عبادت میں ڈوب جاؤں۔ میرے پیر و مرشد نے مجھے بتایا ہے کہ خلوت میں مجھے ایک اشارہ ملے گا جو ویسا ہی ہو گا جس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی کا نزول ہوتا تھا۔ اس اشارے میں میری راہ اور میری منزل کا تعین ہو گا"۔

ہی الموت چل پڑوں گا"۔

عابد حبیبی کو مہدی علوی نے حکم دیا تھا کہ حسن بن صباح کو اپنے ساتھ لے آئے۔ اگر وہ نہ آئے تو اسے میرا حکم سنانا کہ تم حراست میں ہو۔ اگر اُس کے آدمی مزاحمت کریں تو جنگی کارروائی کرنا اور مدد کی ضرورت ہو تو مجھے اطلاع دینا۔ دراصل مہدی علوی کا حکم یہ تھا کہ حسن بن صباح کو گرفتار کر کے لے آنا۔

عابد حبیبی نے پہلے دوستانہ انداز اختیار کیا تھا۔ اُس نے حسن بن صباح کو ایسے انداز سے امام کہا تھا جیسے اُس نے دل کی گہرائیوں سے اسے امام تسلیم کر لیا ہو لیکن حسن بن صباح نے اُس کے ساتھ جانے کی بجائے یہ کہہ دیا کہ پہلے امیر شہر اُس کے پاس آئے تو عابد حبیبی نے یوں محسوس کیا جیسے امام نے اس کی اور اس کے امیر شہر کی عزت افزائی کی ہو۔

عابد حبیبی کا ارادہ تو یہ تھا کہ حسن بن صباح نے اس کے ساتھ جانے سے انکار کیا تو وہ اسے گرفتار کر کے اپنے ساتھ لے جائے گا لیکن وہ جان نہیں سکا تھا کہ حسن بن صباح نے اُس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالی تھیں اور اسی میں سارا راز تھا۔ عابد حبیبی اپنی آنکھوں کو حسن بن صباح کی آنکھوں سے آزاد نہیں کرا سکا تھا۔ حسن بن صباح نے اُسے ہپناٹائز کر لیا تھا۔ اس کا ذہن اب حسن بن صباح کے زیر اثر تھا۔ یہ تو ہر مؤرخ نے لکھا ہے کہ حسن بن صباح کے بولنے کا انداز ایسا تھا کہ سننے والے پر سحر کی سی کیفیت طاری ہو جاتی تھی اور اُس کا استدلال غالباً "فریب کاری پر مبنی ہوتا تھا لیکن اچھے خاصے دانشور بھی اس کے فریب میں آجاتے تھے۔

عابد حبیبی سدھائے ہوئے جانور کی طرح اٹھا اور رخصت ہو گیا۔

○

دو روز بعد الموت سے ایک گھوڑ سوار آیا۔ اُس نے حسن بن صباح کو پیغام دیا کہ امیر الموت مہدی علوی تیسرے دن آرہا ہے۔ سوار یہ پیغام دے کر چلا گیا تو حسن بن صباح نے اُس کے استقبال کی اور اس کے لئے رہائش کی تیاریاں شروع کر دیں۔ اپنا شاہانہ خیمہ مہدی علوی کے لئے چھوڑ دیا۔ اپنے آدمیوں سے کہا کہ مہدی علوی آئے تو شام کو خوشبودار پھولوں کے گلدستے خیمے میں سجا دیں۔

اُس کے پاس مہمان کے ہوش گم کرنے کا ایک ذریعہ اور بھی تھا۔ ایک تو خدیجہ تھی۔

"لیکن آپ کا یہ شاہانہ خیمہ؟" — مہدی علوی نے کہا — "اور یہ حسین و جمیل لڑکیاں اور یہ انداز عبادت کرنے والوں کے تو نہیں ہوتے"۔

"اور یہ میرے لئے ہیں بھی نہیں" — حسن بن صباح نے کہا — "میرے مریدوں اور معتقدوں میں آپ سے زیادہ اونچی حیثیت کے لوگ بھی ہیں۔ میرے لئے یہ شان و شوکت انہوں نے ہی بنائی ہے۔ میں تو چھوٹے سے ایک خیمے میں زمین پر بیٹھ کر اللہ کو یاد کرتا ہوں ...... آپ نے پوچھا ہے میں کیا چاہتا ہوں ..... میں چاہتا ہوں کہ سلطان اللہ کے حضور سجدہ ریز ہو جائیں اور اپنا وقار بحال کریں"۔

مہدی علوی کو معلوم نہیں تھا کہ وہ ایک انسان سے نہیں بلکہ ایک پُراسرار طاقت سے محو گفتگو ہے اور اُسے محسوس نہیں ہو رہا کہ مکڑی کے جالے کے تار اُس کے گرد لپٹتے جا رہے ہیں۔

"آپ کے معجزوں کی حقیقت کیا ہے؟" — مہدی علوی نے پوچھا — "تبریز میں کیا ہوا تھا؟ .... اور سلجوقیوں کے ایک ہزار سواروں کے لشکر کو آپ نے کس طرح پسپا کیا تھا؟"

"یہ آپ مجھ سے نہ سنیں" — حسن بن صباح نے کہا — "ہو سکتا ہے مجھ پر آپ مبالغہ آرائی کا شک کریں۔ یہ اُن سلجوقیوں سے پوچھیں جو میرے اتنا کہنے پر کہ واپس چلے جاؤ، وہ واپس چلے گئے تھے"۔

حسن بن صباح نے اسے اپنے یہ معجزے سنانے شروع کر دیئے۔ ایک ایک لفظ دروغ اور مبالغہ تھا لیکن سنانے کا انداز ایسا کہ مہدی علوی مسحور ہوتا چلا گیا۔ انسان کی خطرناک کمزوریوں میں سے ایک یہ بھی ہے کہ یہ جاننے کے لئے انسان ہاتھ پاؤں مارتا ہے کہ اس کا آنے والا وقت کیسا ہو گا اور اس کی قسمت میں کیا لکھا ہے اور اسے بڑا رتبہ اور خزانہ کیسے مل سکتا ہے۔

کچھ ایسی ہی بات مہدی علوی حسن بن صباح سے کر بیٹھا۔ حسن بن صباح قلعہ الموت سے واقف تھا اور یہ علاقہ تو اُسے بہت ہی پسند تھا۔ اس قلعے پر اُس نے قبضہ کرنا تھا۔ مہدی علوی کی بات سن کر حسن بن صباح نے آنکھیں بند کر لیں اور اپنے اوپر مراقبے کی کیفیت طاری کر لی۔

"کھڑا!" — حسن بن صباح نے چونک کر آنکھیں کھول دیں اور گھبرائے ہوئے

سے لہجے میں بولا ــــ ''بڑی ہی کالی گھٹا ہے جو الموت پر پھیلتی چلی جا رہی ہے۔ اس میں بجلیاں چھپی ہوئی ہیں'' ــــ اُس نے جھوٹ بولا ــــ ''میں نے آپ کا قلعہ کبھی نہیں دیکھا۔ مجھے جو نظر آ رہا ہے وہ تو بہت ہی مضبوط ہے۔ اس میں راہداریاں، تہ خانے، راستے اور چور راستے ایسے ہیں کہ کوئی اجنبی ان میں چلا جائے تو انہی میں بھٹک بھٹک کر مر جائے لیکن اتنے قیمتی قلعے اور اتنے خوبصورت شہر کے تحفظ کے لئے مجھے کوئی فوج نظر نہیں آ رہی..... کیا میں صحیح کہہ رہا ہوں یا مجھے غلط نظر آ رہا ہے؟''

مہدی علوی نے حسن بن صباح کی زبان سے اپنے قلعے کی تفصیلات سُنیں تو اس پر رعب طاری ہو گیا۔ اُس نے حسن بن صباح کو بتایا کہ اُس نے قلعے میں فوج رکھی ہی نہیں۔ صرف ایک محافظ دستہ ہے جس میں پانچ سو سوار ہیں۔

''فوج رکھیں'' ــــ حسن بن صباح نے کہا ــــ ''دشمن بڑھ رہا ہے۔ گھٹا گہری ہو رہی ہے۔ اگر آپ نے فوج رکھ لی تو یہ گھٹا جس میں بجلیاں چھپی ہوئی ہیں اُڑ جائے گی اور آپ محفوظ رہیں گے۔ فوج تجربہ کار ہونی چاہئے۔ بغیر فوج کے آپ قلعہ گنوا بیٹھیں گے''۔

مہدی علوی، حسن بن صباح کے جال میں آ گیا۔ اُس نے حسن بن صباح کے ساتھ اس مسئلے پر بات شروع کر دی کہ وہ اتنی زیادہ فوج نہیں رکھ سکتا کیونکہ وہ فوج کے اخراجات پورے کرنے کے قابل نہیں۔ حسن بن صباح اُسے ڈراتا رہا کہ اس نے فوج نہ رکھی تو کوئی نہ کوئی دشمن اپنی فوج لے آئے گا اور قلعے پر قبضہ کر لے گا۔

''حملہ آور سلجوقی بھی ہو سکتے ہیں'' ــــ حسن بن صباح نے کہا ــــ ''یہ گھٹا جو میں نے دیکھی ہے، یہ بڑا ہی خطرناک اشارہ ہے۔ میں آپ کی یہ مدد کر سکتا ہوں کہ میرے ساتھ جو آدمی ہیں، میں ان کی ایک فوج بنا سکتا ہوں۔ آپ انہیں دو وقت روٹی دے دیا کریں، ان کی تنخواہ اور دیگر اخراجات میں اپنے ذمے لے لوں گا۔ یہ میں جہاں سے بھی پورے کروں، یہ میری ذمہ داری ہو گی۔ آپ مجھے قلعے میں تھوڑی سی جگہ دے دیں جہاں میں عبادت کر سکوں اور جو لوگ میری زیارت کے لئے آئیں انہیں بٹھا کر ان کی راہنمائی کر سکوں۔ مجھے امید ہے کہ میں اپنے پیروکاروں کو مریدوں کو جو بھی حکم دوں گا وہ مانیں گے''۔

مہدی علوی حسن بن صباح کی باتوں میں آ گیا اور اُس کے ساتھ معاہدہ کر لیا۔ تاریخ

میں اس معاہدے کی تفصیلات نہیں ملتیں۔ البتہ یہ واضح ہے کہ وہ امیر الموت مہدی علوی جس نے حسن بن صباح کی گرفتاری کا حکم دیا تھا، خود اس کے فریب میں گرفتار ہو گیا اور اُس کی عقل پر ایسا پردہ پڑا کہ یہ بھی نہ سوچ سکا کہ وہ کتنا خطرناک معاہدہ کر بیٹھا ہے۔

○

اُدھر مرو میں سلطان ملک شاہ اور نظام الملک پیچ و تاب کھا رہے تھے۔ سلطان ملک شاہ تو زیادہ فوج بھیج کر بہت بڑا حملہ کرنا چاہتا تھا لیکن نظام الملک نے اُسے روک دیا اور کہا تھا کہ ایسے عقلمند اور غیر معمولی طور پر دلیر جاسوس بھیجے جائیں جو حسن بن صباح اور احمد بن عطاش کے خفیہ ٹھکانے تک پہنچ کر اندر کی خبریں لائیں تاکہ ان کے مطابق کوئی کارروائی کی جائے۔

اصل پیچ و تاب تو سالار قزل ساروق کھا رہا تھا۔ وہ اپنی بے عزتی کا انتقام لینے کو تڑپ رہا تھا۔ اُس نے سلطان ملک شاہ اور وزیر اعظم سے کئی بار کہا تھا کہ اسے جاسوسی کے لئے بھیجا جائے۔

''یہ کام سالار کا نہیں ساروق!'' ــــ آخر ایک دن سلطان نے اُسے اپنا فیصلہ سناتے ہوئے کہا تھا ــــ ''حملے کی صورت میں ہم تمہیں ہی بھیجیں گے لیکن دو تجربوں کے بعد ہم تیسرا ناکام تجربہ نہیں کریں گے''۔

''میں حسن بن صباح کو اپنے ہاتھوں قتل کرنا چاہتا ہوں'' ــــ قزل ساروق نے کہا تھا ــــ ''صرف یہ شخص قتل ہو جائے تو باطنیوں کا کھیل ختم ہو جائے گا''۔

''اس کی بجائے وہاں تم قتل ہو سکتے ہو'' ــــ نظام الملک نے کہا تھا ــــ ''اس صورت میں ہم سب کی بے عزتی ہو گی اور باطنی اور زیادہ شیر اور دلیر ہو جائیں گے''۔

مزمل آفندی صحت یاب ہو چکا تھا۔ سالار قزل ساروق جس طرح اپنے ایک ہزار سواروں کے ساتھ واپس آیا تھا، اس سے مزمل آفندی بھی واقف تھا۔ اسے وہ ملا بھی تھا اور اس کی زہر آلود باتیں بھی سنی تھیں۔ قزل ساروق نے اسے بھی بتایا تھا کہ وہ اکیلا حسن بن صباح کے قتل کے لئے جائے گا۔ مزمل نے اُسے کہا تھا کہ وہ بھی اُس کے ساتھ جائے گا۔ دونوں نے پلان تیار کر لیا تھا لیکن سلطان ملک شاہ نے قزل ساروق کو روک دیا۔ مزمل اکیلا نظام الملک سے ملا۔

"جس مقصد کے لئے آپ جاسوس بھیج رہے ہیں وہ مقصد صرف میں پورا کر سکتا ہوں" — مزمل آفندی نے کہا — "میں آپ سے صرف ایک گھوڑا یا ایک اونٹ مانگوں گا"۔

"نہیں مزمل!" — نظام الملک نے کہا تھا — "ہم تمہیں کسی خطرناک مہم پر نہیں بھیج سکتے کیونکہ تم ہمارے ملازم نہیں"۔

"عالی جاہ!" — مزمل نے کہا تھا — "اس خطرناک مہم میں وہی کامیاب ہو سکتا ہے جو ملازم نہیں ہو گا۔ یہ کام وہ شخص کرے گا جس میں جذبہ ہو گا۔ ملازم تو اپنے اہل و عیال کو روٹی کھلانے کے لئے زندہ رہنے کی کوشش کرے گا۔ میں حسن بن صباح کو اپنے دین اور اپنے عقیدے کے نام پر قتل کر دوں گا۔ اگر قتل نہ کر سکا تو ان کی پردوں کے پیچھے کی خبریں اور ان کے دلوں کے بھید لے کر آؤں گا...... یہ ایک قومی مسئلہ ہے‘ ہمارے دین کا مسئلہ ہے۔ جتنا آپ کا ہے اتنا ہی میرا ہے۔ میں آپ سے کوئی معاوضہ نہیں مانگ رہا۔ مجھے جہاد اور شہادت کے راستے سے نہ ہٹائیں"۔

نظام الملک کو ایسے ہی ایک آدمی کی تلاش تھی۔ وہ مزمل آفندی کے دو کارنامے دیکھ چکا تھا۔ شمونہ کی ماں میمونہ کو حسن بن صباح کے قبضے سے آزاد کرا لایا تھا۔ داستان گو سنا چکا ہے کہ حسن بن صباح نے میمونہ کے خاوند کو ایسے طریقے سے قتل کروایا تھا کہ میمونہ کو ذرا سا بھی شبہ نہیں ہوا تھا۔ یہ مزمل آفندی کا جذبۂ ایثار تھا کہ وہ جان کی بازی لگا کر میمونہ کو حسن بن صباح کے بڑے ہی خطرناک اور ابلیسی فریب سے نکال لایا اور رے لا کر ابو مسلم رازی کے گھر پہنچا دیا تھا۔ معجزے جیسا اتفاق یہ ہوا کہ وہاں شمونہ کی بیٹی میمونہ مل گئی جو بچپن میں اغوا ہوئی تھی۔

مزمل آفندی کا دوسرا کارنامہ بھی کم قابلِ قدر نہ تھا۔ اس نے سلطان ملک شاہ کو بتایا تھا کہ حسن بن صباح ایک قافلے کے ساتھ اصفہان جا رہا ہے۔ سلطان ملک شاہ نے پانچ سو سوار بھیجے جن کی راہنمائی مزمل آفندی نے کی تھی‘ پھر تبریز کی لڑائی میں مزمل اس لڑائی میں اتنا زیادہ زخمی ہوا تھا کہ اس کا زندہ رہنا مشکوک تھا لیکن وہ اتنی دور سے اس حالت میں مرو سلطان ملک شاہ کے پاس پہنچا تھا کہ طبیب اور جراح دیکھ کر حیران رہ گئے تھے کہ یہ زندہ کیسے رہا۔

اب یہ مزمل آفندی ایک بار پھر اپنی جان کی بازی لگا رہا تھا۔ نظام الملک اُسے سلطان

شاہ کے پاس لے گیا۔ سلطان نے اُسے اجازت دے دی۔

مزمل آفندی اس علاقے میں جانے کی تیاری کر رہا تھا کہ اچانک شمونہ اپنی ماں کے ساتھ رے سے آ گئیں۔ یہ دونوں رے میں ابو مسلم رازی کے ساتھ رہتی تھیں۔ وہاں جس روز اطلاع پہنچی تھی کہ مزمل شدید زخمی حالت میں مرو آیا ہے‘ اس روز سے شمونہ اس کے پاس پہنچنے کو تڑپ رہی تھی لیکن کسی مصلحت کی بنا پر اسے مزمل کے پاس نہیں جانے دیا جا رہا تھا۔ اب مزمل کی صحت یابی کی اطلاع ملی تو ابو مسلم رازی نے ایک پالکی بند کروا کر ماں بیٹی کو مرو بھیج دیا۔ محافظ دستے کے چند ایک سوار ساتھ بھیجے تھے۔

شمونہ پر مزمل کی محبت کا پاگل پن سوار تھا۔ وہ مزمل کو اتنی لمبی جدائی کے بعد دیکھ رہی تھی۔ اس کی جذباتی حالت اُس ماں جیسی تھی جسے اپنا گمشدہ بچہ خلافِ توقع مل گیا ہو۔ وہ اس کے زخموں کے نشان چوم رہی تھی۔

"میں پھر جا رہا ہوں شمونہ!" — مزمل نے کہا۔

"کہاں؟"

"تمہاری اور تمہاری ماں کی عصمت کا انتقام لینے!" — مزمل آفندی نے کہا اور اسے بتایا کہ اُس کا مشن کیا ہے۔

"میں بھی تمہارے ساتھ جاؤں گی" — شمونہ نے بے تکلفی سے کہا۔

"میرے لئے مشکل پیدا نہ کرو شمونہ!" — مزمل نے کہا — "تم حسن بن صباح کی دنیا سے بھاگی ہوئی ہو۔ وہاں فوراً پہچانی جاؤ گی"۔

"تم حسن بن صباح کی دنیا سے واقف نہیں مزمل؟" — شمونہ نے کہا — "میں کوئی بھیس بدل لوں گی اور تمہاری راہنمائی کروں گی"۔

اس نے اتنی ضد کی کہ نظام الملک کو اطلاع دی گئی۔ اس نے شمونہ سے کہا کہ ہم مسلمان ہیں اور مسلمان اپنی بیٹیوں کو نہ میدان میں اتارا کرتے ہیں نہ انہیں جاسوسی کے لئے استعمال کیا کرتے ہیں۔

"پھر ایک بات سن لو مزمل!" — شمونہ نے کہا — "کسی خوش فہمی میں نہ رہنا۔ باطنیوں کی نظریں انسان کے جسم کے اندر بھی چلی جایا کرتی ہیں۔ کسی پر اعتبار نہ کرنا۔ وہاں تمہیں مجھ جیسی کوئی لڑکی مل جائے اور تمہارے آگے روئے اور فریادیں

کرے کہ میں مظلوم ہوں' میری مدد کرو تو پتھر بن جانا۔ یہ بھی یاد رکھنا کہ وہاں تجربی موم ہو جایا کرتے ہیں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ قتل کرنے سے پہلے خود قتل ہو جاؤ۔ پارساؤں کو پاپی بناتا ہے۔ وہ ابلیس کی ولایت ہے۔ وہاں اللہ والے راہ سے بے راہ ہو جاتے ہیں"۔

شمونہ نے اُسے اور بھی بہت سی ہدایات دیں' خطروں کی نشاندہی کی اور کہا کہ وہ رات کو سوئے تو ایک آنکھ کھول کر سوئے۔

مزمل آفندی تندرستی کی شب کے بعد مرو سے روانہ ہو گیا تھا۔ اُس نے داڑھی پہلے ہی بڑھالی تھی۔ اس سے پہلے اس کی داڑھی سلیقے سے تراشی ہوئی ہوتی تھی جو اس کے سفیدی مائل گندمی چہرے میں دلکشی پیدا کرتی تھی۔ اُس نے سر کے بال بھی بڑھالئے اور کچھ دن پہلے ہی انہیں دھونا چھوڑ دیا تھا۔ سلطان کے تجربہ کار جاسوسوں نے اس کا بہروپ تیار کیا اور اُسے شتربان بنا دیا تھا جو اپنے اونٹ باربرداری اور سواری کے لئے کرائے پر دیتا تھا۔

○

وہ بڑی لمبی مسافت طے کر کے خلجان میں داخل ہوا۔ اُسے بتا دیا گیا تھا کہ خلجان میں کہاں جانا ہے اور کس سے ملے۔ خلجان میں ایک آدمی تھا جو سلجوقیوں کے جاسوسوں کو اپنے پاس رکھتا تھا۔ وہ خود جاسوس نہیں تھا' جاسوسوں کی راہنمائی کرتا تھا۔ سلجوقی جاسوس اپنے دائیں ہاتھ کی درمیانی اور چھوٹی انگلی کے درمیان والی انگلی میں ایک خاص ساخت کی انگوٹھی ڈال کر رکھتے تھے۔ کسی جاسوس کو جب خفیہ طور پر پناہ دینے والا آدمی مل جاتا اور وہ جاسوس کو پہچان لیتا تو جاسوس انگوٹھی اتار کر چھپا لیتا تھا۔

مزمل آفندی خلجان میں داخل ہوا۔ حسن بن صباح مہدی علوی کے ساتھ الموت میں داخل ہوا۔

مہدی علوی کو حسن بن صباح نے رات اپنے ہاں مہمان رکھا تھا۔ خود اپنی سادگی اور درویشی کے دکھاوے کے لئے معمولی سے ایک خیمے میں چلا گیا تھا اور مہدی علوی کو اپنے شاہانہ خیمے میں ٹھہرایا اور اُس پر یہ ظاہر کیا تھا کہ یہ خیمہ اُس کے لئے تیار کیا گیا تھا۔ خیمے میں پھول ہی پھول نظر آتے تھے۔ ان کی مہک خمار طاری کر رہی تھی۔

ان رنگا رنگ پھولوں میں ایک پھول اور بھی تھا جو چلتا پھرتا تھا' مسکراتا تھا۔ اس کا

مزاج اور اُس کے رنگ پھولوں سے جُدا تھے۔ یہ تھی خدیجہ جسے حسن بن صباح نے ہدایات دے کر مہدی علوی کے ساتھ لگا رکھا تھا۔ بظاہر خدیجہ کا کام یہ تھا کہ مہمان کی دیکھ بھال کرے۔ اُس کا بستر ٹھیک کر دے اور اُس کے پاس پانی رکھ دے اور اُس کے سونے کی شمع بجھا کر باہر آ جائے پھر صبح اسے ناشتہ دے۔ لیکن خدیجہ کو کوئی اور ہی مقصد دیا گیا تھا۔

رات کھانے کے بعد حسن بن صباح مہدی علوی کو خیمے میں اکیلا چھوڑ کر اپنے خیمے میں چلا گیا تو خدیجہ مہدی علوی کے پاس آ گئی۔ اُس نے لباس ایسا پہن رکھا تھا جس میں اس کا جسم پوری طرح مستور نہیں تھا لیکن اس کی باتوں اور حرکات میں بے حیائی نہیں بلکہ شرم و حجاب تھا۔ مہدی علوی ادھیڑ عمر آدمی تھا۔ بڑھاپے میں داخل ہو چکا تھا۔ اس عمر میں آدمی بڑھاپے کو فریب دیا کرتا ہے کہ وہ ابھی جوان ہے۔ مہدی علوی تو ایک شہر کا امیر یعنی حاکم تھا' دولت میں کھیلتا تھا۔ اُس کی دو بیویاں تھیں لیکن حاکم شہر دو بیویوں سے مطمئن نہیں ہوا کرتے تھے۔ نت نئے غنچوں کے متلاشی رہتے تھے۔ داشتہ اُن کی زندگی کا لازمی جزو ہوتا تھا۔

خدیجہ کو دیکھ کر مہدی علوی نے اپنی جذباتی دنیا میں زلزلے کے جھٹکے محسوس کئے۔ خدیجہ کو معلوم تھا کہ مرد کو کوئی بات کئے بغیر کس طرح جال میں لایا جاتا ہے۔ وہ خیمے میں گلدستے اور دیگر اشیاء قرینے سے رکھ رہی تھی اور وہ جانتی تھی کہ مہدی علوی کی نظریں اس پر لگی ہوئی ہیں۔ وہ کوئی چیز اٹھا کر کہیں اور رکھنے کے لئے جھکتی تھی تو اُس کے جسم کا کوئی ذرا سا حصہ عریاں ہو جاتا تھا۔

"تم کون ہو؟" — مہدی علوی نے پوچھا۔

"خدیجہ!" — خدیجہ نے جھوٹ بولا — "بیوہ ہوں۔ خاوند تبریز کی لڑائی میں مارا گیا ہے..... میں امام کی خدمت کے لئے اس کے ساتھ رہتی ہوں"۔

"بیوی بن کر؟" — مہدی علوی نے پوچھا — "یا شادی کے بغیر ہی....."

"نہیں معزز مہمان!" — خدیجہ نے جواب دیا — "امام کسی عورت کے ساتھ ایسا تعلق نہیں رکھتا..... نہ بیوی نہ داشتہ..... امام تو آسمان کی مخلوق ہے۔ خوبصورت لڑکیوں کو ساتھ رکھتا ہے لیکن بالکل اس طرح جس طرح گلدانوں میں پھول رکھے ہوئے ہیں"۔

"تم بچہ ہو خدیجہ!" ــــ مہدی علوی نے کہا ــــ "جوان ہو اور اتنی حسین ہو کر میں نے تم جیسی خوبصورت لڑکی کم ہی کبھی دیکھی ہے۔ کیا تم مرد کے ساتھ کی ضرورت محسوس نہیں کرتیں؟ تشنگی سی ..... اور میں کیا کہوں!"

خدیجہ نے شرمانے کی ایسی اداکاری کی جیسے زمین میں اُتر جانا چاہتی ہو۔ مہدی علوی نے اپنا سوال دہرایا تو خدیجہ نے سر کے ہلکے سے اشارے سے بتایا کہ مرد کے ساتھ کی ضرورت محسوس کرتی ہے۔

"کیا میرا ساتھ پسند کرو گی؟" ــــ مہدی علوی نے کہا ــــ "تمہارے امام سے اجازت لے لوں گا۔ تمہیں بیوی نہیں ملکہ بناؤں گا ..... میرے قریب آؤ۔ میرے پاس بیٹھو"۔

"میں آپ کو ایک خاص شربت پلاتی ہوں" ــــ خدیجہ نے کہا ــــ "یہ ہم اپنے بہت ہی خاص مہمانوں کو پلایا کرتے ہیں"۔

اُس نے ایک صراحی میں سے ایک پیالہ بھرا اور مہدی علوی کو پیش کیا۔ یہ شربت خاص طور پر خیمے میں رکھا گیا تھا۔ مہدی علوی نے شربت پی لیا اور خدیجہ کو اپنے ایک بازو کے گھیرے میں لے لیا۔ پھر جب شربت نے اپنا اثر دکھایا تو خدیجہ ایک طلسم یا ایک بڑا ہی حسین آسیب بن کر مہدی علوی پر غالب آگئی۔

خدیجہ جب آدھی رات سے کچھ پہلے خیمے سے نکلی تو اس کا جسم ویسا ہی پاک نہ تھا جیسا اُس وقت تھا جس وقت وہ اُس خیمے میں داخل ہوئی تھی۔

صبح مہدی علوی کی آنکھ کھلی تو اُس نے سب سے پہلے خدیجہ کو پکارا ..... اور اُسی روز وہ حسن بن صباح اور اس کے تمام آدمیوں کو اپنے ساتھ قلعہ الموت میں لے گیا۔ خدیجہ اور دوسری لڑکیاں بھی ساتھ تھیں۔

اِدھر مزمل آفندی غلجان میں داخل ہوا۔ اُسے بتا دیا گیا تھا کہ اُس آدمی کا گھر کہاں ہے جس کے ہاں اس نے قیام کرنا ہے۔ اُس کا نام احمد اوزال تھا۔ وہ سلجوق تھا۔ مزمل نے تین چار آدمیوں سے اس کا گھر پوچھا۔ آخر اُس نے دو آدمیوں کو روکا اور اُن سے احمد اوزال کا گھر معلوم کیا۔ انہوں نے اسے صحیح راستے پر ڈال دیا۔ وہ چلا گیا تو ان دونوں میں سے ایک آدمی اُسے جاتے دیکھتا رہا۔

"شاید میں اس شخص کو جانتا ہوں" ــــ ایک نے کہا۔

"جانتے ہو گے" ــــ دوسرے نے کہا ــــ "مشتریان ہے۔ کبھی تم نے اس کا اونٹ استعمال کیا ہو گا"۔

"نہیں، یہ شتربان نہیں" ــــ پہلے آدمی نے کہا ــــ "اور اس نے جس کا گھر پوچھا ہے وہ بھی مشکوک آدمی ہے"۔

مزمل آفندی پہچانا گیا تھا اور وہ بے خبر تھا۔

رات کھانے کے بعد مزمل آفندی اور احمد اوزال الگ بیٹھ گئے۔

"اب بتاؤ مزمل!" — احمد اوزال نے پوچھا — "کیا تم کسی خاص مقصد کے لئے آئے ہو یا میری طرح جاسوسی کے لئے یہیں رہو گے؟"

"میں بہت بڑا مقصد لے کر آیا ہوں احمد بھائی!" — مزمل نے کہا — "حسن بن صباح کو قتل کرنا ہے یا اسے زندہ پکڑ کر سلطان ملک شاہ کے حوالے کرنا ہے"۔

"کیا تمہیں سلطان نے کہا ہے کہ یہ کام کرنا ہے؟" — احمد اوزال نے پوچھا۔

"ہاں احمد بھائی!" — مزمل نے جواب دیا — "سلطان نے کہا ہے اور وزیرِ نظام الملک نے بھی"۔

"نظام الملک نے بھی؟" — احمد اوزال نے حیرت سے کہا — "وہ دونوں اسے کوئی عام سا فریب کار اور شیطان فطرت انسان سمجھ رہے ہیں جسے وہ بڑی آسانی سے قتل کرا دیں گے"۔

"اسی لئے انہوں نے مجھے تمہارے پاس بھیجا ہے" — مزمل نے کہا — "مجھے بتاؤ کہ میں اسے کہاں اور کس طرح قتل کر سکتا ہوں۔ اگر تم اسے ناممکن سمجھتے ہو تو یہ بھی بتا دو۔ میں ناممکن کو ممکن کر کے دکھا دوں گا"۔

"تم جذبات کے غلبے میں بات کر رہے ہو مزمل!" — احمد اوزال نے کہا — "تم ناممکن کو ممکن نہیں بلکہ ممکن کو ناممکن بنا دو گے۔ سلطان اور نظام الملک حسن بن صباح کے ہاتھوں قتل ہو سکتے ہیں اسے قتل نہیں کروا سکتے.....

کچھ دن یہاں رہو' میں تمہیں الموت بھی لے جاؤں گا۔ خود ہی دیکھ لینا کہ تم کس طرح قتل کر سکتے ہو۔ ہم تین چار آدمی یہاں سے ہر چھوٹی بڑی خبر سلطان تک پہنچا رہے ہیں"۔

"ایک بات کہوں احمد؟" — مزمل نے کہا — "بُری لگے تو معاف کر دینا..... میرا خیال ہے تم سلطان کے تنخواہ دار ملازم ہو۔ تم اپنی جان کو خطرے میں نہیں ڈال سکتے۔ میں جذبہ لے کر آیا ہوں"۔

"اس میں بُری لگنے والی کوئی بات نہیں مزمل!" — احمد اوزال نے کہا — "بے شک ہم اس علاقے میں جو چند ایک آدمی جاسوسی کے لئے آئے ہیں' سب تنخواہ دار ملازم ہیں لیکن ہم رضاکارانہ طور پر آئے ہیں اور وہی جذبے لے کر آئے ہیں جس نے تمہیں یہاں آنے پر مجبور کیا ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ ہمیں تجربہ کار استادوں نے جاسوسی کی تربیت دی تھی پھر ہمیں آزمائشوں میں ڈال کر پرکھا اور اُس وقت یہاں بھیجا جب انہوں نے اطمینان کر لیا کہ ہم اس کام کے لئے تیار ہو گئے ہیں۔ صرف جذبہ کچھ نہیں کر سکتا..... اور میں تمہیں یہ بھی بتا دوں مزمل! جس میں جذبہ نہیں وہ بھی کچھ نہیں کر سکتا"۔

"تم میری راہنمائی کرو گے احمد؟"

"کیوں نہیں کروں گا؟" — احمد اوزال نے کہا — "میں تمہیں الموت لے جاؤں گا۔ خود دیکھنا کہ حسن بن صباح تک قتل کے ارادے سے پہنچنا کس قدر دشوار اور خطرناک ہے۔ اس نے نبوت کا دعویٰ نہیں کیا لیکن لوگوں نے اسے نبی ماننا شروع کر دیا ہے۔ اس نے لوگوں سے کہا ہے کہ وہ انہیں دنیا میں جنت دکھا دے گا"۔

"یہ میں جانتا ہوں" — مزمل آفندی نے کہا — "اس نے اپنی شخصیت میں ابلیسی اوصاف پیدا کر لئے ہیں"۔

"ہاں!" — احمد اوزال نے کہا — "تم یہ بھی جانتے ہو گے کہ انسانی فطرت کی کمزوریوں اور کبھی پوری نہ ہونے والی خواہشات کو اگر تسکین ملتی ہے تو وہ ابلیسی اوصاف سے ملتی ہے یا اُس انسان سے ملتی ہے جس نے اپنے آپ میں یہ اوصاف پیدا کر لئے ہوں۔ ابلیس کا بنیادی وصف ہے بندگانِ خدا کو خدا

اور رسولؐ کے بتائے ہوئے راستے سے ہٹانا اور نفسانی لذت پرستی کا عادی بنا دینا"۔

"باتیں بہت ہو چکیں احمد بھائی!" — مزمل آفندی نے کہا — "اب کچھ کرنا ہے۔ اس ابلیس کا راستہ روکنا ہے۔ یہ صرف سلطان ملک شاہ کا مسئلہ نہیں' یہ ہر مسلمان کا مسئلہ ہے' یہ میرا اور تمہارا مسئلہ ہے' یہ دین اسلام کا مسئلہ ہے۔ میں حسن بن صباح پر دو وار کر چکا ہوں۔ اس کے قبضے سے ایک عورت کو آزاد کرایا تھا"۔

مزمل نے احمد اوزال کو سنایا کہ اس نے شمونہ کو کس طرح حسن بن صباح سے آزاد کرایا تھا۔ یہ بھی سنایا کہ اس نے کس طرح اس قافلے پر پانچ سو سواروں کا حملہ کروایا تھا جس قافلے کے ساتھ حسن بن صباح اصفہان جا رہا تھا۔

"میں اپنی جان کی قربانی دینے آیا ہوں احمد بھائی!" — مزمل نے کہا — "مجھے تمہارے پاس بھیجا گیا ہے۔ تم نے میری راہنمائی کرنی ہے۔ میں عہد کر کے آیا ہوں کہ زندہ اسی صورت میں واپس جاؤں گا کہ حسن بن صباح زندہ نہیں ہو گا۔ میں کامیاب لوٹنا چاہتا ہوں"۔

"میں تمہارے ساتھ ہوں مزمل!" — احمد اوزال نے کہا — "میں تمہارا حوصلہ توڑ نہیں رہا' صرف خطروں سے آگاہ کر رہا ہوں۔ میں تمہیں چند دن اپنے پاس رکھ کر تمہاری تربیت کروں گا۔ جاسوسی اور تباہ کاری کے معاملے میں تم بالکل کورے ہو۔ تمہیں کچھ تو معلوم ہونا چاہیے۔ یہاں تمہیں اپنے دوستوں سے بھی ملوانا ہے..... کل صبح باہر نکل جانا اور سارے شہر میں گھوم پھر کر یہاں کی گلیاں اور بازار بھی دیکھنا اور یہاں کے لوگوں کو بھی دیکھنا۔ یہ خیال رکھنا کہ کوئی تمہارے ساتھ علیک سلیک کرے تو اُسے تپاک اور خندہ پیشانی سے ملنا..... یہ بتاؤ کہ تم سے کوئی پوچھ لے کہاں سے آئے ہو اور کیوں آئے ہو تو کیا جواب دو گے؟"

"کہہ دوں گا بغداد سے آیا ہوں" — مزمل نے جواب دیا — "اصفہان کہہ دوں گا۔ میں نے بہت سفر کیا ہے اور بڑے شہروں سے واقف ہوں۔ یہاں

آنے کی وجہ سیر و سیاحت بتاؤں گا"۔

"یہ ٹھیک ہے" — احمد اوزال نے کہا — "تم عقل والے ہو۔ میں سوچتا تھا کہ تم مرو' رے یا نیشاپور کہو گے۔ یہاں کسی کو پتہ نہ چلے کہ تمہارا سلطنتِ سلجوق کے ساتھ کوئی تعلق ہے..... میرے متعلق دل میں کوئی غلط فہمی نہ رکھنا مزمل! میں مسلمان تو ہوں لیکن میں سلجوقی ہوں' ترک ہوں۔ اس سلطنت کی بنیادوں میں میرے آباؤ اجداد کا خون رچا بسا ہوا ہے۔ میں اس سلطنت کے ساتھ غداری نہیں کر سکتا۔ میں پہلے مسلمان ہوں پھر سلجوق ہوں۔ اس طرح اس سلطنت کے ساتھ میرے دو رشتے بنتے ہیں۔ مجھے تنخواہ دار ملازم نہ سمجھنا۔ میں تمہارے ساتھ نہیں ہوں گا تو بھی مجھے اپنے ساتھ سمجھنا..... اور بہت ہی ضروری بات یہ ذہن میں رکھنا کہ اس شہر میں باطنیوں کے جاسوس بھی موجود ہیں۔ کہیں پکڑے نہ جانا"۔

○

اگلی صبح مزمل آفندی احمد اوزال کے گھر سے اس خیال سے نکلا کہ سارے شہر میں گھوم پھر کر شہر سے واقفیت حاصل کرے گا۔ گلی میں اسی کی عمر کا ایک آدمی ٹہل رہا تھا۔ مزمل نے اس کی طرف توجہ نہ دی۔ اسے صرف دیکھا اور ایک طرف نکل گیا۔ وہ اس شہر میں اجنبی تھا۔ گلیوں کے موڑ مڑتا گیا۔

ایک گلی سے مڑ کر ایک اور گلی میں داخل ہوا۔ ایک اور گلی اس گلی کے ساتھ ملتی تھی۔ مزمل نے اس آدمی کو جسے اس نے احمد اوزال کے گھر سے نکلتے دیکھا تھا' اسے دوسری گلی میں آہستہ آہستہ چلتے دیکھا۔ اب کے مزمل نے اسے ذرا توجہ سے دیکھا۔ اسے یاد آیا کہ کل اس نے اسی آدمی سے احمد اوزال کا گھر پوچھا تھا۔

مزمل بازار میں چلا گیا اور ایک دکان پر رک گیا۔ یہ خنجروں اور چھوٹی بڑی تلواروں کی دکان تھی۔ مزمل خنجر اٹھا اٹھا کر دیکھنے لگا۔ اس نے دائیں طرف دیکھا۔ اگلی دکان پر وہی آدمی کھڑا مزمل کی طرف دیکھ رہا تھا۔ مزمل نے اسے دیکھا تو اس نے منہ دوسری طرف پھیر لیا۔

اس کے بعد مزمل جدھر بھی گیا اس نے کچھ فاصلے پر اس آدمی کو دیکھا۔

دوپہر کے کھانے کے وقت مزمل واپس احمد اوزال کے گھر آیا اور اسے بتایا کہ ایک آدمی اس کا پیچھا کرتا رہا ہے۔

"میں نے اسی آدمی سے تمہارے گھر کا پتہ پوچھا تھا" — مزمل نے کہا۔

"یہ حسن بن صباح کا جاسوس ہے" — احمد اوزال نے کہا — "تم نے تین چار دن ابھی یہیں رہنا ہے۔ اس آدمی سے بچ کے رہنا۔ یہ تمہیں قتل نہیں کرے گا نہ تمہیں گرفتار کرے گا۔ یہ کسی وقت تمہیں ملے گا اور تمہیں دوست بنائے گا۔ اسے اچھی طرح ملنا لیکن ایسی کوئی بات نہ کرنا جس سے اسے شک ہو جائے۔ یہی بتانا کہ تم سفر پر ہو۔ میرے متعلق بتانا کہ میری تمہاری ملاقات حلب میں ہوئی تھی۔ تم گھومو پھرو۔ شہر سے باہر جنگل بھی دیکھنا۔ بہت خوبصورت علاقہ ہے۔ ایک ندی گذرتی ہے"۔

"ضرور جاؤں گا" — مزمل نے کہا — "قدرت کے حسن کا تو میں دلدادہ ہوں"۔

"نہیں مزمل!" — احمد اوزال نے کہا — "تم نے قدرت کے حسن میں کھو نہیں جانا بلکہ یہ دیکھنا ہے کہ تمہیں اگر یہاں سے بھاگنا پڑے تو جنگل میں کہاں کہاں چھپتے ہوئے بھاگو گے...... یاد رکھو مزمل! جاسوس اور تباہ کار کو کیڑوں کوڑوں کی طرح رہنا ہوتا ہے"۔

احمد اوزال نے اسے اور بھی بہت سی ہدایات دیں۔ وہ مزمل کو باقاعدہ ٹریننگ دے رہا تھا۔

کھانے کے بعد مزمل پھر باہر نکل گیا۔ اس نے ادھر ادھر دیکھا۔ اسے توقع تھی کہ وہی آدمی پھر اسے نظر آئے گا لیکن وہ نظر نہ آیا۔ مزمل شہر سے نکل کر جنگل کی طرف ہو لیا۔ آگے اونچی نیچی ٹیکریاں تھیں جو سبز گھاس، خوبصورت جھاڑیوں اور درختوں سے ڈھکی ہوئی تھیں۔ واقعی بہت خوبصورت علاقہ تھا۔

مزمل تنومند جوان آدمی تھا۔ ایسے روح افزا علاقے اسے بہت ہی اچھے لگتے تھے۔ وہ دو تین ٹیکریوں کے درمیان سے گزر کر آگے چلا گیا۔ اسے ندی نظر آئی۔ اس کے کناروں پر گھنے درخت تھے۔ ان کے پس منظر میں پہاڑی تھی۔ وہ بھی سبزپوش تھی۔ اس پر بادلوں کے سفید ٹکڑے منڈلا رہے تھے۔

مزمل ندی کی طرف جا رہا تھا۔

○

اسے اپنے پیچھے ایسی سرسراہٹ سنائی دی جیسے کوئی خشک گھاس پر چل رہا ہو۔ اس نے گھوم کر پیچھے دیکھا۔ وہاں کوئی نہیں تھا۔ اسے یوں شک ہوا جیسے اس نے کسی جنگلی جانور یا کتے یا بلی کو ٹیکری کی اوٹ میں ہوتے دیکھا ہو۔ اسے وہم سمجھ کر وہ ندی تک پہنچ گیا اور کنارے پر ٹہلنے لگا۔ ندی کا جل ترنگ بجاتا ہوا شفاف پانی دلوں پر وجد طاری کر رہا تھا۔

مزمل کو یاد آیا کہ احمد اوزال نے اسے کہا تھا کہ قدرت کے حسن میں ہی نہ کھو جانا بلکہ وہاں چھپنے کی جگہیں دیکھنا...... اس نے ہر سو دیکھا۔ اسے جھاڑیوں کے اور اونچے اور گھنے پودوں کے جھرمٹ نظر آئے۔ بعض ٹیکریاں دیواروں جیسی تھیں۔ ان کے دامن میں ہاتھی گھاس بھی تھی اور ہرے سرکنڈے بھی۔ بعض گھنے درخت ایسے بھی تھے جن کے نیچے والے ٹہن زمین کے قریب آگئے تھے۔ مزمل کو خیال آیا کہ وہ ایسے کسی ٹہن پر چڑھ جائے گا اور چوڑے پتوں والی گھنی شاخیں اسے چھپا لیں گی۔

اسے ندی کے کنارے کے قریب تین چار درختوں کا جھنڈ دکھائی دیا۔ ان پر چوڑے پتوں والی بیلیں چڑھی ہوئی تھیں۔ یہ درختوں کے درمیان سے اٹھ رہی تھیں۔ ان بیلوں نے درختوں کے نیچے غار یا گف کی طرح کا کمرہ سا بنا رکھا تھا۔

مزمل ندی کے ساتھ ساتھ وہاں تک جانے کی بجائے چکر کاٹ کر عقب سے آگے گیا۔ اسے سامنے سے دیکھنے کو آگے ہوا تو وہ ٹھٹک کر ایک قدم پیچھے ہو گیا۔ وہاں ایک آدمی بیٹھا ہوا تھا۔ مزمل کو کسی آدمی سے کوئی ڈر اور خطرہ نہیں ہو سکتا تھا لیکن یہ وہی آدمی تھا جو گلیوں اور بازار میں اس کے ساتھ سائے کی طرح لگا رہا تھا۔ کچھ دیر پہلے مزمل نے اپنے پیچھے جو آہٹ اور سرسراہٹ سنی تھی وہ اسی آدمی کی تھی۔

اسے وہاں دیکھ کر مزمل فوراً سمجھ گیا کہ یہ شخص جنگل میں بھی اس کے پیچھے آگیا ہے۔ وہ غصے سے آگ بگولہ ہو گیا۔ اس نے اپنے کپڑوں کے اندر خنجر

اُوپر رکھا تھا۔ وہ آدمی اٹھ رہا تھا۔ مزمل نے بڑی تیزی سے خنجر نکال لیا۔ اس کے ذہن میں احمد اوزال کے الفاظ گونجے — "یہ حسن بن صباح کا جاسوس ہے" — مزمل کو یوں سنائی دیا جیسے اسے کسی نے کہا ہو — "یہ حسن بن صباح ہے"۔

وہ آدمی اٹھا ہی تھا کہ مزمل کا بایاں ہاتھ تیر کی طرح آگے ہوا اور اس ہاتھ نے اس آدمی کی گردن دبوچ لی۔ مزمل کے دوسرے ہاتھ میں خنجر تھا۔ اس کے خنجر کی نوک اس شخص کے دل کے مقام پر رکھ دی۔ بائیں ہاتھ کا پنجہ اتنی زور سے دبایا کہ اس آدمی نے اپنے دونوں ہاتھوں سے مزمل کی بائیں کلائی پکڑ لی اور تڑپنے لگا۔ اس میں اتنی طاقت نہیں رہی تھی کہ مزمل کے پنجے سے اپنی گردن چھڑوا سکتا۔ اس نے دم گھٹنے سے مرجانا تھا۔ اس کے ساتھ ہی مزمل کے خنجر کی نوک اس کے دل کے مقام پر چبھ رہی تھی۔

مزمل اسے جان سے مار سکتا تھا لیکن اسے خیال آگیا کہ اس سے یہ تو پوچھ لے کہ وہ کون ہے اور چاہتا کیا ہے اور اگر وہ حسن بن صباح کے باطنی فرقے کا جاسوس ہے تو اس سے راز کی کچھ باتیں پوچھ لے..... یہ خیال آتے ہی اس نے اس شخص کی ٹانگوں کے پیچھے اپنی ایک ٹانگ کر کے بائیں ہاتھ سے ایسا دھکا دیا کہ وہ آدمی پیٹھ کے بل گرا۔ مزمل کود کر اس کے پیٹ پر بیٹھ گیا اور خنجر کی نوک اس کی شہ رگ پر رکھ دی۔

"کیا چاہتے ہو؟" — مزمل نے پوچھا — "میرے پیچھے کیوں لگے ہوئے ہو؟"

"میں بتا نہیں سکتا" — اس نے کہا — "بتایا تو تم مجھے قتل کر دو گے"۔

"قتل تو میں تمہیں کر ہی دوں گا" — مزمل نے کہا — "سچ بول دو گے تو شاید میں تمہیں چھوڑ دوں"۔

"اس وقت میری جان تمہارے ہاتھ میں ہے" — اس نے کہا — "اس لئے میں تمہیں یہ نہیں کہہ سکتا کہ وعدہ کرو تم کسی کو بتاؤ گے نہیں"۔

"سچ بولو گے تو جو وعدہ چاہو گے پورا کروں گا" — مزمل نے کہا۔

"میں نے تمہیں قتل کرنا تھا" — اس شخص نے کہا — "لیکن ایک بات کا یقین کرنا تھا"۔

"میرا قصور؟"

"تم باطنیوں کے جاسوس ہو" — اس آدمی نے کہا — "تم حسن بن صباح کے اُس گروہ کے آدمی ہو جو بڑے لوگوں کو قتل کرتے ہیں' اور میں حسن بن صباح کو قتل کرنے کے لئے گھر سے نکلا ہوں..... تم نے کہا تھا سچ بولو۔ میں نے سچ بول دیا ہے۔ اب چاہو تو مجھے قتل کر دو"۔

"تمہیں کس نے بتایا ہے میں حسن بن صباح کے قاتل گروہ کا آدمی ہوں؟" — مزمل آفندی نے پوچھا۔

"کل تم نے مجھ سے احمد اوزال کا گھر پوچھا تھا" — اس نے جواب دیا — "میرے ساتھ ایک اور آدمی تھا۔ اس نے تمہارے متعلق کہا تھا کہ اسے شک ہے کہ تم باطنی ہو اور شاید تم قاتل گروہ کے آدمی ہو۔ میں یہی معلوم کرنے کے لئے تمہارے پیچھے پھر رہا تھا۔ شک صحیح ہونے کی صورت میں میں نے تمہیں قتل کرنا تھا۔ ہمیں بتایا گیا ہے کہ حسن بن صباح کے پیشہ ور صرف ایک قاتل کو قتل کرنے کا اتنا ہی ثواب ملتا ہے جیسے تم نے حسن بن صباح کو قتل کر دیا..... بے شک اس وقت میری جان تمہارے قبضۂ اختیار میں ہے لیکن تم میں مردانگی ہے تو تم بھی سچ بتا دو کہ تم پر میرا جو شک ہے یہ صحیح ہے یا غلط!"

"کم عقل انسان!" — مزمل نے کہا — "اگر تمہارا شک صحیح ہوتا تو اب تک میرا خنجر تمہاری شہ رگ کاٹ چکا ہوتا"۔

مزمل آفندی نے اس کی شہ رگ سے خنجر ہٹا لیا پھر اس کے پیٹ سے اتر کر اس کے قریب بیٹھ گیا۔ وہ آدمی اٹھ بیٹھا۔

"کون سے فرقے سے تعلق رکھتے ہو؟" — مزمل نے اس سے پوچھا — "نام کیا ہے تمہارا؟"

"اہلِ سنت ہوں" — اس نے جواب دیا — "عبید ابنِ عابد میرا نام ہے سب مجھے بن عابد کہتے ہیں"۔

"حسن بن صباح قلعہ الموت میں ہے" — مزمل نے کہا — "اور تم یہاں قلجان میں اُسے کس طرح قتل کرو گے؟"

"دیکھو میرے دوست!" — بن عابد نے کہا — "میں نے تمہیں اپنا راز دے دیا ہے۔ اب اور زیادہ بھید لینے کی کوشش نہ کرو۔ تمہارا خنجر میرے دل پر اور شہ رگ تمہارے پنجے میں آگئی تھی اور میں بے بس ہو گیا تھا۔ اب تمہارے ہاتھ میں خنجر ہے اور میں خالی ہاتھ ہوں۔ مجھ پر حملہ کر کے دیکھو۔ میں استادوں سے خالی ہاتھ لڑنے اور قتل کرنے کی تربیت لے کر آیا ہوں۔ میں کوئی گیا گزرا آدمی نہیں ہوں۔ میرے آباؤ اجداد ثقفی تھے۔ مجھے تم پر شک ہے کہ تم کسی اور فرقے کے آدمی ہو"۔

"میں اہلِ سُنّت ہوں بن عابد!" — مزمل نے کہا — "میرے دادا اصفہان میں آباد ہو گئے تھے...... میں تم سے ایک خاص مقصد کے لیے پوچھ رہا ہوں کہ حسن بن صباح کو کس طرح قتل کرو گے!"

"یہ کام ایک آدمی کا نہیں" — بن عابد نے کہا — "مجھے ایک ساتھی کی ضرورت ہے۔ میں اسی مقصد کے لئے قلجان میں رکا ہُوا ہوں۔ میں حیران ہوں کہ ایک سے بڑھ کر ایک دلیر آدمی موجود ہے۔ جذبے والے بھی موجود ہیں۔ یہ وہ پکے مسلمان ہیں جو حسن بن صباح کا نام سنتے ہیں تو تھوک دیتے ہیں لیکن حسن بن صباح کے قتل کے لئے کوئی بھی تیار نہیں ہوتا"۔

"وجہ کیا ہے؟"

"بزدلی!" — بن عابد نے جواب دیا — "کہتے ہیں وہاں جا کر بندہ خود قتل ہو جاتا ہے۔ حسن بن صباح کو قتل نہیں کیا جا سکتا"۔

"تمہارا اپنا کیا خیال ہے؟"

"میرے بھائی!" — بن عابد نے جواب دیا — "میرا اپنا کوئی خیال نہیں، مسلمان جو کچھ کرتا ہے اللہ کے حکم سے کرتا ہے، اس کا اپنا کوئی خیال نہیں ہوتا سوائے اس کے کہ وہ اللہ کی راہ میں جان قربان کر دیا کرتا ہے...... اگر دو دنوں تک مجھے کوئی ساتھی نہ ملا تو میں اکیلا قلعہ الموت چلا جاؤں گا پھر دیکھوں گا کون قتل ہوتا ہے...... میں یا حسن بن صباح؟"

یہ بن عابد بولتا چلا گیا اور اس کا لہجہ پہلے سے زیادہ جذباتی ہو گیا۔ ایک جنون سا تھا جو مزمل آفندی پر طاری ہوتا چلا جا رہا تھا۔ اسے ایک ایسا آدمی مل گیا تھا جو اس کا صرف ہم خیال ہی نہیں تھا بلکہ وہ بھی وہی عزم لے کر گھر سے نکلا تھا جو مزمل کو اتنی دور سے یہاں لے آیا تھا۔

"اگر میں کہوں کہ میں بھی اسی ارادے سے یہاں آیا ہوں" — مزمل نے کہا — "تو مان لو گے؟"

"نہیں!" — بن عابد نے کہا — "میں پچھتا رہا ہوں کہ تمہیں اپنا راز دے دیا ہے۔ مجھے تم پر اعتبار نہیں کرنا چاہیے تھا"۔

"میں تمہیں کیسے یقین دلاؤں بن عابد!" — مزمل نے کہا — "یوں سمجھو کہ تم جس ساتھی کی تلاش میں ہو وہ تمہیں مل گیا ہے"۔

مزمل اتنا جذباتی ہو گیا تھا کہ اس نے خنجر اپنے سامنے زمین پر رکھ دیا۔ وہ بن عابد کے سامنے بیٹھا ہُوا تھا۔ بن عابد نے بڑے آرام سے خنجر اٹھا لیا اور اسے دیکھنے لگا جیسے بچہ کوئی چیز اپنے ہاتھوں میں لے کر اشتیاق سے دیکھا کرتا ہے۔ بن عابد پہلے سے زیادہ جذباتی لہجے میں بول بھی رہا تھا۔

وہ بیٹھے بیٹھے اچانک اچھلا اور مزمل پر جا پڑا۔ مزمل اس اچانک حملے سے پیٹھ کے بل گرا۔ بن عابد اس کے سینے پر چڑھ بیٹھا اور خنجر کی نوک اس کی شہ رگ پر رکھ دی۔

"اب بتا تو کون ہے باطنی مردود؟" — بن عابد نے کہا — "تو اُن باطنیوں کا جاسوس ہے۔ تو حسن بن صباح ابلیس کے خاص گروہ کا آدمی ہے۔ میں نے تجھے اپنا راز دے دیا ہے۔ تجھے میں زندہ کیسے رہنے دوں؟"

مزمل منت سماجت کے سوا کر بھی کیا سکتا تھا؟ وہ قسمیں کھا کھا کر یقین دلا رہا تھا کہ وہ راسخ العقیدہ مسلمان ہے اور وہ حسن بن صباح کے قتل کے ارادے سے آیا ہے۔ بن عابد مان نہیں رہا تھا۔

"پھر یوں کرو" — بن عابد بڑی ہی مشکل سے مانا اور شرط یہ بتائی — "میرے ساتھ وہاں چلو جہاں میں رہتا ہوں"۔

بن عابد اس کے سینے سے ہٹ گیا اور مزمل اٹھ کر بیٹھ گیا۔

"میں اپنے دوست احمد اوزال کے ہاں ہی کیوں نہ رہوں؟" — مزمل نے کہا — "الموت تمہارے ساتھ چلوں گا"۔

"نہیں؟" — بن عابد نے کہا — "میں تمہیں اس لئے اپنے ساتھ لے جا رہا ہوں کہ مجھے مکمل طور پر یقین کرنا ہے کہ تم قابلِ اعتماد ہو..... اور تمہیں اپنے ساتھ لے جانے کی دوسری وجہ یہ ہے کہ احمد اوزال ٹھیک آدمی نہیں۔ میں جانتا ہوں وہ سلجوقی ہے اور شاید سلجوقی سلطان کے لئے جاسوسی بھی کرتا ہے۔ میرے یہاں کے دوستوں کو شک ہے کہ وہ باطنیوں کا بھی وفادار ہے..... دوغلا آدمی ہے..... تمہیں اس نے کیا کہا ہے؟"

"میں نے اسے بتا دیا ہے کہ میں یہاں کیوں آیا ہوں" — مزمل نے جواب دیا — "اس نے کہا ہے کہ وہ الموت تک میرے ساتھ چلے گا اور میری راہنمائی کرے گا"۔

"بچ میرے دوست!" — بن عابد نے کہا — "یہ تمہیں الموت لے جا کر مروائے گا..... تمہیں میرے ساتھ چلنا ہو گا..... میں تمہیں یہ بھی بتا دیتا ہوں کہ ہمارے پاس رہنے کی تم پر پابندی نہیں۔ میرے دوستوں سے ملو گے اور ان کی باتیں سنو گے تو خود محسوس کرو گے کہ تمہیں ہمارے پاس ہی رہنا چاہئے۔ اس صورت میں ہم تمہارے دوست کو پتہ نہیں چلنے دیں گے"۔

مزمل آفندی پر خاموشی طاری ہو گئی۔ اس کا ذہن الجھ گیا۔ وہ بن عابد کے ساتھ چل پڑا۔ اسے چلتے چلتے خیال آیا کہ احمد اوزال کو تو وہ جانتا ہی نہیں تھا۔ اس کے پاس آئے ابھی ایک رات ہی گزری اور اگلا دن گزر رہا تھا۔

○

عبید ابنِ عابد اسے ایک گھر میں لے گیا جہاں دو آدمی موجود تھے۔ وہ اٹھ کر بڑے تپاک سے مزمل سے ملے۔ بن عابد نے اپنے دوستوں کو بتایا کہ مزمل بھی اسی مشن پر آیا ہے جو مشن عابد کا ہے۔ ان دونوں آدمیوں نے مزمل کے ساتھ وہی باتیں کیں جو بن عابد نے کی تھیں۔ مزمل نے انہیں بھی یقین دلانے کی کوشش کی کہ باطنیوں کے ساتھ اس کا کوئی تعلق نہیں۔

"مزمل آفندی!" — ایک آدمی نے کہا — "تم قرآن ہاتھوں پر اٹھا کر

قسم کھا سکتے ہو۔ مسجد میں جا کر بھی قسم کھا سکتے ہو لیکن یہ کوئی ثبوت نہیں ہو گا کہ تم جو کچھ کہہ رہے ہو یہ سچ ہے۔ میں تمہیں ایک بات بتا دوں۔ اگر تم نے بھاگنے کی کوشش کی تو زندہ نہیں رہو گے۔ دنیا کے کسی بھی گوشے میں چلے جاؤ گے، تمہیں قتل کرنے کے لئے ہمارا ایک آدمی وہاں پہنچ جائے گا..... اگر تم اسلام کے ساتھ مخلص اور دیانتدار ہو تو ہمارے پاس رہو..... اب چونکہ ہم نے ایک دوسرے کو اپنا اپنا راز دے دیا ہے اس لئے یہ بھی بتا دو کہ تمہیں یہاں کس نے بھیجا ہے؟"

"سلطان ملک شاہ کے وزیر نظام الملک نے!" — مزمل نے صحیح بات بتا دی — "انہوں نے ہی کہا تھا کہ خلجان جا کر احمد اوزال کا گھر پوچھ لینا اور اسے بتانا کہ تمہیں ہم نے بھیجا ہے، پھر اسے بتانا کہ تم کیوں آئے ہو۔ وہ تمہارا ساتھ دے گا"۔

"بن عابد نے تمہیں بتایا ہو گا" — اس آدمی نے کہا — "احمد اوزال قابلِ اعتماد آدمی نہیں۔ اگر یہ تمہیں پکڑوا دے گا تو ہم حیران نہیں ہوں گے۔ ہمیں بن عابد کے لئے ایک ساتھی کی ضرورت تھی۔ ہم تو کہتے ہیں کہ اللہ نے ہماری مدد کی ہے کہ تمہیں بھیج دیا ہے، اور یہ بھی اللہ کی ہی مدد ہے کہ تم ہمیں مل گئے اور ہم نے تمہیں احمد اوزال سے بچا لیا"۔

"تم ایک بات ضرور سوچو گے" — دوسرے آدمی نے کہا — "تم پوچھ سکتے ہو کہ ہم میں سے کوئی بن عابد کے ساتھ کیوں نہیں گیا؟"

"یہ تو میں ضرور پوچھوں گا" — مزمل نے کہا۔

"جواب پر غور کرنا مزمل!" — اس آدمی نے کہا — "اگر ہم بن عابد کے ساتھ چلے گئے تو پیچھے ہمارے محاذ کو چلانے والا کوئی نہیں رہے گا۔ ہمارے محاذ میں کچھ آدمی اور بھی ہیں لیکن وہ اتنے بڑے خطرے میں جانے کے قابل نہیں اور وہ جانے سے ڈرتے بھی ہیں"۔

"میں ڈرنے والوں میں سے نہیں" — مزمل نے کہا — "لیکن میں یہ یقین کس طرح کروں کہ تم لوگ مجھے دھوکہ نہیں دے رہے؟"

"یہی سوال ہم تم سے پوچھنا چاہتے ہیں" — اس آدمی نے کہا — "ہم

کس طرح اعتبار کر سکتے ہیں کہ تم ہمیں دھوکہ نہیں دو گے"؟
اس مسئلے پر باتیں شروع ہوئیں تو مزمل آفندی کو یقین آگیا کہ یہ لوگ
قابلِ اعتماد ہیں اور اس نے انہیں یقین دلا دیا کہ وہ بھی قابلِ اعتماد ہے۔ اس کا
اس نے یہ ثبوت پیش کیا کہ اپنا فیصلہ سنا دیا کہ وہ احمد اوزال کے پاس نہیں
جائے گا۔

اس جماعت کا جو سردار بنا ہوا تھا' اس نے فیصلہ کیا کہ آج ہی رات بن
عابد اور مزمل قلعہ الموت کو روانہ ہو جائیں۔
"ہمارے دو آدمی وہاں بھی موجود ہیں مزمل!" ــــ سردار نے کہا ــــ
"بن عابد کو معلوم ہے۔ وہ بڑی اچھی اور محفوظ پناہ ہے۔ تمہیں کسی بہروپ کی
بھی ضرورت نہیں۔ یہ خیال رکھنا کہ کوئی تم سے پوچھے کہ تم کون ہو تو کہنا' میں
امام کا شیدائی ہوں۔ کسی کے ساتھ حسن بن صباح کے خلاف کوئی بات نہ
کرنا"۔

"قتل کس طرح کریں گے؟" ــــ مزمل نے پوچھا۔
"یہ تم نے وہاں جا کر دیکھنا ہے" ــــ سردار نے کہا ــــ "ویسے اس تک
پہنچنا بہت مشکل ہے۔ وہ لوگوں کے سامنے آتا ہے لیکن لوگوں کے درمیان نہیں
آتا۔ تم دونوں یوں کرنا کہ اس کے محافظوں تک پہنچ جانا اور رو رو
کر' تڑپ تڑپ کر منت سماجت کرنا کہ تم امام کے ہاتھ چومنے کے لئے اصفہان
سے آئے ہو...... اگر تمہیں اجازت مل جائے تو خنجر تمہارے پاس ہوں گے۔
یہ سوچ لو کہ اسے تو قتل کر دو گے لیکن خود وہاں سے زندہ نہیں نکل سکو گے
دوسرا طریقہ تیر ہے۔ حسن بن صباح کبھی کبھی باہر نکلا کرتا ہے۔ یہ تم نے دیکھنا
ہے کہ اس پر کہاں سے تیر چلا سکتے ہو۔ اس صورت میں تمہیں بھاگ نکلنے کا
موقع مل سکتا ہے"۔

"میرا مقصد اسے قتل کرنا ہے" ــــ مزمل نے کہا ــــ "بھاگ سکے تو
بھاگ آئیں گے ورنہ بھاگنا میرا مقصد نہیں"۔
"یہ ہوئی ناں بات!" ــــ بن عابد نے کہا ــــ "ایسا ساتھی مجھے کہاں مل
سکتا تھا!"

سورج غروب ہو گیا تو احمد اوزال مزمل کا انتظار کرتے کرتے تھک گیا اور
پریشان ہو گیا۔ اس نے مزمل سے کہا بھی تھا کہ غروب آفتاب سے پہلے واپس
آجائے۔ وہ وہاں اجنبی تھا۔ کہیں گھر کا رستہ نہ بھول گیا ہو۔ احمد اوزال کو یہ
خطرہ بھی نظر آرہا تھا کہ مزمل جاسوسی کی اونچ نیچ اور خطروں سے بالکل ہی واقف
نہیں تھا' کسی باطنی کے جال میں نہ آگیا ہو۔
احمد اوزال گھر سے نکلا اور گلیوں میں گھومنے پھرنے لگا۔ بازار بھی چھان
مارا۔ واپس گھر آیا۔ مزمل واپس نہیں آیا تھا۔ احمد اوزال اپنے ایک ساتھی کے
گھر گیا اور اسے مزمل کے متعلق بتایا۔ یہ شخص بھی سلجوقیوں کا جاسوس تھا۔
"یہ تمہاری غلطی ہے احمد!" ــــ اس کے ساتھی نے کہا ــــ "تم نے یہ
آدمی مجھے دکھایا ہی نہیں۔ میں اسے کہاں ڈھونڈ سکتا ہوں؟"۔
"کل شام ہی مرو سے آیا تھا" ــــ احمد اوزال نے کہا ــــ "میں نے
آج رات اسے تمہارے پاس لانا تھا"۔
"وہ بچہ تو نہیں کہ رستہ بھول گیا ہو گا" ــــ اس آدمی نے کہا ــــ "تم
جانتے ہو خلجان حسن بن صباح کے ان آدمیوں سے بھرا پڑا ہے جو مخالفوں کی
تلاش میں رہتے ہیں۔ وہ اتنے ماہر ہیں کہ اجنبی کا چہرہ دیکھ کر بتا دیتے ہیں کہ یہ
شخص مشکوک ہے یا بے ضرر ہے۔ مجھے تو یہی نظر آرہا ہے کہ ہمارا یہ مہمان
ان کے جال میں آگیا ہے۔ اصل خطرہ یہ ہے کہ وہ تمہاری نشاندہی کر دے گا"۔
"میں وزیراعظم نظام الملک کو کیا جواب دوں!" ــــ احمد اوزال نے کہا
"انہوں نے اسے میرے پاس بھیجا تھا"۔
"صرف کل شام تک انتظار کرو" ــــ احمد کے ساتھی نے کہا ــــ "اگر
وہ نہ آیا تو رات کو ہی نکل جانا۔ مرو جا کر سلطان کو بتانا کہ آپ کا بھیجا ہوا
آدمی لاپتہ ہو گیا ہے"۔
"سلطان کیا کرے گا؟" ــــ احمد اوزال نے کہا ــــ "جاسوسی کا نظام
وزیراعظم نظام الملک نے اپنے ہاتھ میں رکھا ہوا ہے۔ اس شخص کو بھی انہی نے
بھیجا ہے۔ یہ تو دیکھا ہی نہیں کہ اس آدمی میں عقل کی باریکی بھی ہے یا نہیں۔

اس کی صرف جذباتی باتیں سنیں اور اسے بھیج دیا حسن بن صباح کو قتل کرنے کے لئے"۔

"وزیرِاعظم کو یہی بتانا؟" — اس کے ساتھی نے کہا — "انہیں کہنا کہ اس قسم کے اناڑیوں کو نہ بھیجا کریں۔ یہ ہمیں بھی پکڑوائیں گے..... تمہیں یہاں سے نکل جانا چاہئے۔ ایسا نہ ہو کہ اس نے جذبات میں آکر غیر دانستہ طور پر تمہاری نشاندہی کر دی ہو"۔

احمد اوزال پھر بھاگم بھاگ اپنے گھر اس توقع پر گیا کہ مزمل شاید آگیا ہو لیکن مزمل نہیں آیا تھا۔ اب اس نے اس حقیقت کو قبول کر لیا کہ مزمل لاپتہ ہو گیا ہے۔ اسے اپنے ساتھی کا مشورہ دانشمندانہ لگا کہ اسے قطبان سے نکل جانا چاہئے۔

رات کے اس وقت جب احمد اوزال مزمل آفندی کے لئے پریشان ہو رہا تھا اور جب اسے یہ خطرہ اور پریشان کر رہا تھا کہ مزمل نے بھولے پن میں اس کی نشاندہی کر دی ہو گی' اس وقت دو گھوڑے شہر سے نکلے۔ ایک پر بن عابد اور دوسرے پر مزمل آفندی سوار تھا۔ شہر سے نکل کر انہوں نے قلعہ الموت کا رخ کر لیا۔

ان کے ساتھ بن عابد کے وہ دو ساتھی تھے جن کے ہاں بن عابد مزمل کو لے گیا تھا اور انہوں نے مزمل کو قائل کر لیا تھا کہ وہ احمد اوزال کے پاس نہ جائے...... یہ دونوں شہر کے باہر تک بن عابد اور مزمل کے ساتھ گئے تھے اور انہیں دعاؤں سے رخصت کیا تھا۔

"اللہ تمہیں امان میں رکھے" — ایک نے کہا تھا۔

"اللہ تمہیں کامیاب واپس لائے گا" — دوسرے نے کہا تھا۔

گھوڑے رات کی تاریکی میں تحلیل ہو گئے تو یہ دونوں واپس آگئے۔

"ایک تو ہاتھ آگیا" — ان میں سے ایک نے جو اس خفیہ جماعت کا سردار تھا' اپنے ساتھی سے کہا — "اب بتاؤ عمر! اسے ابھی پکڑ لیں؟"

"احمد اوزال کو؟" — عمر نے پوچھا اور خود ہی جواب دیا — "اس کے متعلق کوئی شک تو رہا نہیں۔ یہ شخص مزمل سارے شک صحیح ثابت کر گیا ہے..

ایک بات بتاؤ شمس! کیا ہم دو آدمی اسے پکڑنے کے لئے کافی ہیں؟"

"کیوں نہیں؟" — شمس نے کہا — "وہ اکیلا رہتا ہے۔ ذرا عقل سے کام لو۔ وہ اپنے اس مہمان مزمل کے لئے پریشان ہو گا کہ وہ کہاں گیا۔ ہم یہ ذہن میں رکھ کر اس کے گھر میں داخل ہو سکیں گے"۔

"رات اسے اپنے گھر باندھ کر رکھیں گے" — عمر نے کہا۔

"اور کل رات اسے یہاں سے لے جائیں گے" — شمس نے کہا — "اور امام کے حوالے کر کے کہیں گے' کہ ایک اور سلجوقی جاسوس آگیا ہے... کام الموت پہنچ گیا ہے"۔

○

احمد اوزال مزمل آفندی کے متعلق سوچتا' پریشانی کے عالم میں ابھی ابھی سویا تھا۔ دروازے پر دستک ہوئی۔ اس کی آنکھ پہلی دستک پر ہی کھل گئی۔ وہ اچھل کر اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے ذرا بلند آواز سے کہا — "اللہ کرے مزمل ہو" — اس نے دیا جلایا۔ دیا ہاتھ میں لے کر صحن میں نکلا اور دروازہ کھولا۔ دو آدمی اسے دھکیلتے ہوئے اندر آگئے۔ ایک شمس تھا اور دوسرا عمر۔ ان کے ہاتھوں میں لمبے خنجر تھے۔ انہیں معلوم تھا کہ احمد اوزال اکیلا رہتا ہے لیکن انہیں شک تھا کہ یہ شخص سلجوقی ہے اور سلطنتِ سلجوق کا جاسوس ہے مزمل نے ان لوگوں کے شک کی تصدیق کر دی تھی۔

احمد اوزال کے دونوں پہلوؤں کے ساتھ خنجروں کی نوکیں لگی ہوئی تھیں جو اسے چبھ رہی تھیں۔ وہ خالی ہاتھ تھا۔ اس کے ہاتھ میں بڑے سائز کا جلتا ہوا دیا تھا۔ دیا آدھے سے کچھ زیادہ تیل سے بھرا ہوا تھا۔

"تم چاہتے کیا ہو؟" — احمد اوزال نے پوچھا۔

"خاموشی سے اندر چلے چلو" — شمس نے کہا — "اندر چل کے بتائیں گے"۔

وہ اسے خنجر کی نوکوں سے دھکیلتے اندر لے گئے۔ شمس نے دروازہ بند کر دیا۔

"تمہارے پاس سونا ضرور ہو گا" — شمس نے کہا — "وہ اور نقدی

ہمارے حوالے کر دو"۔

"یوں کہو کہ تم ڈاکو ہو" ـــــ احمد اوزال نے کہا ـــــ "خنجر ہٹاؤ۔ میرے پاس سونے کے تین ٹکڑے اور کچھ نقدی ہے' وہ میں تمہیں دے رہا ہوں۔ وہ لو اور جاؤ"۔

"ہم تمہیں بھی اپنے ساتھ لے جائیں گے" ـــــ شمس نے کہا ـــــ "ہمیں دراصل ضرورت تو تمہاری ہے"۔

"مجھے ساتھ لے جا کر کیا کرو گے؟" ـــــ احمد اوزال نے پوچھا۔

"کیا فضول باتیں شروع کر دی ہیں شمس؟" ـــــ عمر نے کہا ـــــ "ختم کرو اس سلجوقی جاسوس کو۔ اس کا مال اسباب ہمارا ہی ہے۔ اُدھر سے تم خنجر کھاؤ ادھر سے میں لگاتا ہوں"۔

"اگر یہ بتا دے کہ خلجان میں اس کے کتنے ساتھی ہیں تو اسے زندہ رہنے دیں گے" ـــــ شمس نے کہا ـــــ "یہ بھی بتا دے وہ کہاں کہاں رہتے ہیں"۔

احمد اوزال سمجھ گیا کہ یہ حسن بن صباح کے آدمی ہیں اور انہیں پتہ چل گیا ہے کہ وہ جاسوس ہے۔ وہ یہ بھی سمجھ گیا کہ مزمل آفندی کسی طرح ان کے ہاتھ چڑھ گیا ہے اور اس نے بھانڈہ پھوڑ دیا ہے۔ اسے یہ تو معلوم ہی تھا کہ حسن بن صباح نے جانبازوں کے گروہ بنا رکھے ہیں جو درندوں سے بڑھ کر ہیں' کم نہیں اور ان کے اندر انسانی جذبات ہیں ہی نہیں۔ وہ ان دو آدمیوں سے رحم اور مفاہمت کی توقع رکھ ہی نہیں سکتا تھا۔ وہ قتل کرنا ہی جانتے تھے لیکن ایسے رحم دل نہیں تھے کہ فوراً مار ڈالتے' وہ بڑی ظالمانہ ایذارسانی سے جان نکالتے تھے۔

احمد بڑی تیزی سے سوچ رہا تھا۔

"اس شہر میں تمہارے ساتھی کہاں کہاں رہتے ہیں؟" ـــــ عمر نے پوچھا ـــــ "ان کے نام اور گھر فوراً بتا دو..... یہ دیا رکھ دو"۔

احمد اوزال نے دیا اوپر کی طرف سے شمس کے منہ پر مارا اور حیران کن پھرتی سے پہلو بدل کر لات اتنی زور سے عمر کے پیٹ میں ناف کے نیچے ماری کہ عمر کے ہاتھ سے خنجر گر پڑا اور وہ ناف کے نیچے ہاتھ رکھ کر آگے کو جھک گیا۔

احمد اوزال نے بڑی تیزی سے خنجر اٹھا لیا اور جھکے ہوئے عمر کی پیٹھ میں اتنی زور سے گھونپ دیا کہ خنجر کا صرف دستہ باہر رہ گیا۔ احمد نے فوراً خنجر باہر نکالا۔ دوسرا وار کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ عمر گر پڑا تھا۔

احمد اوزال نے دیا شمس کے منہ پر مارا تھا۔ اس سے کمرے میں اندھیرا ہو جانا چاہئے تھا لیکن کمرہ پہلے سے زیادہ روشن ہو گیا تھا کیونکہ دیا خاصا بڑا تھا اور آدھے سے کچھ زیادہ تیل سے بھرا ہُوا تھا اور اس کی بتی خاصی موٹی تھی۔ تیل شمس کی آنکھوں میں چلا گیا اور اس کے چہرے سے تیل اس کے کپڑوں پر گرا تھا۔ اس کی ڈیڑھ دو انچ لمبی داڑھی تھی۔ اتنے بڑے شعلے والی جلتی بتی نے اس کی داڑھی کو آگ لگا دی۔ وہاں سے آگ پلک جھپکتے کپڑوں کو لگی۔

شمس کے ہاتھ سے بھی خنجر گر پڑا اور وہ چیخنے لگا۔ احمد اوزال کے ہاتھ میں عمر کا خنجر تھا۔ اس نے شمس کے ایک پہلو میں خنجر گھونپا اور زور سے دوسرے پہلو کی طرف جھٹکا دیا۔ شمس کا پیٹ چاک ہو گیا اور انتڑیاں باہر آ گئیں۔ شمس گرا۔ اس کے کپڑوں کو آگ لگی ہوئی تھی۔ پیٹ چاک ہُوا تو اس کی چیخیں بند ہو گئیں۔ وہ بہت تڑپا اور ختم ہو گیا۔

یہ سارا عمل چند سیکنڈ میں ہو گیا۔

احمد اوزال نے بڑی تیزی سے اپنی قیمتی چیزیں ایک گٹھڑی میں باندھیں۔ تلوار کمر سے باندھی اور شمس کی لاش کو جلتا چھوڑ کر صحن میں نکلا۔ دروازہ بند کر دیا اور زین اٹھا کر اپنے گھوڑے پر کسی۔ گٹھڑی زین کے ساتھ باندھی اور گھوڑے پر سوار ہو کر اپنے دوست کے گھر پہنچا۔ دستک دی۔ دوست باہر آیا تو احمد اوزال نے اسے سارا واقعہ سنایا۔

"میں مرو جا رہا ہوں" ـــــ اس نے کہا۔

"فوراً نکلو" ـــــ دوست نے کہا ـــــ "صبح تک بہت ہی دور نکل جانا"۔

"مزمل آفندی کا کچھ پتہ نہیں چلا" ـــــ احمد اوزال نے کہا ـــــ "وہ باطنیوں کے قبضے میں آگیا ہے۔ میری نشاندہی اسی نے کی ہے"۔

"جس نے بھی کی ہے" ـــــ دوست نے کہا ـــــ "اور جو کچھ بھی ہُوا ہے' تم یہاں سے نکلو۔ تم خوش قسمت ہو کہ حسن بن صباح کے دو آدمیوں کو

قتل کر کے جا رہے ہو۔ اس کے جانباز قتل کیا کرتے ہیں قتل ہُوا نہیں کرتے"۔

احمد اوزال خدا حافظ کہہ کر روانہ ہو گیا۔ شہر سے وہ آہستہ آہستہ نکلا۔ کچھ دور جا کر اس نے گھوڑے کو ایڑ لگا دی۔

○

امیرالموت مہدی علوی حسن بن صباح اور اس کے تمام آدمیوں کو الموت لے گیا۔ حسن بن صباح کو اس نے اپنے محل کے دو کمرے دیئے جن میں شاہانہ زندگی کی ہر آسائش موجود تھی۔ کمروں میں سجاوٹ ایسی جو صرف بادشاہوں کے ہاں ہی ہُوا کرتی تھی۔ حسن بن صباح نے ان کمروں میں ٹھہرنے سے انکار کر دیا۔

"کسی ایک پیغمبر کا نام لو جس نے ایسی شاہانہ رہائش اختیار کی تھی" — حسن بن صباح نے کہا — "کیا ہمارے رسول صلی اللہ علیہ وسلم بوریا نشین نہیں تھے؟ کیا ہمارے خلفائے راشدین کے بھی ایسے محل ہوتے تھے؟..... نہیں مہدی علوی! میں نبیوں اور پیغمبروں سے بہتر تو نہیں۔ مجھے کٹیا دے دو"۔

"نہیں امام!" — مہدی علوی نے کہا — "آپ کو کٹیا میں بٹھا کر میں خدا کے حضور کیا جواب دوں گا"۔

"میرے اور خدا کے درمیان جو باتیں ہوتی ہیں وہ آپ نہیں جانتے" — حسن بن صباح نے کہا — "میں خدا کے حکم کا پابند ہوں...... ہاں' ایک بات سوچی جا سکتی ہے۔ اگر آپ کو میرا کٹیا میں رہنا پسند نہیں تو سادہ سا کوئی کمرہ دے دیں۔ میری ضرورت یہ ہے کہ سر پر چھت ہو' اور روحانی ضرورت یہ ہے کہ چھت آسمان ہو لیکن یہ آپ کو اچھا نہیں لگتا۔ میں نہیں چاہتا کسی کو میری طرف سے ذرا سی بھی پریشانی ہو"۔

مہدی علوی نے محل سے ہٹ کر ایک مکان حسن بن صباح کے لئے خالی کرا دیا تھا۔ یہ سادہ سا مکان تھا جس میں بہت سے کمرے تھے۔ ایک کمرہ حسن بن صباح کے لئے اور دوسرے کمرے اس کے خاص آدمیوں کے لئے تھے۔ باہر محافظ کھڑے رہتے تھے۔ کسی کو مکان کے قریب بھی جانے کی اجازت نہیں

تھی۔ مہدی علوی جو امیر شہر تھا اور حسن بن صباح کا میزبان بھی تھا' وہ بھی اس مکان تک رسائی حاصل نہیں کر سکتا تھا۔

اس مکان کے اندر کیا ہوتا تھا' کسی کو معلوم نہیں تھا۔ باہر کے لوگ کہتے تھے کہ امام عبادت میں مگن رہتا ہے اور اس پر وحی نازل ہوتی ہے۔ اس کے عقیدت مندوں کے ہجوم میں اضافہ ہوتا چلا جا رہا تھا۔

تاریخ میں آیا ہے کہ احمد بن عطاش اپنے کام اور مطلب کے آدمیوں کو خلجان' شاہ در اور دوسرے شہروں اور علاقوں سے قلعہ الموت میں لا لا کر آباد کر رہا تھا لیکن اس نے اپنے آپ کو پس منظر میں رکھا ہُوا تھا۔ مہدی علوی کو کبھی کبھار ملتا تھا لیکن خلجان اور شاہ در کے قلعہ دار اور امیر شہر کی حیثیت سے' یا حسن بن صباح کے مرید کی حیثیت سے۔

مہدی علوی کو تو پتہ ہی نہیں چل رہا تھا کہ جس شہر کا وہ امیر ہے اس میں ہو کیا رہا ہے۔ حسن بن صباح نے اسے کہا تھا کہ اتنے خوبصورت شہر کے دفاع کا کوئی انتظام نہیں' اس کے لئے فوج کی ضرورت ہے۔ اس نے یہ بھی کہا تھا کہ سلجوقیوں کے پاس بڑی ہی مضبوط فوج ہے۔ وہ کسی بھی وقت حملہ کر کے یہ شہر لے لیں گے۔

حسن بن صباح نے مہدی علوی کو پہلی ملاقات میں ہی اپنے اوپر کشف اور مراقبے کی کیفیت طاری کر کے پیش گوئی کی تھی — "دشمن بڑھ رہا ہے۔ گھٹا گہری ہو رہی ہے۔ اگر آپ نے فوج رکھ لی تو یہ گھٹا جس میں بجلیاں چھپی ہوئی ہیں' اڑ جائے گی اور آپ محفوظ رہیں گے۔ فوج تجربہ کار ہونی چاہئے۔ بغیر فوج کے آپ قلعہ گنوا بیٹھیں گے"۔

مہدی علوی یہ پیش گوئی سن کر گھبرا گیا تھا اور اس نے کہا تھا کہ وہ اتنی زیادہ فوج رکھ نہیں سکتا کیونکہ فوج کے اخراجات پورے کرنا اس کے بس کی بات نہیں۔ حسن بن صباح نے اسے کہا تھا کہ وہ فوج کو صرف دو وقت روٹی دے دیا کرے۔ باقی اخراجات حسن بن صباح نے اپنے ذمے لے لئے اور مہدی علوی کے ساتھ تحریری معاہدہ کر لیا تھا۔

دیکھتے ہی دیکھتے دو ہزار نفری کی فوج بن گئی۔ یہ تمام فوج حسن بن صباح

کے مریدوں کی تھی جو اس پر جانیں قربان کرنے کے لئے تیار رہتے تھے۔ اس فوج کے کمانڈر حسن بن صباح کے اپنے تربیت یافتہ آدمی تھے جو نہ کسی سے رحم مانگتے تھے نہ کسی پر رحم کرتے تھے۔

ایک روز حسن بن صباح نے مہدی علوی کو بلایا۔ مہدی علوی دوڑا آیا اور اس نے حسن بن صباح کے آگے باقاعدہ سجدہ کیا۔

"کیا آپ نے اپنی فوج دیکھ لی ہے؟" — حسن بن صباح نے پوچھا۔

"دیکھ لی ہے یا امام!"

"کیا آپ اپنے اندر کوئی تبدیلی محسوس کر رہے ہیں؟" — حسن بن صباح نے پوچھا۔

"کر رہا ہوں یا امام!" — مہدی علوی نے جواب دیا — "یہ فوج دیکھ کر میں اپنے آپ کو محفوظ ہی نہیں بلکہ طاقتور سمجھ رہا ہوں۔ کبھی یوں بھی محسوس کرتا ہوں کہ سلجوقی سلطانوں کو یا کسی اور قوم کو للکاروں کہ میرے مقابلے میں آئے"۔

"نہیں امیر شہر!" — حسن بن صباح نے کہا — "یہ رعونت ہے' تکبر ہے۔ ایسا نہ سوچیں..... میں نے آپ کو کچھ اور بتانے کے لئے بلایا ہے۔ گزشتہ رات مجھے اللہ کی طرف سے ایک اشارہ ملا ہے..... الموت میں جنت بنے گی۔ یہاں حوریں اتریں گی' فرشتے اتریں گے اور یہاں ہر لمحہ اللہ کی رحمت برستی رہے گی"۔

مہدی علوی کی باچھیں کھلتی جا رہی تھیں۔ وہ محسوس نہیں کر رہا تھا کہ حسن بن صباح اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے بات کرتا ہے اور ایک لمحے کے لئے بھی آنکھیں ادھر اُدھر نہیں کرتا۔ اس کے علاوہ اس کے بولنے کا انداز اتنا پیارا اور اتنا اثر انگیز ہے کہ اس کے منہ سے نکلا ہُوا ایک ایک لفظ سننے والے کی روح میں اترتا جا رہا ہے۔

یہ تھا ایک ابلیسی وصف جو حسن بن صباح نے اپنے آپ میں پیدا کر لیا تھا۔ اس انداز میں ہپناٹائز کر لینے کی طاقت تھی۔ مہدی علوی ہپناٹائز ہو چکا تھا۔

"میں آپ کو ایک بات اور بتاتا ہوں" — حسن بن صباح نے کہا — "ابھی یہ بات بتانی تو نہیں چاہئے تھی لیکن یہ جگہ آپ کی ہے اور یہاں جو کچھ ہے آپ کا ہے..... یہ جو آپ کو بڑی ہی حسین لڑکیاں نظر آتی ہیں' یہ میرے ساتھ آئی ہیں' یہ دراصل حوریں ہیں۔ آسمان کی مخلوق ہیں جو زمین پر بسنے والی عورتوں کے روپ میں میرے پاس آگئی ہیں۔ اگر یہ اس دنیا کی لڑکیاں ہوتیں تو میں انہیں اپنے پاس نہ رکھتا"۔

"یہ خدیجہ اور دوسری لڑکیاں....."

"ہاں ہاں؟" — حسن بن صباح نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا — "یہ آسمانی مخلوق ہے لیکن آپ انہیں زمین کی مخلوق سمجھیں۔ ان سے جو خدمت لینا چاہیں' لیں۔ ان کی روحیں میرے قبضے میں ہیں۔ انہیں اپنا سمجھیں"۔

حسن بن صباح کو معلوم تھا کہ اس کی بہت ہی حسین اور فریب کاری کی ماہر جواں سال عورت خدیجہ مہدی علوی پر چھا گئی ہے اور مہدی علوی اسے رات اپنے پاس رکھتا ہے۔ اسے یہ بھی معلوم تھا کہ دو تین نوجوان لڑکیاں بھی مہدی علوی کے ہوش گم کئے رکھتی ہیں۔ خدیجہ مہدی علوی کو خاص قسم کا شربت بھی پلا رہی تھی اور اس پر دیوانگی طاری کر کے اس سے اپنا دامن بھی بچا رہی تھی۔

"یا امام!" — مہدی علوی نے التجا کے لہجے میں کہا — "ایک عرض ہے۔ اجازت ہو تو....."

"میرے ساتھ بات کرنے کے لئے اجازت کی ضرورت نہیں" — حسن بن صباح نے کہا — "اگر کوئی بات میرے خلاف بھی دل میں آئے تو بلا خوف کہو..... اب بتاؤ کیا بات ہے؟"

"میں خدیجہ کی بات کرنا چاہتا ہوں" — مہدی علوی نے جھکتے ہوئے کہا۔

"آپ اس کے ساتھ شادی کرنا چاہتے ہیں" — حسن بن صباح نے کہا — "انسان کے دل کی بات اس کے چہرے پر لکھی ہوتی ہے۔ پڑھنے والی آنکھ چاہئے..... دلوں کی تحریر روح کی آنکھ سے پڑھی جاتی ہے"۔

مہدی علوی جو اچھا خاصا دانشمند اور معزز ہُوا کرتا تھا' حسن بن صباح کی

اس بات پر حیران رہ گیا کہ اس نے اس کے دل کی بات پڑھ لی ہے' حالانکہ یہ بات قابلِ فہم تھی کہ خدیجہ حسن بن صباح کے ساتھ آئی تھی۔ مہدی علوی نے خدیجہ سے کہا تھا کہ وہ اس کے ساتھ شادی کرنا چاہتا ہے۔ اب وہ اتنی سی بات نہ سمجھ سکا کہ خدیجہ نے ہی حسن بن صباح کو یہ بات بتائی ہو گی لیکن مہدی علوی کی اتنی برین واشنگ ہو چکی تھی کہ عام فہم باتیں بھی سمجھنے کے قابل نہیں رہا تھا۔

داستان گو اگلے باب میں مہدی علوی کی برین واشنگ کا عمل تفصیل سے سنائے گا۔

"ہاں امام!" — مہدی علوی نے کہا — "آپ نے میرے دل کی تحریر پڑھ لی ہے لیکن آپ فرماتے ہیں کہ یہ حوریں ہیں جو زمین کی عورتوں کے روپ میں آئی ہیں"۔

"پھر بھی اس کے ساتھ آپ کی شادی ہو سکتی ہے" — حسن بن صباح نے کہا — "شرط یہ ہے کہ آپ کو انسانیت کی سطح سے اوپر اٹھنا پڑے گا' اور یہ کوئی مشکل کام نہیں"۔

"کیا مجھے کچھ کرنا پڑے گا؟" — مہدی علوی نے احمقوں کے انداز سے پوچھا۔

"ہاں!" — حسن بن صباح نے جواب دیا — "روح کی سوئی ہوئی قوتوں کو بیدار کرنا پڑے گا"۔

"وہ کیسے؟"

"مراقبہ..... چلّہ کشی!" — حسن بن صباح نے کہا — "ریاضت..... آپ کو تنہائی میں دنیا سے لاتعلق ہو کر میری طرح اللہ کے حضور بیٹھنا پڑے گا..... آپ یہ کام کر لیں گے اور میرے والا مقام حاصل کر لیں گے۔ آپ دیکھ رہے ہیں کہ لڑکیاں پروانوں کی طرح میرے ارد گرد منڈلاتی رہتی اور میرے آگے بچھ بچھ جاتی ہیں"۔

"کیا آپ میری راہنمائی کریں گے؟" — مہدی علوی نے پوچھا۔

"آپ نے جس پیار اور عقیدت سے مجھے اپنے ہاں مہمان رکھا ہے میں

اس کا صلہ ضرور دوں گا" — حسن بن صباح نے کہا — "میری راہنمائی کے بغیر آپ یہ کام کر ہی نہیں سکتے۔ میں آپ کا ہاتھ تھاموں گا"۔

مہدی علوی ذہنی اور روحانی طور پر حسن بن صباح کی نظر نہ آنے والی زنجیروں میں جکڑا گیا۔ اسے ذرا سا بھی شک نہ ہُوا کہ الموُت جیسا مضبوط' ناقابلِ تسخیر اور خوبصورت قلعہ ہاتھ سے جا رہا ہے۔ اس کی تو اپنی شخصیت پر' اپنی ذات اور اپنے کردار پر گرفت نہیں رہی تھی' اتنے بڑے قلعے اور اتنے بڑے شہر کو وہ کیسے گرفت میں رکھ سکتا تھا۔

الموُت پر حسن بن صباح نے ابھی باقاعدہ قبضہ تو نہیں کیا تھا' امیر شہر اس کے قبضے میں آ گیا تھا۔

○

احمد اوزال چوتھے دن مرو پہنچ گیا۔ نظام الملک سے ملا اور اسے سنایا کہ مزمل آفندی لاپتہ ہے۔

"ایسے جذباتی اور اناڑی آدمی کو اتنی خطرناک مہم پر بھیجنا ہی نہیں چاہئے تھا" — احمد اوزال نے کہا — "مجھے یقین ہے کہ وہ حسن بن صباح کے خفیہ گروہ کے ہاتھ چڑھ گیا ہے اور میری نشاندہی اسی نے کی تھی۔ یہ تو اللہ نے میری مدد کی اور میں دو آدمیوں کو مار کر نکل آیا ورنہ میں قتل ہو جاتا"۔

"مزمل کو انہوں نے قتل کر دیا ہو گا" — نظام الملک نے کہا — "تم آرام کرو۔ میں کچھ سوچ لوں"۔

"محترم!" — احمد اوزال نے کہا — "میں آپ کو صاف صاف بتا دوں۔ ہم ان باطنیوں کو جاسوسی اور تخریب کاری کے میدان میں شکست نہیں دے سکتے۔ آپ کے پاس فوج ہے۔ سلطان کو الموُت پر حملہ کرنا پڑے گا..... مزمل آفندی کو بھول جائیں۔ اسے وہ لوگ قتل کر چکے ہوں گے"۔

اُس وقت مزمل بن عابد کے ساتھ قلعہ الموُت پہنچ گیا تھا۔ بن عابد اسے اُس مکان میں لے گیا جس کے ایک کمرے میں حسن بن صباح رہتا تھا۔ مزمل کو ایک کمرے میں بٹھا کر بن عابد اُس کمانڈر سے ملا جس کی اجازت کے بغیر کوئی شخص حسن بن صباح کے کمرے کے قریب سے بھی نہیں گزر سکتا تھا۔ بن عابد

گے۔ کمانڈر کو بتایا کہ وہ سلجوقیوں کے بھیجے ہوئے ایک آدمی کو لایا ہے۔ یہ آدمی حسن بن صباح کو قتل کرنے کے لئے بھیجا گیا ہے۔

کمانڈر نے بن عابد سے پورا واقعہ سنا اور اسے حسن بن صباح کے پاس لے گیا۔ بن عابد نے ایک بار پھر پوری بات سنائی کہ اس نے مزمل کو کس طرح پکڑا اور کیا دھوکہ دے کر ساتھ لے آیا ہے۔

حسن بن صباح کے ہونٹوں پر طنزیہ مسکراہٹ آگئی۔ ان ہونٹوں سے یہی حکم نکلا تھا ——— "سر کاٹ دو"۔ ——— حسن بن صباح قتل سے کم سزا نہیں دیا کرتا تھا لیکن.....

"اسے بند کر دو" ——— حسن بن صباح نے کہا ——— "دو دن نہ کھانے کے لئے دو نہ پینے کے لئے' پھر مجھے اطلاع دیں میں اسی شخص کو نظام الملک کے قتل کے لئے تیار کروں گا۔ یہ شخص نظام الملک کو قتل کر کے خوشی محسوس کرے گا"۔

مزمل آفندی کمرے میں بیٹھا اپنے نئے دوست بن عابد کا انتظار کر رہا تھا۔ وہ بہت خوش تھا کہ اسے اپنا ایک ہم خیال مل گیا تھا۔ بن عابد بھی اسی جذبے سے سرشار تھا جس جذبے نے مزمل آفندی کو دیوانہ بنا رکھا تھا۔ اس کے دماغ پر خون سوار تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ حسن بن صباح کو وہ کس طرح قتل کرے گا۔ اس نے یہ بھی سوچ لیا تھا کہ وہ حسن بن صباح کا سر کاٹ کر اپنے ساتھ لے جائے گا اور سلطان ملک شاہ کو پیش کرے گا' پھر وہ اس سر کو برچھی کی انی میں اڑس کر مرو کے سارے شہر میں اس کی نمائش کرے گا۔

تھوڑی دیر بعد کمرے کا دروازہ کھلا۔ مزمل آفندی نے چونک کر دروازے کی طرف دیکھا۔ اسے معلوم تھا کہ بن عابد کے سوا اور کوئی نہیں ہو سکتا۔ بن عابد نے اسے یہ تو بتایا ہی نہیں تھا کہ یہ اسی شخص کا گھر ہے جسے وہ قتل کرنے آیا ہے۔ اس نے دیکھا کہ کمرے میں داخل ہونے والا بن عابد نہیں تھا بلکہ وہ دو اجنبی تھے جنہیں مزمل نے پہلے دیکھا ہی نہیں تھا۔

"کیا تم بن عابد کے ساتھ آئے ہو؟" ——— ایک آدمی نے مزمل سے پوچھا۔

"ہاں" ——— مزمل نے جواب دیا ——— "میں ہی ہوں"۔

"ہمارے ساتھ آؤ" ——— اس آدمی نے کہا۔

مزمل اٹھا اور ان کی طرف بڑھا۔ دونوں آدمی اسے اپنے درمیان رکھ کر چل پڑے۔

"بن عابد کہاں ہے؟" ——— مزمل نے پوچھا۔

"وہ یہیں ہے" ——— مزمل کو جواب ملا ——— "ہم تمہیں اسی کے پاس لے جا

رہے ہیں"۔

وہ چلتے گئے اور شہر کے ایک اور حصے میں جا پہنچے۔ یہ کہیں بھی نہ رُکے۔ شہر ختم ہو رہا تھا۔ مزمل آفندی نے سوچا کہ بن عابد اتنی جلدی کہاں چلا گیا ہے۔

"تم مجھے کہاں لے جا رہے ہو؟" — مزمل نے پوچھا — "کیا وہ اتنی جلدی اتنی دُور نکل آیا ہے؟"

"ہم جانتے ہیں میرے دوست!" — ایک آدمی نے کہا — "تم حسن بن صباح کا کام تمام کرنے آئے ہو نا!"

"ہاں بھائی!" — مزمل نے کہا۔

"تو پھر ہم سے کچھ بھی نہ پوچھو" — دوسرے آدمی نے کہا — "ہم سب تمہارے ساتھ ہیں۔ تم وہ کام اکیلے نہیں کر سکتے جو کرنے آئے ہو۔ خاموشی سے ہمارے ساتھ چلتے چلو"۔

وہ اب ایسے علاقے میں سے گزر رہے تھے جہاں بے آب و گیاہ چٹانیں تھیں۔ یہ خطہ سرسبز اور روح پرور تھا لیکن اس کا یہ تھوڑا سا حصہ بالکل خشک، بنجر اور ویران تھا۔ گھاس کی ایک پتی بھی نظر نہیں آتی تھی۔ اگر وہاں کوئی درخت تھا بھی تو وہ بالکل خشک تھا۔

وہ چٹانوں کے اندر چلے گئے۔ چند ایک موڑ کاٹ کر اور چٹانوں کے اندر ہی گھوم پھر کر وہ اس چٹانی سلسلے سے باہر نکلے۔ آگے دیکھا تو کچھ اور ہی منظر تھا۔ سامنے قلعے کی طرح ایک عمارت تھی۔ اس کی دیواریں پتھروں کی تھیں اور پتھر بدرنگ اور سیاہ تھے۔ یہ چھوٹا سا قلعہ ہی معلوم ہوتا تھا۔ دیواریں بہت اونچی تھیں۔ دیواروں کے چاروں کونوں پر لکڑی کے جھونپڑے سے بنے ہوئے تھے۔ یہ برج معلوم ہوتے تھے۔ سامنے والی دیوار کے درمیان ایک بہت بڑا آہنی دروازہ تھا جس میں سلاخیں لگی ہوئی تھیں۔ دو آدمی برچھیاں اٹھائے اس دروازے کے باہر یوں کھڑے تھے جیسے پہرہ دے رہے ہوں۔ اس آہنی دروازے کے بالکل اوپر دیوار پر پتھروں کا ہی ایک گرد بنا ہوا تھا۔ پتھروں کا رنگ ایسا ہو گیا تھا جسے دیکھ کر ڈراؤنا سا تاثر پیدا ہوتا تھا۔ مزمل آفندی کچھ بھی نہ سمجھ سکا۔ اس نے ان دو آدمیوں سے پوچھا بھی نہیں کہ یہ کیا عمارت ہے۔ اس نے خود ہی سوچ لیا کہ یہ قلعے کے اندر ایک چھوٹا سا

قلعہ ہے۔ یہ شاہی خاندان کے لئے بنایا گیا ہوگا کہ جب کوئی دشمن قلعے کا محاصرہ کرے تو شاہی خاندان اس اندرونی قلعے میں منتقل ہو جاتا ہوگا۔

مزمل آفندی کو بتانے والا کوئی نہ تھا کہ یہ جگہ شاہی خاندان کے لئے نہیں بلکہ یہ الموت کا ہیبت ناک قید خانہ ہے جہاں نہ جانے اُس وقت تک کتنے ہزار لوگوں کے سر کٹ چکے تھے اور کتنے ہی ہزار لوگ اس قید خانے کی کال کوٹھڑیوں میں سڑ کر گل سڑ گئے تھے۔

وہ قید خانے کے سیاہ کالے آہنی دروازے پر پہنچ گئے۔ اس دروازے کے ایک کواڑ میں چھوٹا سا ایک اور دروازہ تھا۔ اندر سے ایک آدمی چابیوں کا گچھا اٹھائے ہوئے دوڑا آیا اور اندر سے تالا کھولنے لگا۔

"لے آئے ہو اسے!" — دروازہ کھولنے والے نے کہا — "ہمیں اطلاع مل چکی ہے"۔

دونوں آدمی مزمل آفندی کو چھوٹے دروازے میں سے اندر لے گئے۔ جب اس دروازے پر بڑا سا را تالا لگ گیا، اُس وقت مزمل ذرا سا چونکا اور اُس نے ان دو آدمیوں کو سوالیہ نگاہوں سے دیکھا۔ ان دونوں نے اس کا ایک ایک بازو پکڑ لیا اور اسے اندر لے گئے۔

"کون ہے یہ؟"

مزمل نے پیچھے دیکھا۔ وہ آدمی بھی پیچھے پیچھے آ رہا تھا جس نے چھوٹا دروازہ کھولا اور پھر تالا لگا دیا تھا۔ اُس کے ہاتھ میں چابیوں کا وہی گچھا تھا جو مزمل نے دروازے میں داخل ہوتے وقت دیکھا تھا۔ اسی نے پوچھا تھا کہ یہ کون ہے۔

"یہ امام کو قتل کرنے آیا ہے" — مزمل کو اندر لانے والے ایک آدمی نے جواب دیا۔

تینوں آدمیوں نے بڑی زور سے قہقہہ لگایا اور وہ کچھ دیر ہنستے ہی رہے۔ مزمل رک گیا۔

"بن عابد کہاں ہے؟" — مزمل نے پوچھا۔

ایک آدمی نے اُس کی گردن پر پیچھے سے ہاتھ رکھا اور اس قدر زور سے دھکا دیا کہ مزمل تین چار قدم آگے جا کر منہ کے بل گرا۔ وہ اٹھا تو دوسرے آدمی نے اسی

طرح اس کی گردن پر ہاتھ رکھا اور ویسا ہی دھکا دیا۔ مزمل ایک بار پھر منہ کے بل گرا۔ وہ اٹھا تو ایک آدمی نے اسے کندھوں سے پکڑ کر آہستہ آہستہ لٹو کی طرح گھمایا۔

"اچھی طرح دیکھ لو تم کہاں ہو" ۔۔۔ اس آدمی نے کہا۔

مزمل نے دیکھا۔ یہ ایک وسیع و عریض جگہ تھی جو بد رنگ پتھروں کی چار بہت ہی اونچی اونچی دیواروں میں گھری ہوئی تھی۔ ایک طرف پتھروں کی بارکیں سی کمری تھیں۔ بہت سا حصہ میدانی تھا۔ وہاں قیدی مختلف کاموں میں لگے ہوئے تھے۔ ہر ایک قیدی کے پاؤں بیڑیوں میں جکڑے ہوئے تھے۔ پہریدار ہاتھوں میں ہنٹر اٹھائے ان کے درمیان گھوم پھر رہے تھے۔ کوئی قیدی ذرا سی بھی سستی کرتا تو پہریدار اُسے دو تین ہنٹر مار کر اُس کی چیخیں نکال دیتا تھا۔ قیدی پورے لباس میں نہیں تھے۔ سے اوپر ان کے جسم ننگے تھے۔ ان کی پسلیاں گنی جا سکتی تھیں۔ ان کے چہرے سوکھ گئے تھے۔ چہروں پر کربناک تاثر تھا۔ ان قیدیوں کے دو ہی کام تھے۔ ایک جانوروں کی طرح مشقت کرنا اور دوسرا مار کھانا۔ مزمل کے قریب جو قیدی تھے، ان کی پیٹھوں پر لمبے لمبے لال سرخ نشان تھے۔ یہ ہنٹر اور بیدوں کے نشان تھے۔

مزمل آفندی پر ہول طاری ہو گیا۔ وہ اگر حسن بن صباح کو قتل کر کے اس قید خانے میں آتا تو اُسے ذرا سا بھی افسوس نہ ہوتا۔ وہ تو پہلے ہی پکڑا گیا تھا۔ اُس کا خیال تھا کہ اُس کا ساتھی بن عابد بھی پکڑا گیا ہو گا اور اُسے بھی اس قید خانے میں لایا گیا ہو گا یا اُسے لے آئیں گے۔ اُسے تو وہم بھی نہیں ہوا تھا کہ جس پر اُس نے اعتماد کیا اور اُس کا ہم سفر بن کر الموت آیا تھا، اس کا نام بن عابد نہیں تھا۔ اس کا اصل نام کچھ اور تھا۔ بن عابد حسن بن صباح کے خاص گروہ کا آدمی تھا۔

آگے ایک اور اونچا دروازہ آ گیا۔ یہ لکڑی کا دروازہ تھا جس کے آگے تالا لگا ہوا تھا۔ یہ بھی ایک عمارت تھی جس کی دیواریں پتھروں کی بنی ہوئی تھیں۔ چابیوں والے سنتری نے آگے ہو کر دروازہ کھولا۔ مزمل کو دھکیلتے ہوئے اس کے اندر لے گئے۔ آگے سیڑھیاں نیچے اترتی تھیں۔ وہ سیڑھیاں اتر گئے۔ یہ ایک راہداری تھی۔ نیچے جا کر چند قدم آگے گئے تو ایک دیوار آ گئی۔ وہ بائیں کو گھومے۔ کچھ اور آگے جا کر دائیں کو مڑے تو پھر پانچ چھ سیڑھیاں آ گئیں جو نیچے کو اترتی تھیں اور ایک ذرا

فراخ راہداری تھی جس میں یہ لوگ آگے چلے گئے۔ مزمل کو یوں محسوس ہوا جیسے اسے زمین کی آخری تہہ تک لے جایا جا رہا ہو۔ اسے یاد ہی نہ رہا کہ وہ کتنی بار دائیں یا بائیں مڑ چکا ہے۔ آخر وہ جگہ آ گئی جس کے دونوں طرف آمنے سامنے کوٹھڑیاں تھیں۔

یہ قید خانے کا تاریک تہہ خانہ تھا جسے مشعلوں سے روشن کیا گیا تھا۔ وہاں ایسا تعفن تھا کہ صاف ستھری زندگی بسر کرنے والے مزمل جیسے آدمی کے لئے ناقابلِ برداشت تھا۔ ایک تو دیواروں کے ساتھ اَڑسی ہوئی مشعلوں کے تیل کی بدبو تھی اور دھواں تھا اور اس بدبو میں ایک تعفن ایسا تھا جیسے اس زمین دوز دنیا میں انسانی لاشیں یا جانوروں کے مُردار پڑے گل سڑ رہے ہوں۔ مزمل کو چکر سا آیا اور اس کے قدم رکنے لگے۔ ایک آدمی نے پیچھے سے اس کی کمر میں اتنی زور سے لات ماری کہ وہ چند قدم آگے پتھروں کے فرش پر اوندھے منہ گرا۔ اُس سے تو جیسے اُٹھا ہی نہیں جا رہا تھا۔ اسے گھسیٹ کر اٹھایا گیا اور دھکیل لے گئے۔

وہ دو آدمی جو مزمل کو لائے تھے، قید خانے کے باہر انسانوں کی طرح بولتے اور چلتے تھے لیکن قید خانے میں داخل ہوتے ہی وہ درندے بن گئے۔ مزمل نے دائیں بائیں دیکھا۔ ہر کوٹھڑی کی سلاخوں کی اندر تین چار قیدیوں کو کھڑے دیکھا تو وہ حیران ہوا کہ لاشوں جیسے یہ انسان اپنے پاؤں پر کھڑے کس طرح ہیں۔

مزمل کو ایک اور طرف موڑ کر لے جایا گیا۔ چابیوں والے سنتری نے دوڑ کر ایک کوٹھڑی کا دروازہ کھولا۔ مزمل کو اس کے سامنے کھڑا کر کے یہ نہ کہا گیا کہ اندر چلو بلکہ اسے اس کوٹھڑی میں داخل کرنے کا یہ طریقہ اختیار کیا گیا کہ ایک آدمی نے اس کا ایک بازو پکڑا اور دوسرے نے دوسرا بازو پکڑا اور ذرا آگے ہو کر ان دونوں نے اتنی زور سے مزمل کو اندر کی طرف جھٹکا دیا کہ وہ تنگ سی اس کال کوٹھڑی کی دیوار کے ساتھ جا لگا۔ وہ سر دیوار سے ٹکرانے کی وجہ سے چکرا گیا اور گر پڑا۔ جب ذرا سنبھل کر اور اپنے آپ میں آ کر اٹھا تو دروازہ بند ہو چکا تھا اور اسے کال کوٹھڑی میں پھینکنے والے جا چکے تھے۔

مزمل نے اپنے ماتھے پر ہاتھ رکھا اور دیکھا اُس کا ہاتھ خون سے لال ہو گیا تھا۔ اُس نے کرتے کا دامن ماتھے پر رکھا۔ جب ہٹایا تو دامن خون سے تر ہو گیا تھا۔ اُس

کی مرہم پٹی کرنے والا کوئی نہ تھا۔ حسن بن صباح نے کہا تھا کہ اسے دو دن بھوکا اور پیاسا رکھا جائے۔ مزمل کو اس حکم کا علم نہیں تھا۔ ہوتا بھی تو وہ کیا کر لیتا۔ اس کے ماتھے سے خون بہہ بہہ کر اس کی آنکھوں کے راستے اس کے گالوں پر آکر اس کے سامنے قطرہ قطرہ گرتا رہا۔

مزمل آفندی کا دماغ جو ماؤف ہو گیا تھا، آہستہ آہستہ بیدار ہو گیا اور مزمل سوچنے لگا کہ وہ اس کال کوٹھڑی تک کس طرح آن پہنچا ہے۔ اسے اپنی غلطی کا احساس ہونے لگا۔ احمد اوزال نے اسے کہا بھی تھا کہ سلطان ملک شاہ اور نظام الملک حسن بن صباح کے ہاتھوں قتل ہو سکتے ہیں، اسے قتل کرا نہیں سکتے۔ احمد اوزال کی اس بات پر مزمل نے توجہ نہیں دی تھی۔ وہ یہ سمجھتا رہا کہ حسن بن صباح کوئی عام سا فریب کار آدمی ہے جو ادھر ادھر گھومتا پھرتا بھی ہو گا اور اسے آسانی سے قتل کیا جا سکے گا۔ مزمل کے جذبے کا یہ عالم تھا کہ وہ حسن بن صباح کے قتل کے لئے اپنی جان قربان کر دینے کا عہد کر کے آیا تھا۔ مزمل جذبات میں الجھ کر جس طرح خلجان پہنچا تھا اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ سلطان ملک شاہ اور اس کے وزیر اعظم نظام الملک نے اسے نہیں روکا تھا اور اسے یہ نہیں بتایا تھا کہ حسن بن صباح کوئی معمولی سا آدمی نہیں بلکہ وہ اس علاقے کے لوگوں کے دلوں پر راج کرتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ سلطان اور وزیر اعظم کو خود معلوم نہیں تھا کہ حسن بن صباح کیا طاقت حاصل کر چکا ہے۔ مزمل کے لئے اب ہر سوچ محض بیکار تھی۔ اسے بن عابد یاد آیا تو اسے احساس ہوا کہ حسن بن صباح کے یہ لوگ کس قدر عقلمند اور تجربہ کار ہیں کہ بن عابد نے اسے پتہ ہی نہیں چلنے دیا تھا کہ وہ حسن بن صباح کے ایک خاص گروہ کا آدمی ہے۔

مزمل آفندی کا خون بہتا رہا، اس کا دماغ سوچ سوچ کر تھک گیا اور وہ دروازے کی سلاخیں پکڑ کر کھڑا ہو گیا۔ وہ پیاس سے مرا جا رہا تھا مگر وہاں اسے پانی پلانے والا کوئی نہ تھا۔ کوئی ہوتا بھی تو اس نے مزمل کو پانی نہیں دینا تھا۔

○

رات کے کھانے کے بعد امیر الموت حسن بن صباح کے پاس گیا۔ اسے اس احترام سے بٹھایا گیا جس احترام کا وہ حقدار تھا اور اسے بتایا گیا کہ امام عبادت میں مصروف ہیں اور کچھ دیر بعد باہر آئیں گے۔ مہدی علوی اس کے انتظار میں بیٹھ گیا۔

حسن بن صباح جس عبادت میں مصروف تھا، وہ یہ تھی کہ وہ شراب پی رہا تھا اور اس کے ساتھ اس کے زنانہ گروہ کی دو سب سے زیادہ حسین لڑکیاں تھیں۔ اسے اطلاع دے دی گئی کہ امیر الموت ملنے آیا ہے۔

خاصا انتظار کروا کر حسن بن صباح اس کمرے میں آیا جہاں مہدی علوی بیٹھا تھا۔ مہدی علوی اسے اٹھ کر اس طرح ملا کہ اس کے آگے رکوع میں چلا گیا اور اس کے گھٹنے چھو لئے۔

مہدی علوی کی اہمیت صرف یہ تھی کہ وہ الموت کا امیر تھا۔ اس کے علاوہ وہ کچھ بھی نہیں تھا۔ وہ جنگجو بھی نہیں تھا اور اس نے کوئی لڑائی فتح نہیں کی تھی۔ وہ ولی اللہ بھی نہیں تھا اور زاہد، صوفی بھی نہیں تھا، عالم دین بھی نہیں تھا۔ وہ قلعے یا کسی بھی شہر کے امراء جیسا ایک امیر تھا۔ وہ عیش و عشرت کا دلدادہ تھا اور اسی کو وہ زندگی سمجھتا تھا۔ اس میں ہر وہ عیب تھا جو امراء میں ہوتا تھا۔ وہ حسین عورتوں کا شیدائی اور خزانے کا عاشق تھا۔ حسن بن صباح نے اس کی یہ خواہش معلوم کر لی تھی کہ وہ اس کے گروہ کی ایک بڑی ہی خوبصورت اور جوان عورت خدیجہ کے ساتھ شادی کرنا چاہتا تھا۔

"یا امام!" — مہدی علوی نے حسن بن صباح سے منت سماجت کے لہجے میں کہا — "آپ نے کہا تھا کہ آپ مجھے چلہ کاٹنے کے سلسلے میں کچھ راہنمائی کریں گے"۔

"آپ اچھے وقت آگئے ہیں" — حسن بن صباح نے کہا — "مجھے گزشتہ رات اشارہ ملا ہے کہ آپ کہاں بیٹھ کر چلہ کریں گے۔ یہ سوچ لیں کہ چلہ چالیس دن کرنا پڑے گا۔ آپ ایک جگہ بیٹھے رہیں گے اور چالیس دن وہاں گزارنے ہوں گے"۔

"یا امام!" — مہدی علوی نے کہا — "آپ جو بتائیں گے وہ میں کروں گا"۔

"گزشتہ رات ہی مجھے صاف ایک تصویر نظر آئی ہے" — حسن بن صباح نے کہا — "کسی بھی وقت میں آپ کو بلاؤں گا۔ آپ نے اسی وقت جنگل کی طرف میرے ساتھ چلنا ہو گا۔ وہاں اس جگہ کا اشارہ ملے گا جہاں آپ ایک دائرے میں بیٹھ کر چلہ کریں گے۔ میں آپ کو بتاؤں گا کہ آپ نے کیا پڑھنا ہے۔ یہ ایک ورد ہو گا

جو آپ چالیس دن کریں گے۔ دن نہیں بلکہ رات کہیں کیونکہ چلہ رات کو ہوگا دن کے وقت آپ سو سکتے ہیں اور آپ کے خیمے کے اندر ہی رہنا ہے"۔

حسن بن صباح نے مہدی علوی میں وہ تمام کمزوریاں بیدار کر کے انہیں اس کی عقل پر غالب کر دیا تھا جن انسانی کمزوریوں نے بادشاہیوں کے تختے الٹے ہیں۔ ان کمزوریوں میں ایک تو خوبصورت عورت ہے، دوسری ایسا خزانہ جو کبھی ختم نہ ہو اور تیسری کمزوری یہ کہ شب و روز عیش و عشرت میں گزریں۔ مہدی علوی اپنے گھر چلا گیا۔

اگلے روز دوپہر کے وقت مہدی علوی کو حسن بن صباح نے یہ پیغام بھیجا کہ وہ گھوڑے پر سوار ہو کر فوراً" آجائے۔

حسن بن صباح تیار ہو کر باہر نکل آیا تھا۔ اس کا گھوڑا تیار کھڑا تھا۔ اس کے ساتھ اپنے چند ایک آدمی تھے۔

مہدی علوی تھوڑی سی دیر میں گھوڑے پر سوار ہوا اور وہ جنگل کی طرف روانہ ہو گئے۔ ایک جنگل تو وہ تھا جو بہت ہی خوشنما اور سرسبز تھا۔ لوگ وہاں سیر سپاٹے کے لئے جایا کرتے تھے۔ جنگل کا ایک حصہ ایسا تھا جہاں اونچی نیچی چٹانیں تھیں اور وہاں اتنی ہریالی نہیں تھی کہ اس علاقے کو دیکھنے کے قابل سمجھا جاتا۔ حسن بن صباح شہر سے بہت دور اس علاقے میں جا پہنچا۔

"جگہ یہی ہے" ــــ حسن بن صباح نے کہا ــــ "لیکن یہ اشارہ ابھی ملنا باقی ہے کہ آپ کا خیمہ کس جگہ لگایا جائے ..... یہ اشارہ ایک کبوتر دے گا۔ ایک کبوتر اڑتا آئے گا وہ درخت پر نہیں بلکہ زمین پر بیٹھے گا۔ جہاں کبوتر زمین پر اترے گا اس جگہ خیمہ لگتا ہے اور آپ وہاں چلہ پورا کریں گے"۔

حسن بن صباح نے اوپر دیکھنا شروع کیا۔ وہ فضا میں ہر طرف دیکھ رہا تھا۔ مہدی علوی اور دوسرے چند ایک جو آدمی تھے وہ بھی آسمان کی طرف دیکھنے لگے۔

"بتا دے اللہ!" ــــ حسن بن صباح نے آسمان کی طرف منہ کر کے کہا ــــ "بتا دے اللہ، بتا دے"۔

بہت وقت گزر گیا۔ مہدی علوی تو بہت ہی بے چین تھا۔ اسے کوئی بھی پرندہ اڑتا نظر آتا تو وہ کہہ اٹھتا، وہ رہا کبوتر لیکن وہ کبوتر نہیں ہوتا تھا اور وہ جو پرندہ بھی

ہوتا، آگے نکل جاتا تھا۔

"وہ دیکھئے" ــــ ایک آدمی نے بلند آواز میں کہا ــــ "وہ بلاشک و شبہ کبوتر ہے"۔

سب نے دیکھا، وہ کبوتر تھا اور وہ دوسرے پرندوں کی طرح سیدھا نہیں اڑتا جا رہا تھا بلکہ زمین پر اترتا آ رہا تھا۔ آخر وہ ایک جگہ زمین پر اترا اور ایک طرف کو چل پڑا۔ حسن بن صباح گھوڑے سے کود کر اترا۔ مہدی علوی بھی گھوڑے سے اترا۔

حسن بن صباح نے اس جگہ پر جا پاؤں رکھا جہاں پر کبوتر اترا تھا۔

"یہاں خیمہ لگے گا" ــــ حسن بن صباح نے مہدی علوی سے کہا ــــ "ابھی اپنے آدمی بھیجو جو یہاں سپاہیوں والا خیمہ گاڑ دیں"۔

○

دو مؤرخوں نے دو مختلف حکایتیں لکھی ہیں کہ حسن بن صباح نے قلعہ الموت پر کس طرح قبضہ کیا تھا لیکن یہ دونوں حکایتیں قابلِ اعتبار نہیں لگتیں۔ داستان گو یہاں ان کا بیان موزوں نہیں سمجھتا۔ تین اور مؤرخوں نے یہ واقعہ بیان کیا ہے جو بالکل صحیح معلوم ہوتا ہے۔ دھوکا دہی اور فریب کاری میں حسن بن صباح کو غیر معمولی مہارت حاصل تھی۔ یہ تو پہلے بیان ہو چکا ہے کہ حسن بن صباح اپنے سامنے بیٹھے ہوئے آدمی کو صرف متاثر ہی نہیں بلکہ بولنے کے انداز سے اور الفاظ کے انتخاب سے ہپناٹائز کر لیا کرتا تھا۔ یہ بھی بیان ہو چکا ہے کہ مہدی علوی کے اندر نفسانی خواہشات ابھر آئی تھیں جو حسن بن صباح نے خاص طور پر ابھاری تھیں۔

قرآنِ پاک میں واضح الفاظ میں اللہ تبارک و تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ جو بھی مصیبت میرے بندوں پر آتی ہے وہ بندوں کے اپنے اعمال کی وجہ سے آتی ہے۔ مہدی علوی نے اپنے اعمال کو اور اپنی سوچوں کو اپنی نفسانی خواہشات کے تابع کر لیا تھا۔ اب یہ دیکھیں کہ حسن بن صباح نے الموت جیسا قلعہ بند شہر مہدی علوی سے کس طرح خون کا ایک قطرہ بھی بہائے بغیر لے لیا۔

آہستہ آہستہ یہ خبر شہر میں پھیل گئی کہ امیرالموت تارک الدنیا ہو گیا ہے اور اس نے جنگل کے ویران اور اجاڑ حصے میں جا خیمہ لگایا اور وہاں اللہ اللہ کرتا رہتا ہے۔ اس طرف کسی کو جانے کی اجازت نہیں تھی۔ خیمے سے دور دور دو تین آدمی

گھومتے رہتے تھے جو کسی بھی آدمی کو اس طرف جانے نہیں دیتے تھے۔ خیمے کے اندر مہدی علوی کا بستر تھا جو فرش پر بچھایا گیا تھا۔ جہاں کبوتر زمین پر اترا تھا اُس جگہ ایک مصلّیٰ بچھا دیا گیا تھا۔ مہدی علوی سورج غروب ہونے کے کچھ دیر بعد قبلہ رو ہو کر بیٹھ جاتا اور ان الفاظ کا ورد شروع کر دیتا تھا جو اسے حسن بن صباح نے بتائے تھے۔ تاریخ میں وہ الفاظ یا وہ وظیفہ نہیں ملتا جو حسن بن صباح نے مہدی علوی کو بتایا تھا۔

حسن بن صباح نے اسے سختی سے کہا تھا کہ پہلے دو دن اور دو راتیں وہ صرف پانی پی سکتا ہے لیکن کچھ کھا نہیں سکتا۔ اس نے مہدی علوی کو کہا تھا کہ وہ اپنی ذات کو اور اپنی ضروریات کو بالکل بھول جائے' اور اگر وہ دو دن کچھ کھائے پیئے بغیر تکلیف کے گزار گیا تو جنگل کے درخت بھی اس کے آگے سجدہ کریں گے اور جنگل میں چلتے اگر شیر بھی اس کے سامنے آجائے گا تو اسے راستہ دے دے گا۔

"تیسرے روز میں خود یہاں آؤں گا" ــــ حسن بن صباح نے اسے کہا تھا ــــ "کچھ دیر اس مصلے پر بیٹھوں گا اور کشف کے ذریعے مراقبے میں جا کے بتاؤں گا کہ یہ چلّہ آپ کو کیا کچھ دے گا؟"۔

اسے یہ بھی بتا دیا گیا تھا کہ ایک آدمی اس کے خیمے کے باہر حاضری میں موجود رہے گا جو اسے پانی پلاتا رہے گا۔

مہدی علوی کو بتانے والا کوئی نہ تھا کہ وہ کبوتر جو اُڑتا آیا اور زمین پر بیٹھ گیا تھا' وہ خود نہیں آیا تھا۔ اس جگہ کے قریب ہی ایک چٹان تھی۔ حسن بن صباح کا ایک آدمی کبوتر لے کر بہت پہلے اس چٹان کے پیچھے چلا گیا تھا۔ اس نے کبوتر کے پر کھینچ لئے اور اُسے ابھی اُڑان کے قابل چھوڑا ہی نہیں تھا۔ حسن بن صباح مہدی علوی کو ساتھ لے کر وہاں گیا تو ادھر سے اس آدمی کو ایک مخصوص اشارہ ملا۔ اُس نے چٹان کے پیچھے سے کبوتر کو زور سے اوپر پھینکا۔ کبوتر زیادہ اُڑنے کے قابل نہیں تھا۔ وہ جتنا اُڑ سکا اڑا اور زمین کی طرف آنے لگا' حتیٰ کہ وہ اس جگہ زمین پر اُتر آیا۔ حسن بن صباح فوراً" اس جگہ پہنچا اور جہاں کبوتر اترا تھا وہاں پاؤں رکھ دیا۔ مہدی علوی کی توجہ حسن بن صباح کی طرف تھی۔ اس کی عقل پر حسن بن صباح نے پردہ ڈال دیا تھا۔ وہ دیکھ ہی نہ سکا کہ کبوتر کہاں چلا گیا ہے۔ کبوتر اُڑنے کی بجائے چل پڑا تھا اور چلتے چلتے دور نکل گیا تھا۔

مہدی علوی کے خیمے سے تھوڑے سے فاصلے پر ایک اور خیمہ نصب کیا گیا تھا۔ اس میں ایک آدمی رہتا تھا۔ اس نے پانی کا ذخیرہ اپنے پاس رکھ لیا تھا اور اپنے کھانے پینے کا انتظام بھی اس نے وہیں کر لیا تھا۔ اس شخص نے مہدی علوی کی دیکھ بھال اور خدمت کرنی تھی۔

دن کے وقت جب بھی مہدی علوی اس سے پانی مانگتا وہ اسے پانی پلا دیتا۔ شام کے بعد جب مہدی علوی مصلے پر ورد شروع کرتا تو حسن بن صباح کا یہ آدمی اُسے پانی ضرور پلاتا تھا۔ اس پانی میں تھوڑی سی مقدار میں حشیش ڈال دی جاتی تھی۔ حسن بن صباح نے اپنے اس آدمی سے کہہ رکھا تھا کہ وہ دوسرے تیسرے روز حشیش کی مقدار میں اضافہ کرتا جائے۔

یہ تو ایک نشہ تھا جو مہدی علوی کو دھوکے میں آہستہ آہستہ پلایا جا رہا تھا۔ دوسرا نشہ حسن بن صباح نے اُس پر پہلے ہی طاری کر رکھا تھا۔ اس نشے میں بھی اس نے آہستہ آہستہ اضافہ کرنا تھا۔ دو دن گزر گئے تو حسن بن صباح نے اسے کہا تھا کہ اب وہ اونٹنی کا دودھ پی سکتا ہے لیکن کھا کچھ نہیں سکتا۔ مہدی علوی کو یہ اجازت تھی کہ دن کے وقت وہ قریبی ندی میں جا کر نہا سکتا ہے اور دیگر قدرتی حاجات سے فراغت حاصل کر سکتا ہے۔

چلّے کا ساتواں دن تھا۔ حسن بن صباح نے اسے پیغام بھیجا کہ آج رات تقریباً" نصف شب قریب سے اسے اُلو کی آواز آئے گی۔ وہ اس آواز پر مصلے سے اٹھے اور مصلے کے نیچے عین درمیان سے زمین کھودے۔ حسن بن صباح نے پیغام میں کہا تھا کہ اسے معلوم نہیں کہ زمین میں سے کیا برآمد ہو گا۔ وہ اللہ کی طرف سے کوئی تحریری پیغام بھی ہو سکتا ہے اور کوئی اور چیز بھی ہو سکتی ہے۔ وہ جو کچھ بھی برآمد ہو نکال کر اس جگہ مٹی ڈال دے۔ یہ خیال رکھے کہ اردگرد زیادہ زمین نہ کھودے۔

رات آدھی گزر گئی تھی۔ مہدی علوی مصلے پر بیٹھا چلّہ کر رہا تھا۔ اسے اُلو کی آواز سنائی دی جو قریب ہی سے آئی تھی۔ مہدی علوی فوراً" اٹھا۔ اس کے لئے جو خادم چھوڑا گیا تھا وہ بھی اُلو کی آواز سن کر دوڑا آیا۔ اسے بھی بتا دیا گیا تھا کہ آج رات کیا ہونے والا ہے۔ مہدی علوی نے فوراً" مصلّیٰ ہٹایا۔ خادم نے آکر مصلے کے درمیان کی جگہ سے زمین تھوڑی سی کھودی اور ہاتھ ڈالا تو اُسے کوئی چیز محسوس

ہوئی۔ اُس نے مہدی علوی سے کہا کہ وہ خود یہ چیز نکالے' کہیں ایسا نہ ہو کہ اُس کا یعنی خادم کا ناپاک ہاتھ لگ جائے تو غیب سے آئی ہوئی یہ چیز غیب کو ہی واپس چلی جائے۔

مہدی علوی نے چھوٹے سے اس گڑھے میں ہاتھ ڈالا تو اُس کے ہاتھ ایک چیز آئی جو اس نے باہر نکال لی۔ مشعل کی روشنی میں یہ چیز چمکی تو مہدی علوی پر کوئی اور ہی تاثر طاری ہو گیا۔ وہ جانتا تھا کہ یہ کیا ہے۔ یہ سونے کا ایک چوکور ٹکڑا تھا۔ مہدی علوی نے اس ٹکڑے کو ہتھیلی پر رکھ کر اس کے وزن کا اندازہ کیا۔ یہ ایک پاؤ سے کچھ زیادہ وزنی تھا۔ اس نے گڑھے میں پھر ہاتھ ڈالا تو ایسے ہی دو ٹکڑے اور نکلے۔ حسن بن صباح کی ہدایت کے مطابق گڑھا اس سے گہرا یا چوڑا نہیں کھودنا تھا۔ اُس زمانے میں ان ٹکڑوں کو سونے کی اینٹیں کہا جاتا تھا۔ حسن بن صباح کی ہدایت کے مطابق یہ گڑھا بھروا دیا گیا اور اس پر پھر مہدی علوی نے مصلیٰ بچھا لیا اور خادم سے کہا کہ وہ علی الصبح یہ تینوں ٹکڑے امام کی خدمت میں پیش کر دے۔ مہدی علوی کی ذہنی حالت کچھ اور ہی ہو گئی تھی۔ وہ یوں مسرت و شادمانی محسوس کر رہا تھا جیسے وہ اس حسین اور دلنشیں پگڈنڈی پر جا رہا ہو جو ذرا ہی آگے جا کر جنت میں جا نکلے گی اور اُسے اسی دنیا میں ابدی زندگی حاصل ہو جائے گی۔

فردوسِ بریں سے نکالے ہوئے آدم کو ابلیس جنتِ ارضی میں داخل کر رہا تھا۔ اس جنت کی کوئی حقیقت نہیں تھی' اگر کچھ حقیقت تھی تو وہ تصوراتی تھی۔ انسان جب نفسانی خواہشات کے چنگل میں آ جاتا ہے تو اس کے تصورات اس قدر دلفریب ہو جاتے ہیں کہ وہ حقیقی زندگی سے ناطہ توڑ کر تصوراتی دنیا کو حقیقی سمجھنے لگتا ہے۔ یہ کیفیت مہدی علوی پر طاری ہو چکی تھی۔ اسے یہ بتانے والا کوئی نہ تھا کہ رات کو جو 'اُلّو بولا تھا وہ اُلّو نہیں بلکہ اس کا خادم تھا جس نے خیمے سے ذرا پرے جا کر اُلّو کی آواز نکالی تھی اور یوں دوڑا آیا تھا جیسے اُلّو کی آواز پر اس کی آنکھ کھلی ہو اور وہ مہدی علوی کے پاس پہنچ گیا ہو۔

اُس وقت اس علاقے میں کوئی اُلّو نہیں تھا اگر کوئی اُلّو تھا تو وہ مہدی علوی تھا۔ مہدی علوی کو یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ سونے کے یہ ٹکڑے غیب سے نہیں آئے تھے بلکہ یہ حسن بن صباح کی طرف سے آئے تھے۔ صبح جب مہدی علوی ندی پر گیا

تھا اُس وقت خادم نے مصلے کے نیچے چھوٹا سا گڑھا کھودا اور سونے کے یہ تین ٹکڑے رکھ کر اوپر مٹی ڈال دی تھی اور پھر اس پر مصلیٰ بچھا دیا تھا۔ خادم کو معلوم تھا کہ مہدی علوی کو یہ شک نہیں ہو گا کہ یہاں پہلے ہی گڑھا کھودا گیا تھا۔ خادم نے ہی اُس گڑھے کو کھودنا تھا۔ دھوکا دہی کا یہ کام مشکل نہ تھا۔

○

اگلی صبح مہدی علوی کا خادم جو حسن بن صباح کا خاص آدمی تھا' سونے کے ٹکڑے لے کر شہر آیا اور حسن بن صباح سے ملا۔

"لو امام!" — اس نے کہا — "یہ کام بھی ہو گیا ہے۔ یہ لیں اپنی سونے کی اینٹیں"۔

حسن بن صباح کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آگئی۔

"اس شخص کا چلّہ کامیاب رہے گا" — حسن بن صباح نے ہلکی سی ہنسی سے کہا — "وہ چلّہ کشی ختم کرے گا تو اُس کا یہ شہر الموُت ہمارا ہو گا..... تم جاؤ' اُس کے پاس چلے جاؤ اور کل سے اگلا عمل شروع کر دینا"۔

الموت شہر میں ایک بڑی مسجد تھی۔ شہر کے لوگ جمعہ اور عیدین کی نمازیں اس مسجد میں پڑھا کرتے تھے۔ اس مسجد کا خطیب ایک عالم دین امام شافی تھا۔ تاریخ میں اس کا پورا نام نہیں ملتا سوائے اس کے کہ وہ دُور دُور تک امام شافی کے نام سے مشہور ہو گیا تھا۔ وہ کئی برسوں سے حج کے لئے گیا تھا پھر خانہ کعبہ کا ہی ہو کے رہ گیا۔ لوگ اسے بھول تو نہیں سکتے تھے لیکن وہ یہی سمجھ بیٹھے تھے کہ وہ امام شافی جیسے عالم دین سے محروم ہو گئے ہیں۔ مسجد میں ایک اور خطیب موجود تھا لیکن اس میں وہ بات اور وہ عظمت نہیں تھی جو ضعیف العمر شافی میں تھی۔ جس رات مہدی علوی کو سونے کی تین اینٹیں مصلے کے نیچے سے ملیں' اُس رات اچانک امام شافی آگیا۔ لوگ فجر کی نماز کے لئے مسجد میں گئے تو امام شافی کو دیکھ کر انہیں خوشگوار دھچکا لگا۔ لوگ تو اُسے پیر و مرشد کی طرح مانتے تھے۔ لوگوں نے اُس کے ہاتھ چومے' اس کے آگے صرف سجدہ ریز نہ ہوئے' باقی کسر انہوں نے چھوڑی کوئی نہیں تھی۔ شہر بھر میں خوشی منائی گئی کہ شہر کا محبوب امام اور خطیب واپس آگیا ہے۔

لوگ امام شافی کو دیکھ کر تو خوش ہو گئے لیکن امام شافی لوگوں کو دیکھ کر خوش نہ

ہوا۔ اُس نے پہلی بات یہ دیکھی فجر کی نماز کے وقت اُس تعداد کے آدھے نمازی بھی نہیں تھے جو پہلے ہوا کرتے تھے۔ نماز کے بعد جب لوگ اسے مل رہے تھے اُس نے شہر کے دو معمر بزرگوں سے پوچھا کہ نمازی کہاں کھو گئے؟ اسے جو جواب ملا اُس جواب نے اُسے پریشان کر دیا۔ ابھی اسے تفصیلات معلوم نہیں ہوئی تھیں۔ صرف یہ پتہ چلا کہ ایک اور امام شہر میں آگیا ہے جو مسجد میں تو کبھی نہیں آیا لیکن اپنے گھر میں' سنا ہے' ہر وقت عبادت میں مصروف رہتا ہے۔ امام شامی کو یہ بھی بتایا گیا کہ لوگ اسے صرف امام یا ولی اللہ ہی نہیں بلکہ نبی تک تسلیم کرنے پر آ گئے ہیں۔

امام شامی چپ رہا۔ اُس نے کسی سے کوئی سوال نہ کیا نہ کسی سے کوئی تفتیش کی۔ اس نے سوچ لیا تھا کہ وہ امیرِ شہر مہدی علوی کے پاس جائے گا اور اس سے پوچھے گا کہ شہر میں کیا انقلاب آگیا ہے اور یہ کون سا امام ہے جو مسجد کی بجائے اپنے گھر اکیلا ہی عبادت کرتا ہے۔

مہدی علوی عبادت گزار یا زاہد اور پارسا تھا یا نہیں' یہ ایک الگ بات ہے' وہ امام شامی کا مرید تھا اور دل و جان سے اس کی قدر کرتا تھا۔ قدر بھی اس حد تک کہ انتظامی امور میں امام شامی سے مشورے لیا کرتا اور آخری بات امام شامی کی ہی چلتی تھی۔

نماز سے اور ملاقاتوں سے فارغ ہو کر امام شامی مہدی علوی کے گھر چلا گیا۔ مہدی علوی کی دو بیویاں تھیں' دو بیٹے اور تین چار بیٹیاں تھیں۔ یہ اولاد ابھی لڑکپن میں اور کچھ بچپن میں تھی' ان میں کوئی بھی جوان نہیں تھا۔ اس گھر میں امام شامی کی بڑی قدر و منزلت تھی۔ اُسے دیکھ کر مہدی علوی کی دونوں بیویاں دوڑی آئیں اور اُس کے آگے جھک کر سلام کیا۔ اُس نے پوچھا کہ امیرِ شہر کہاں ہے۔ جواب میں دونوں بیویاں خاموش رہیں اور ان کے چہروں پر اداسی کا تاثر آگیا۔

"کیوں؟" — امام شامی نے پوچھا — "کیا بات ہے؟"

بیویوں نے امام شامی کو اندر بٹھایا اور وہیں بیٹھ گئیں۔

"امیرِ شہر تارک الدنیا ہو کر جنگل میں چلہ کشی کر رہے ہیں" — بڑی بیوی نے کہا — "سات روز گزر گئے ہیں۔ سنا ہے چالیس روز پورے کرنے پڑیں گے"۔

"اس راستے پر اسے کس نے ڈالا ہے؟" — امام شامی نے پوچھا۔

"شہر میں ایک امام آیا بیٹھا ہے" — بڑی بیوی نے کہا — "لوگ اس کے مرید ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ اس کے ساتھ چند ایک اتنی حسین اور نوجوان لڑکیاں ہیں جنہیں دیکھ کر کوئی کہہ نہیں سکتا تھا کہ یہ اس زمین کی پیداوار ہیں' وہ جنت کی حوریں لگتی ہیں"۔

"اور محترم امام!" — چھوٹی بیوی نے کہا — "ہمارے امیرِ شہر بھی اس کے مرید بن گئے ہیں۔ یہ کوئی راز کی بات نہیں کہ ان پر ان حوروں جیسی لڑکیوں کا جادو چل گیا ہے۔ گھر میں انہوں نے ایسی باتیں کی ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ تو خدا کو بھی بھول گئے ہیں اور اس نئے امام کو اپنا امام نہیں بلکہ پیغمبر تسلیم کر لیا ہے جس کا نام حسن بن صباح ہے۔ اسی امام نے امیرِ شہر کو چلہ کشی کے راستے پر ڈالا ہے"۔

"حسن بن صباح؟" — امام شامی نے چونک کر کہا — "وہ یہاں پہنچ گیا ہے؟ اس کی شہرت تو وہاں خلافۃ بغداد تک پہنچ چکی ہے۔ اس شخص کا نام مدینہ میں سنا تھا لیکن سنانے والے نے یہ نہیں کہا تھا کہ یہ شخص کوئی برگزیدہ شخصیت ہے' بلکہ اس نے کہا تھا کہ ابلیس ایک بار پھر دنیا میں انسان کے روپ میں آگیا ہے۔ ایک آدمی ایسا بھی ملا تھا جس نے حسن بن صباح کو برگزیدہ شخصیت کہا تھا۔ میں یہ دیکھتا ہوں کہ جس آدمی نے مہدی علوی جیسے دانشمند آدمی کو چلہ کشی پر لگا دیا ہے وہ اللہ کا برگزیدہ بندہ نہیں ہو سکتا۔ اسلام نے عبادت کا حکم دیا ہے چلہ کشی کا نہیں۔ چلہ کشی دنیاوی مقاصد اور اپنی دنیاوی خواہشات کی تکمیل کے لئے کی جاتی ہے"۔

"امیرِ شہر عقلمند یا پرہیزگار تھے یا نہیں" — بڑی بیوی نے کہا — "حسن بن صباح نے انہیں چلہ کشی جیسی گمراہی میں ڈال دیا ہے"۔

"نہیں!" — امام شامی نے کہا — "انہیں حسن بن صباح نے نہیں بلکہ اپنے نفس نے اس گمراہی میں ڈالا ہے۔ انسان جب اپنی خواہشات کا غلام ہو جاتا ہے تو وہ ایسے ہی جھوٹے سہارے تلاش کرتا ہے ..... بہرحال میں وہاں جاؤں گا اور امیرِ شہر کو واپس لانے کی کوشش کروں گا"۔

"آپ وہاں نہ جائیں" — بڑی بیوی نے کہا — "وہاں پہرے لگے ہوئے ہیں۔ امیرِ شہر نے بھی حکم جاری کیا ہے کہ کوئی بھی اس علاقے کی طرف نہ جائے جہاں وہ چلہ کشی کر رہے ہیں۔ اس حکم میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ کوئی آدمی اُدھر جائے

دکھا گیا تو اسے دُور سے تیر مار دیا جائے گا"۔

"امیرِ شہر گھر میں ایک دو خوبصورت اور نوجوان لڑکیاں لانا چاہتے ہیں" — چھوٹی بیوی نے کہا — "یہ تو کوئی معیوب بات نہیں۔ وہ دو بیویاں اور لا سکتے ہیں۔ ہم دونوں ان کا استقبال کریں گی لیکن امیرِ شہر اس نئے امام کے فریب میں آ گئے ہیں۔ کیا امیرِ شہر کے لئے خوبصورت اور نوجوان لڑکیوں کی کمی ہے؟"

اُس دَور میں ایک سے زیادہ بیویاں رکھنا معیوب نہیں سمجھا جاتا تھا۔ امراء کے گھروں میں دو دو' تین تین اور بعض کے ہاں چار بیویاں بھی ہوتی تھیں۔ چونکہ یہ ایک رواج تھا اس لئے بیویاں آپس میں لڑتی نہیں تھیں نہ ان میں سوکنوں والی رقابت ہوتی تھی۔ یہاں تک بھی ہوتا تھا کہ کوئی بیوی اپنے طور پر اپنے خاوند کے لئے کوئی خوبصورت لڑکی لے آتی اور اسے اپنے خاوند کے ساتھ بیاہ دیتی تھی۔

"محترم امام!" — بڑی بیوی نے کہا — "ہمارے شوہر کو واپس لے آئیں۔ ہمیں خزانے نہیں چاہئیں۔ ہمیں اپنے شوہر کی ضرورت ہے"۔

"میں اس نئے امام حسن بن صباح سے ملوں گا" — امام شامی نے کہا — "پہلے تو یہ دیکھوں گا کہ یہ شخص ہے کیا اور یہ کرتا کیا ہے۔ میں نے یہ دیکھنا ہے کہ اس شخص کے پاس کوئی علم ہے بھی یا نہیں"۔

مہدی علوی کے گھر سے اٹھ کر امام شامی حسن بن صباح کے ہاں چلا گیا۔ حسن بن صباح کے ایک آدمی نے اندر اطلاع دی کہ امام شامی آئے ہیں۔ یہ کہنے کی بجائے کہ امام شامی کو اندر بھیج دو' وہ اٹھا اور دوڑتا ہوا اُس کمرے میں گیا جہاں امام شامی کو بٹھایا گیا تھا۔ وہ امام شامی کے سامنے فرش پر دو زانو ہو کر بیٹھ گیا' اُس کے پاؤں چھوئے پھر گھٹنے چھوئے پھر اپنا سر امام شامی کے گھٹنوں پر رکھ دیا۔ امام شامی نے اُس کا سر اپنے دونوں ہاتھوں میں تھام کر اوپر کیا اور اسے کہا کہ وہ ان کے پاس بیٹھ جائے۔

"نہیں امام!" — حسن بن صباح نے رندھی ہوئی آواز میں کہا — "میں اس قابل نہیں کہ آپ جیسے عظیم امام اور خطیب کی برابری میں بیٹھوں۔ میں اپنے آپ کو خوش نصیب سمجھتا ہوں کہ آج آپ کے قدموں میں بیٹھنے کی سعادت نصیب ہوئی ہے۔ میں نے آپ کی شہرت برسوں پہلے سنی تھی اور ستا ہی چلا آ رہا ہوں۔

یہاں آکر پتہ چلا کہ آپ تو کئی برسوں سے خانہ کعبہ میں بیٹھ کر عبادت کر رہے ہیں۔ میں علم کی تلاش میں بھٹکتا پھر رہا ہوں۔ یہاں آیا تو کچھ لوگوں نے بتایا کہ امام شامی واپس آجائیں تو تم یوں سمجھو کہ علم و فضل کا چشمہ پھوٹ پڑا ہے۔ آپ مجھے اپنے قدموں میں بٹھالیں اور میری تشنگی کی تسکین کریں"۔

"میں نے تو کچھ اور سنا ہے" — امام شامی نے کہا — "میں نے سنا ہے کہ تم امام کہلاتے ہو اور کچھ لوگوں نے تمہیں نبی بھی کہنا شروع کر دیا ہے"۔

"یہ ان لوگوں کی سادگی ہے' بھول ہے" — حسن بن صباح نے کہا — "میں نے تو امامت کا بھی دعویٰ نہیں کیا' آپ کہہ رہے ہیں کہ کچھ لوگ مجھے نبی ماننے ہیں۔ میں ان لوگوں کو کئی بار کہہ چکا ہوں کہ میں اگر دن رات عبادت میں لگا رہتا ہوں تو یہ میری اپنی ذات کے لئے ہے۔ میں کسی کی قسمت تبدیل نہیں کر سکتا۔ یہ وہی بات ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمائی تھی کہ سزا اور جزا کا انحصار تمہارے اپنے اعمال پر ہے۔ ہر انسان دنیا سے ہی اپنی جنت اور اپنا جہنم لے کر جاتا ہے"۔

"یہ تو تم ٹھیک کہتے ہو" — امام شامی نے کہا — "لیکن یہ چلہ کشی دینِ اسلام میں تم کہاں سے لے آئے ہو؟"

"میں سمجھتا ہوں کہ آپ کا اشارہ امیرِ شہر مہدی علوی کی طرف ہے" — حسن بن صباح نے کہا — "انہوں نے مجھ سے پوچھا تھا کہ وہ چلہ کرنا چاہتے ہیں۔ میں نے انہیں روکا تھا لیکن وہ اسے عبادت کے رنگ میں لیتے ہیں۔ میں نے انہیں بہت کچھ سمجھایا تھا لیکن حقیقت یہ ہے محترم امام! امیرِ شہر اپنے نفس کے غلام ہو گئے ہیں۔ میں نے سوچا کہ انہیں چلہ کرنے دوں لیکن میرے ذہن میں عبادت تھی۔ میں نے انہیں کہا کہ وہ چالیس روز جنگل میں جا بیٹھیں اور یوں عبادت کریں کہ اس دنیا سے تعلق توڑ دیں۔ اس سے میرا مطلب یہ تھا کہ دنیا سے لاتعلق ہو کر جب یہ عبادت کریں گے تو چالیس دنوں بعد یہ دنیا کو بھولے ہوئے ہوں گے"۔

امام شامی عالمِ دین تھے اور معمر بھی تھے۔ ان کی عمر کا اندازہ اس سے ہوتا تھا کہ ان کے سر اور داڑھی کا کوئی ایک بھی بال سیاہ نہیں رہا تھا۔ ان کی آنکھوں کا نور بھی کم ہو چکا تھا پھر بھی اُن کی آنکھوں میں ایک چمک تھی جو علم و دانش اور روح کا نُور

تھا۔ انہوں نے کتابیں بھی پڑھی تھیں، دنیا کے اچھے بُرے انسانوں کو بھی پڑھا تھا لیکن حسن بن صباح وہ انسان تھا جس کا ذکر کسی کتاب میں نہیں ملتا تھا نہ انہوں نے ایسا انسان پہلے کبھی دیکھا تھا۔ وہ جب باتیں کر رہا تھا تو امام شافی نے صاف طور پر محسوس کیا کہ یہ شخص عام انسانوں کی سطح سے یا تو بالا ہے یا بہت ہی پست، بہرحال حسن بن صباح کو انہوں نے سمجھنے میں دشواری محسوس کی۔

"میں امیر شہر کے پاس جاؤں گا" ــــ امام شافی نے کہا ــــ "میں اُسے واپس حقیقی دنیا میں لے آؤں گا"۔

"چلیں امام محترم!" ــــ حسن بن صباح نے کہا ــــ "اگر آپ انہیں نہ لے آئیں تو میں سمجھوں گا کہ آپ نے ان پر نہیں بلکہ مجھ پر احسان کیا ہے۔ جو بات میں انہیں سمجھانا چاہتا تھا، ہو سکتا ہے وہ آپ کی زبان سے سمجھ جائیں"۔

اگر حسن بن صباح امام شافی کے ساتھ اس مسئلے پر بحث میں الجھ جاتا تو امام شافی کا رویّہ اور ان کا استدلال کچھ اور ہوتا لیکن حسن بن صباح نے ایسی فریب کاری کا انداز اختیار کر لیا تھا کہ امام شافی نے کچھ بھی کہنا مناسب نہ سمجھا تھا نہ وہ اس شخص کی اصل نیت کو سمجھ سکے۔ وہ اٹھے اور کچھ کہے بغیر وہاں سے آ گئے۔ ان کے باہر نکلتے ہی حسن بن صباح اپنے کمرے میں چلا گیا اور اس نے اپنے تین بڑے ہی خاص آدمیوں کو بلایا اور انہیں کچھ ہدایات دینے لگا۔

○

اُس روز ظہر کی نماز کے وقت مسجد میں نمازیوں کی تعداد بہت ہی زیادہ تھی کیونکہ سب کو معلوم ہو گیا تھا کہ ان کے محبوب امام اور خطیب امام شافی آ گئے ہیں۔ انہوں نے امام شافی کے پیچھے نماز پڑھی لیکن عصر کی نماز کے وقت امام مسجد میں نہ آیا۔ مغرب کی نماز کے وقت بھی امام شافی غیر حاضر تھے اور عشاء کی نماز کے وقت بھی لوگوں کا محبوب امام لاپتہ تھا۔ ان کے گھر سے پتہ کیا گیا۔ معلوم ہوا کہ وہ عصر کی نماز کے بعد کہیں چلے گئے تھے۔ ایک معمہ تھا جو حل نہ ہو سکا۔ کوئی بھی نہ تھا جو یہ بتاتا امام شافی کہاں چلا گیا ہے۔ دو یا تین آدمیوں نے بتایا کہ امام کو شہر سے باہر جاتے دیکھا گیا تھا۔ رات کو انہیں کہاں تلاش کیا جاتا، لوگ صبح کا انتظار کرنے لگے۔

فجر کی نماز کے وقت بھی امام شافی نہ آئے لیکن نماز کا وقت گزر گیا تو شہر میں ایک سنسنی خیز خبر پھیل گئی جو یہ تھی کہ ایک آدمی شہر کے باہر سے آ رہا تھا تو اس نے ویرانے میں ایک درخت کے تنے کے ساتھ کسی کا کٹا ہوا سر لٹکتا دیکھا۔ اس نے اچھی طرح دیکھا تو اس پر سکتہ طاری ہو گیا۔ یہ سر امام شافی کا تھا جو بڑی صفائی سے جسم سے کاٹا گیا تھا۔ لوگ حیران اس پر ہوئے کہ امام شافی کے ساتھ کسی کی کیا دشمنی ہو سکتی تھی کہ انہیں اس بیدردی سے قتل کیا گیا ہے۔

یہ خبر حسن بن صباح کو پہنچائی گئی تو وہ دوڑتا باہر نکلا۔ لوگوں میں خوف و ہراس پھیلا ہوا تھا۔ حسن بن صباح نے گھوڑا منگوایا اور اس پر سوار ہو کر اُس طرف چل پڑا جدھر بتایا گیا تھا کہ امام شافی کا سر درخت کے ساتھ لٹکتا دیکھا گیا ہے۔ شہر کے لوگ ہجوم کر کے اس کے ساتھ دوڑے جا رہے تھے۔

حسن بن صباح اُس درخت تک پہنچا جہاں ابھی تک امام شافی کا سر لٹک رہا تھا۔ اُس نے سر دیکھا۔ یہ درخت کے ایک تنے کے ساتھ بالوں سے بندھا ہوا تھا۔ امام شافی کے بال شانوں تک لمبے تھے۔

"یہ دیکھو ایک بازو!" ــــ کسی آدمی کی بڑی ہی بلند اور گھبرائی ہوئی آواز سنائی دی۔

لوگ اُس طرف دیکھنے لگے اور پھر سب اُس طرف دوڑ پڑے۔ حسن بن صباح بھی اُس طرف گیا اور گھوڑے سے اُتر کر بازو دیکھا جو کندھے سے کاٹا گیا تھا۔

"سب لوگ اِدھر اُدھر پھیل جاؤ" ــــ حسن بن صباح نے اعلان کیا ــــ "امام کے جسم کے کچھ اور ٹکڑے ملیں گے۔ میں سمجھ گیا ہوں کہ ان کا قاتل کون ہے۔ وہ انسان نہیں، کسی اور دنیا کی مخلوق ہے جو یقیناً جنات میں سے ہو گی"۔

لوگ اِدھر اُدھر بکھر گئے اور تلاش کرنے لگے۔ تھوڑی سی تلاش کے بعد آوازیں آنے لگیں ــــ "یہ ایک ٹانگ پڑی ہے" ــــ پھر کچھ دور سے آواز آئی ــــ "یہ ایک بازو پڑا ہے" ــــ اس طرح آوازیں آتی رہیں اور امام شافی کے کٹے ہوئے اعضاء مل گئے۔ بازو الگ اور ٹانگیں الگ پھینک دی گئی تھیں۔

معدی علوی رات بھر ٹیلے میں بیٹھا رہا تھا اور صبح طلوع ہوتے ہی وہ سو گیا تھا۔ اس کا خیمہ وہاں سے کچھ دور تھا اور چٹانوں کی اوٹ میں تھا۔ اُسے پتہ ہی نہ چلا کہ

امام شاہی قتل ہو چکا ہے اور اس کے جسم کے کٹے ہوئے اعضا اکٹھے کئے جا چکے ہیں۔ لوگوں پر خوف و ہراس طاری ہو گیا تھا اور حسن بن صباح کے ارد گرد اکٹھے ہو گئے اور اس سے پوچھنے لگے کہ یہ حادثہ کس طرح ہوا ہے۔ حسن بن صباح پہلے بتا چکا تھا کہ امام شاہی کے قاتل جنات ہیں۔ اب اس نے دیکھا کہ لوگ اس کے گرد جمع ہو گئے ہیں تو اس نے لوگوں کو اصل صورتِ حال سے آگاہ کیا۔

"لوگو! ہوش میں آؤ اور میری بات غور سے سنو" —— حسن بن صباح نے گھوڑے پر سوار ہو کر بڑی ہی بلند آواز میں کہا —— "تم سب جانتے ہو کہ امیرِ شہر یہاں سے تھوڑی دور آگے چلہ کشی کر رہے ہیں۔ تمام شہر میں یہ اعلان کرا دیا گیا تھا کہ کوئی شخص اس طرف نہ آئے۔ لوگوں کو روکنے کی ایک وجہ یہ تھی کہ امیرِ شہر کی چلہ کشی میں خلل نہ پڑے اور اصل وجہ یہ تھی کہ وہ ایسا چلہ کر رہے ہیں کہ بہت سے جنات اس علاقے میں آ گئے ہیں۔ امیرِ شہر جو وظیفہ پڑھتے ہیں اس میں ایسا اثر ہے جو جنات کو متاثر کر لیتا ہے اور وہ وہاں پہنچ جاتے ہیں۔ اگر کوئی آدمی اس خیال سے اِدھر آئے کہ امیرِ شہر کو چلہ کشی کی حالت میں دیکھے تو جنات اسے روکتے ہیں، اور اگر وہ نہ رکے تو اس کا وہی حال کر دیتے ہیں جو تم لوگوں نے اپنے امام کا دیکھا ہے۔ اسی لئے میں نے انتظام کر دیا تھا کہ یہاں دور دور کچھ آدمی بٹھا دیے تھے جو کسی کو اِدھر آنے نہیں دیتے تھے۔ میں تم سب کے سامنے ان آدمیوں سے پوچھتا ہوں کہ انہوں نے امام کو اس طرف آتے دیکھا ہو گا"۔

"یا امام!" —— ہجوم میں سے ایک آدمی کی آواز سنائی دی —— "میں نے کل شام سورج غروب ہونے سے کچھ دیر پہلے امام شاہی کو اس طرف آتے دیکھا تھا۔ میں ان کی طرف دوڑا اور انہیں روک دیا اور بتایا کہ وہ آگے نہ جائیں۔ انہیں وجہ بھی بتائی لیکن انہوں نے مجھے ڈانٹ دیا اور کہا کہ وہ ضرور آگے جائیں گے۔ میں فیصلہ نہ کر سکا کہ میں امام حسن بن صباح کا حکم مانوں یا امام شاہی کا۔ امام شاہی کے سامنے میری حیثیت ہی کیا تھی۔ میں نے سوچا کہ یہ اللہ کے برگزیدہ اور عظیم امام ہیں۔ جنات ان کے قریب آنے کی جرأت نہیں کریں گے۔ میں ان کے راستے سے ہٹ گیا۔ وہ آگے چلے گئے اور پھر میری نظروں سے اوجھل ہو گئے کیونکہ آگے ٹیلے بھی تھے اور چٹانیں بھی۔ یہ تو صبح میرے ایک ساتھی نے مجھے بتایا کہ امام شاہی کا سر ایک

درخت کے تنے کے ساتھ بالوں سے بندھا ہوا ہے۔ اب تم سب نے دیکھ لیا ہے کہ ان کے جسم کو کاٹ کر جنات نے کس طرح بکھیر دیا ہے"۔

لوگوں پر سناٹا طاری ہو گیا۔ حسن بن صباح نے ہجوم پر نظر گھمائی۔ اس نے ہر کسی کے چہرے پر خوف کا تاثر دیکھا۔

"اتنا زیادہ خوفزدہ ہونے کی ضرورت نہیں" —— حسن بن صباح نے لوگوں سے کہا —— "تم لوگ اب احتیاط کرنا کہ کوئی بھی اس علاقے میں نہ آئے۔ میں اس قاتل جن کو حاضر کر کے زندہ جلا دوں گا"۔

لوگ آہستہ آہستہ شہر کی طرف چل پڑے۔ حسن بن صباح گھوڑے پر سوار کسی اور طرف چلا گیا۔

قتل کی یہ ہولناک واردات یوں ہوئی تھی کہ امام شاہی جب حسن بن صباح کے گھر سے نکلا تھا تو حسن بن صباح نے اپنے آدمیوں کو بلایا تھا۔ انہیں جو ہدایات دی تھیں وہ یہ تھیں کہ وہ امام شاہی پر نظر رکھیں۔ اگر وہ اُس طرف جاتا ہے جہاں مہدی علوی چلہ کشی کر رہا ہے تو اسے وہیں کہیں ختم کر دیں۔

"یا امام!" —— حسن بن صباح کے ایک دستِ راست نے کہا —— "یہ نہ کہیں کہ اگر وہ اِدھر جائے تو اسے قتل کیا جائے۔ میں آپ کو بتاتا ہوں کہ امام شاہی کا اس شہر کے لوگوں پر اس قدر اثر و رسوخ ہے کہ لوگ اسے پیر اور مرشد مانتے ہیں۔ میں نے گھوم پھر کر دیکھا ہے پھر آپ سے یہ بات کر رہا ہوں۔ اگر یہ شخص الموت میں رہا تو کوئی بعید نہیں کہ یہ ہمارے خلاف محاذ بنا لے اور ہم نے اس شہر کے لوگوں میں جس طرح اثر پیدا کیا ہے وہ رائیگاں چلا جائے۔ اس آدمی کا اس شہر میں رہنا بلکہ اس دنیا میں رہنا خطرناک ہو گا۔

"تو اسے ختم کر دو" —— حسن بن صباح نے کہا —— "لیکن قتل اس طرح کرو کہ لوگ یہ نہ سمجھیں کہ کسی انسان نے قتل کیا ہے۔ یہ مہدی علوی کے پاس ضرور جائے گا۔ اسے اس ویرانے میں قتل کرو اور اس کے بازو، ٹانگیں، سر کاٹ کر الگ الگ پھینک دو پھر میں آ کر لوگوں کو بتاؤں گا کہ اس کا قاتل کون ہے۔ پھر اگلا اسے بھول جائیں گے اور میرے اور زیادہ معتقد ہو جائیں گے"۔

امام شاہی کے دن پورے ہو چکے تھے۔ وہ اُسی شام موت کی وادی کی طرف چل

پڑا اور حسن بن صباح کے آدمیوں نے اُسے اُسی طرح قتل کر دیا جس طرح حسن بن صباح نے بتایا تھا اور پھر اس ابلیس نے لوگوں سے منوا لیا کہ یہ قتل جنات نے کیا ہے۔

○

سورج غروب ہونے کو تھا جب امام شافی کو قبر میں اتار دیا گیا۔ نماز جنازہ حسن بن صباح نے پڑھائی تھی اور اس کے بعد اُس نے امام شافی کی وفات پر ایسی نوحہ خوانی کی تھی کہ لوگوں کے آنسو ہی نہیں بلکہ سسکیاں اور ہچکیاں نکل آئی تھیں۔

اگلی صبح حسن بن صباح سدی علوی سے ملنے چلا گیا۔ سدی علوی خیمے میں زمین پر بچھے ہوئے بستر پر گہری نیند سویا ہوا تھا۔ یہ چلّے کا آٹھواں یا نواں دن تھا۔ خادم نے اسے جگایا اور بتایا کہ امام حسن آئے ہیں۔ سدی علوی ہڑبڑا کر اٹھا۔ حسن بن صباح خیمے میں آکر اس کے پاس بیٹھ گیا تھا۔ اُس نے سدی علوی کے چہرے کا جائزہ لیا۔ وہ اندازہ کرنا چاہتا تھا کہ سدی علوی پر کیا اثرات مرتب ہوئے ہیں اور اس کی ذہنی حالت کیا ہے۔

"کیا آپ یہ چلّہ جاری رکھ سکیں گے؟" — حسن بن صباح نے پوچھا۔

"ہاں امام!" — سدی علوی نے جواب دیا — "میں چلّہ جاری رکھوں گا۔ مجھے کوئی تکلیف نہیں ہو رہی بلکہ ایک عجیب سا سُرور محسوس ہوتا ہے جسے میں بیان نہیں کر سکتا۔ تصورات بہت ہی حسین ذہن میں آتے ہیں اور یہ اپنے آپ ہی آجاتے ہیں"۔

"آپ کو تو سکون ملتا ہے" — حسن بن صباح نے کہا — "لیکن آپ کے ارد گرد جو علاقہ ہے یہ بڑا ہی خطرناک ہو گیا ہے۔ میں نے آپ کو جو وظیفہ بتایا ہے اس کے اثرات پوری کائنات پر ہوتے ہیں۔ یہ دراصل سلیمان علیہ السلام کا وظیفہ ہے جو جنات پڑھا کرتے تھے۔ آپ کے خیمے کے ارد گرد جنات کا ایک ہجوم اکٹھا ہو گیا ہے۔ یہ اس وظیفے کی کشش اور جنات کی عقیدت مندی ہے"۔

"تو کیا یہ جنات مجھے نقصان نہیں پہنچائیں گے؟" — سدی علوی نے ذرا ڈرتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

"نہیں امیرالموت!" — حسن بن صباح نے جواب دیا — "یہ تو آپ کی خوش

نصیبی کی نشانی ہے کہ آپ کا پڑھا ہوا وظیفہ کائنات پر اثر انداز ہو رہا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ کچھ جنات انسانوں کے روپ میں آکر آپ کے آگے سجدہ ریز ہو جائیں۔ اگر ایسا ہوا تو آپ ڈریں بالکل نہیں۔ وہ خاموشی سے آپ کا وِرد سنتے رہیں گے اور پھر چلے جائیں گے"۔

"مجھے یہ بتائیں کہ سونے کی یہ تین اینٹیں کس طرح برآمد ہوئی ہیں؟" سدی علوی نے پوچھا — "کیا ٹیلے کے نیچے سے مزید خزانہ برآمد ہوگا؟"

"میں گذشتہ رات سو نہیں سکا" — حسن بن صباح نے کہا — "سونے کی یہ تین اینٹیں ایک اشارہ ہے۔ میں رات بھر مراقبے میں رہا ہوں۔ معلوم یہ کرنا تھا کہ یہ کیسا اشارہ ہے۔ صبح کاذب کے وقت مجھے یہ راز معلوم ہُوا ..... خزانہ برآمد ہو گا لیکن ابھی یہ پتہ نہیں چل رہا کہ وہ خزانہ کہاں سے برآمد ہو گا۔ مجھے امید ہے کہ پندرہ سولہ دنوں بعد یہ بھی پتہ چل جائے گا۔ سونے کے یہ تین ٹکڑے ایک بڑا واضح اشارہ ہیں کہ آپ کو تین اور شہر ملیں گے پھر الموت کو ملا کر ان چار شہروں کی ایک سلطنت بن جائے گی جس کے سلطان آپ ہوں گے۔ اس سلطنت کو حاصل کرنے کا طریقہ یہی ایک ہے کہ آپ اسی طرح صبر و تحمل اور پوری یکسوئی کے ساتھ پورے چالیس دن یہ وظیفہ پورا کر دیں"۔

سدی علوی کو باقاعدہ حشیش پلائی جا رہی تھی۔ خادم حشیش کی مقدار میں اضافہ کرتا چلا جا رہا تھا۔ اسے اونٹنی کا دودھ پینے کی اجازت دے دی گئی تھی۔ یہ دودھ ہر روز اس کے خیمے میں پہنچا دیا جاتا تھا۔ اس میں بھی ذرا سی حشیش ڈال دی جاتی تھی۔ کچھ تو اُس کی اپنی خواہشات کے تصور تھے جو اس کے ذہن میں ابھرتے ہی چلے آرہے تھے، کچھ حسن بن صباح کی باتوں کے اثرات تھے کہ سدی علوی کے ذہن سے اترتا جا رہا تھا کہ وہ الموت کا امیر ہے اور اس کی حیثیت ایک بادشاہ جیسی ہے۔

"میں آپ کو ایک بُری خبر سنا رہا ہوں" — حسن بن صباح نے کہا — "آپ کے محبوب امام شافی اچانک حجاز سے واپس آگئے تھے۔ انہیں پتہ چلا کہ آپ یہاں چلّہ کشی میں بیٹھے ہیں تو وہ میرے پاس آئے اور کہنے لگے کہ وہ آپ کو چلّہ کشی سے روکیں گے۔ میرے دل میں امام شافی کا بے تحاشا احترام ہے۔ میں نے انہیں کہا کہ وہ آپ کی چلّہ کشی میں مداخلت نہ کریں ورنہ اس میں آپ کی جان جانے کا خطرہ

ہے اور امیرالموت کے لئے بھی بہت بڑا خطرہ پیدا ہو سکتا ہے۔ ان کی اور ہم سب کی بدقسمتی کہ وہ نہ مانے اور کل آپ کے پاس آنے کے لئے چل پڑے۔ ہمیں اطلاع ملی کہ ان کا سر درانے میں ایک درخت کے ساتھ بالوں سے لٹک رہا تھا۔ مجھے صاف پتہ چل گیا کہ انہیں جنات نے کاٹ کر پھینک دیا تھا کیونکہ وہ جنات کے پیغمبر حضرت سلیمان علیہ السلام کے وظیفے کی توہین کر رہے تھے۔ یہ توہین تو تھی کہ وہ آپ کو اس وظیفے سے ہٹانے آ رہے تھے۔ کل میں نے ان کی نماز جنازہ پڑھائی ہے اور انہیں سپرد خاک کر دیا گیا ہے"۔

حسن بن صباح کو توقع تھی کہ مہدی علوی کا ردِعمل بڑا ہی شدید ہو گا اور وہ روئے گا کیونکہ وہ امام شافعی کا معتقد تھا بلکہ اس کا مرید تھا لیکن اس نے اپنے امام کی موت کی خبر سنی تو اس کا چہرہ بے تاثر رہا جیسے اس پر ذرا سا بھی اثر نہ ہوا ہو۔ اس کی آنکھیں خشک رہیں۔ اُس کی زبان سے ایک لفظ بھی نہ نکلا۔ حسن بن صباح نے جب یہ دیکھا کہ مہدی علوی نے کوئی اثر لیا ہی نہیں تو وہ دل ہی دل میں بہت خوش ہوا کہ وہ مہدی علوی کی حسّیں مُردہ کرنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔

"میں یہ چلہ پورا کروں گا اور امام محترم!" ۔۔۔ مہدی علوی نے کہا ۔۔۔ "یہ دیکھنا آپ کا کام ہے کہ میں اس میں کامیاب ہو جاؤں گا یا نہیں"۔

"وہ تو میں دیکھ چکا ہوں" ۔۔۔ حسن بن صباح نے کہا ۔۔۔ "اور میں آپ کو بتا بھی چکا ہوں۔ سونے کی تین اینٹوں کا برآمد ہونا وظیفے کی کامیابی کا ایک بہت بڑا ثبوت ہے..... اور امام شافعی کا جنات کے ہاتھوں قتل ایک اور ثبوت ہے۔ آپ دلجمعی سے چلہ جاری رکھیں"۔

"کیا میں اونٹنی کا دودھ ہی پیتا رہوں؟" ۔۔۔ مہدی علوی نے پوچھا۔

"ہاں!" ۔۔۔ حسن بن صباح نے کہا ۔۔۔ "آج کا دن ملا کر دو دن اور آپ اونٹنی کے دودھ پر ہی رہیں گے۔ اس کے بعد آپ اس دودھ کے ساتھ دن رات میں صرف ایک بار آدھی روٹی کھا سکتے ہیں اس سے زیادہ نہیں"۔

حسن بن صباح نے یہ بھی دیکھا تھا کہ اتنے تندرست اور اتنے صحت مند جسم والا امیر شہر غذائیت کی کمی کی وجہ سے کچھ کمزور ہو گیا تھا۔ حسن بن صباح نے اسے اور زیادہ کمزور کرنا تھا۔

حسن بن صباح مہدی علوی کی اور زیادہ حوصلہ افزائی کر کے وہاں سے آ گیا۔

مہدی علوی نے حسن بن صباح کی جو پیش گوئیاں سنی تھیں انہوں نے اسے نہایت حسین اور دلپسند تصوروں میں دھکیل دیا۔

سات آٹھ دن اور گزر گئے۔ مہدی علوی اب ایسی ذہنی کیفیت میں مبتلا ہو گیا تھا جس میں اس کے ذہن کے تصورات حقیقی زندگی کی صورت میں محسوس ہونے لگے اور حقیقی زندگی اس کے ذہن سے بہت حد تک نکل گئی۔

چودہ سولہ دن گزر گئے تو حسن بن صباح ایک بار پھر مہدی علوی کے خیمے میں گیا۔ اُس نے مہدی علوی کے چہرے کا اور ذہنی کیفیت کا اندازہ کیا۔ اس نے دیکھا کہ وہ بڑے اچھے نتائج حاصل کر رہا ہے۔ مہدی علوی بڑی جاندار آواز میں بولتا تھا لیکن صاف پتہ چلتا تھا کہ اس کا ذہنی توازن صحیح نہیں رہا۔ یہ شخص اس طرح زندگی کی حقیقتوں سے کٹ گیا ہے جس طرح ہرے بھرے درخت کی ایک شاخ کٹ کر گر پڑتی ہے۔ اس شاخ کو سوکھ کر پتا پتا ہو جانا ہوتا ہے۔ یہی کیفیت مہدی علوی کی ہو رہی تھی۔

"کیا آپ کچھ اور بھی دیکھ رہے ہیں؟" ۔۔۔ حسن بن صباح نے پوچھا ۔۔۔ "کوئی اور چیز آپ کو نظر آئی ہو؟"

"ہاں محترم امام!" ۔۔۔ مہدی علوی نے مخمور سی آواز میں کہا ۔۔۔ "میں نے گزشتہ رات ایک عجیب چیز دیکھی ہے۔ میں وظیفے میں مصروف تھا کہ ایک انتہائی خوبصورت لڑکی اس طرح میرے سامنے سے گزر گئی جیسے وہ چل نہیں رہی تھی بلکہ بادلوں پر تیر رہی تھی۔ میں چونکہ وظیفے میں مصروف تھا اس لئے میں نے اُس کی طرف زیادہ نہ دیکھا۔ اتنا ہی دیکھا کہ وہ میرے سامنے سے گزری اور غائب ہو گئی۔ میں تو کہوں گا کہ وہ آسمان سے اتری ہوئی حور تھی..... میں نے اپنی پوری کی پوری توجہ وظیفے پر مرکوز کر دی۔ ذرا ہی دیر بعد ایک اور لڑکی جو پہلی جیسی حسین اور دلکش تھی میرے سامنے سے گزر گئی۔ میں کچھ ڈرا بھی اور گھبرایا بھی لیکن اپنے آپ کو یقین دلایا کہ یہ آسمان کی مخلوق ہے۔ پھر یہ خیال بھی آیا کہ یہ جنات ہی نہ ہوں جو آپ نے بھی کہا تھا کہ انسان کے روپ میں آ سکتے ہیں"۔

"ابھی کچھ اور چیزیں بھی آپ کو نظر آئیں گی" ۔۔۔ حسن بن صباح نے کہا ۔۔۔

"آپ، جو کچھ بھی خدا سے مانگ رہے ہیں وہ سب کچھ آپ کو مل جائے گا۔ یہ خدا کی اشارے ہیں۔ سونے کے تین ٹکڑوں کا اشارہ آپ کو بتایا ہے۔ اب آپ نے دو لڑکیاں دیکھی ہیں۔ آپ خود ہی سمجھ لیں کہ آپ کی یہ خواہش بھی پوری ہو جائے گی جس طرح آپ چاہتے ہیں"۔

مہدی علوی یہ تو سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ یہ دو لڑکیاں حسن بن صباح کی بھیجی ہوئی ہو سکتی ہیں۔ کوئی اُسے بتاتا تو بھی وہ یقین نہ کرتا کیونکہ رات کے وقت شہر سے دور اس ویرانے میں کوئی لڑکی نہیں آسکتی تھی۔ حقیقت یہ تھی جس سے وہ بے خبر تھا کہ یہ دونوں لڑکیاں شام کو ہی وہاں پہنچا دی گئی تھیں۔ مہدی علوی مصلے پر بیٹھ چکا تھا۔ لڑکیاں خادم کے خیمے میں بیٹھی رہیں۔ انہیں ایسے لباس پہنائے گئے تھے جو عام طور پر لڑکیاں نہیں پہنا کرتی تھیں۔ وہ رنگ دار باریک ریشمی کپڑوں میں لپٹی ہوئی تھیں۔ اس کے باوجود وہ عریاں لگتی تھیں کیونکہ کپڑے بہت ہی باریک تھے۔ وہ جب مہدی علوی کے آگے سے گزری تھیں تو ان کی چال عام چال نہیں تھی۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے وہ قدم اٹھا نہیں رہیں بلکہ زمین پر کھڑے کھڑے تیرتی جا رہی ہوں۔

○

آخر چالیسویں رات بھی گزر گئی۔ مہدی علوی کو اچھلتے کودتے نعرے لگاتے خیمے سے باہر آنا چاہیے تھا لیکن وہ اس طرح سر جھکائے ہوئے باہر جا رہا تھا جیسے اُس نے منوں بوجھ اٹھا رکھا ہو۔ خیمے سے باہر آکر اس نے دیکھا اسے اس کے خادم کا خیمہ نظر نہ آیا۔ اُس نے خادم کو پکارا' بہت آوازیں دیں لیکن اُسے کوئی جواب نہ ملا۔ وہ آہستہ آہستہ شہر کی طرف چل پڑا۔ اسے تو جیسے یاد ہی نہ رہا تھا کہ اس نے چالیس راتیں چلہ کیا ہے' اور شاید وہ یہ بھی بھول گیا تھا کہ اس نے چلہ کیوں کیا تھا۔ اس کا دماغ کسی وقت روشن ہو کر سوچنے کے قابل ہو جاتا لیکن فوراً ہی بجھ جاتا۔ دماغ پھر سو جاتا۔ اُس کے ذہن میں اندھیرا ہی اندھیرا تھا۔ اس کا ذہن ذرا سا اپنے آپ میں آتا تو اُسے یاد آتا کہ یہاں وہ اکیلا نہیں تھا پھر وہ پریشان ہو جاتا کہ وہ اکیلا کیوں ہے۔ اُس کا ذہن پھر خالی ہو جاتا اور اُس کیفیت میں وہ قدم گھسیٹ گھسیٹ کر چلا گیا۔ وہ لاشعوری طور پر چلتا جا رہا تھا یا جیسے وہ خواب میں چل رہا ہو۔

سورج بہت اوپر آگیا تھا جب حسن بن صباح کو اُس کے ایک آدمی نے اطلاع دی کہ امیر الموت آرہا ہے۔ حسن بن صباح اس کے انتظار میں تھا۔ اُسے معلوم تھا کہ مہدی علوی کس حالت میں واپس آئے گا۔ حسن بن صباح باہر نکل آیا اور اس نے دیکھا کہ مہدی علوی چلا آرہا ہے۔ وہ قدم گھسیٹ رہا تھا۔ اُس کا حال حلیہ اس قدر بدل گیا تھا کہ حسن بن صباح کو یہ نہ بتایا جاتا کہ امیر الموت آرہا ہے تو وہ اُسے پہچان ہی نہ سکتا۔ اُس کی داڑھی سلیقے سے تراشی ہوئی ہوتی تھی لیکن چالیس دنوں میں داڑھی لمبی اور بے ترتیب ہو گئی تھی۔ اس کے سر کے بال بھی کندھوں تک پہنچ رہے تھے۔ حسن بن صباح اسے اپنے مکان کی طرف آتا دیکھتا رہا' حتیٰ کہ مہدی علوی حسن بن صباح کے سامنے آرکا۔

"آگئے امیر الموت!" ___ حسن بن صباح نے بے رخی سے پوچھا ___ "اندر آجائیں"۔

"پانی پلاؤ!" ___ مہدی علوی نے نحیف سی آواز میں کہا ___ "بہت تھک گیا ہوں..... پانی پلاؤ"۔

حسن بن صباح اُسے اندر لے گیا اور اپنے کمرے میں بٹھایا۔ اُس نے ایک آدمی سے کہا کہ اسے سادہ پانی پلاؤ۔ مہدی علوی کو سادہ پانی دیا گیا جو اس نے پی لیا۔

"مجھے پانی پلاؤ" ___ مہدی علوی نے ذرا جاندار آواز میں کہا۔

"امیر الموت!" ___ حسن بن صباح نے کہا ___ "پانی تو آپ پی چکے ہیں"۔

"یہ پانی نہیں" ___ مہدی علوی نے ذرا غصیلی آواز میں کہا ___ "جو وہاں مجھے خادم پلایا کرتا تھا"۔

حسن بن صباح سمجھتا تھا کہ یہ کون سے پانی کی طلب محسوس کر رہا ہے' پھر بھی اُس نے اسے شربت پلایا۔ مہدی علوی نے شربت پی لیا۔

""میں وہ پانی مانگ رہا ہوں" ___ مہدی علوی نے اب کے ذرا بلند آواز میں کہا۔

وہ دراصل اُس پانی کا عادی ہو گیا تھا جو اُسے چالیس روز خادم پلاتا رہا تھا۔ اُسے معلوم نہیں تھا کہ اس پانی میں حشیش ملی ہوئی ہوتی تھی۔ وہ جو سرور محسوس کرتا تھا اسے وہ روحانی سکون سمجھتا تھا اور اس سکون کو وظیفے کی فضیلت کہتا تھا۔ گذشتہ شام

اُس نے حشیش والا پانی پیا تھا۔ وہ وظیفے کے دوران بھی رات کو یہ پانی پیا کرتا تھا۔ خادم اچھا خاصا پانی اس کے سینے کے پاس رکھ دیا کرتا تھا۔ گذشتہ شام سے اگلے دن پچھلے پہر تک اسے وہ پانی نہیں ملا تھا۔ وہ نشے سے ٹوٹا ہوا تھا۔

"آپ ہیں کون؟" ——— حسن بن صباح نے پوچھا۔

"میں امیرِ الموت ہوں" ——— مہدی علوی نے جواب دیا ——— "میرا نام مہدی علوی ہے"۔

اس کے بعد یوں ہوا کہ الموت کی گلیوں اور بازاروں میں ایک پاگل بلند آواز سے کہتا پھرتا تھا ——— "میں اس شہر کا امیر ہوں ...... میں مہدی علوی ہوں"۔ ——— بہت سے بچے اسے پتھر اور ڈھیلے مار رہے تھے اور وہ آگے آگے بھاگتا پھر رہا تھا۔ اس آدمی کا حلیہ یہ تھا کہ سر کے بال لمبے جو کندھوں پر آئے ہوئے تھے اور کچھ بال چہرے پر گرے ہوئے تھے۔ اس کی داڑھی لمبی تھی اور اس نے میلے کچیلے کپڑے پہن رکھے تھے۔

"شہر میں آسمان سے حوریں اُتریں گی" ——— یہ پاگل کہتا پھر رہا تھا ——— "میں آسمان سے خزانے لاؤں گا۔ مجھ پر آسمان سے خزانے اُتریں گے۔ میں اس شہر کا امیر ہوں۔ حوریں آئیں گی۔ میں تمہارا امیر ہوں"۔

وہ اپنے گھر کی طرف گیا۔ یہ گھر مہدی علوی کا تھا۔ وہ جب گھر میں داخل ہونے لگا تو وہاں جو دو دربان کھڑے تھے، انہوں نے اسے دھکے دے دے کر باہر نکال دیا۔ اس کی اپنی دونوں بیویوں اور اولاد نے بھی اسے پہچاننے سے انکار کر دیا۔ تین چار فوجی آگئے۔ انہوں نے اس پاگل کو پکڑ لیا اور اسے گھڑدوڑ کے میدان میں لے گئے۔ سارا شہر اُمڈ کر اس میدان میں اکٹھا ہو گیا۔ فوج کا ایک دستہ وہاں آگیا۔ سپہ سالار اس کے ساتھ تھا۔ یہ پاگل مہدی علوی ہی تھا اور اس میں کسی شک و شبے کی گنجائش نہیں تھی کہ وہی اس شہر کا امیر تھا لیکن وہ پاگل ہو چکا تھا اور لوگ مانتے ہی نہیں تھے کہ یہ مہدی علوی ہے۔ سپہ سالار اسے بازو سے پکڑ کر ایک ذرا بلند جگہ پر لے گیا جہاں لوگ اسے اچھی طرح دیکھ سکتے تھے۔

"الموت کے لوگو!" ——— سپہ سالار نے اعلان کیا ——— "یہ شخص پاگل ہے اور سارے شہر میں بدامنی پھیلا رہا ہے۔ کیا آپ اسے امیر شہر تسلیم کریں گے؟"

لوگوں کے ہجوم نے اسے امیر شہر تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔

"اگر یہ واقعی مہدی علوی ہے" ——— سپہ سالار نے کہا ——— "تو بھی اسے ہم امیر شہر نہیں مانیں گے کیونکہ یہ پاگل ہو چکا ہے"۔

"ہم کسی پاگل کو امیر شہر نہیں بنائیں گے" ——— ہجوم میں سے ایک آواز اٹھی۔

پھر ہجوم نے اس آواز کی تائید میں ایسا شور و غل بپا کیا کہ سوائے اس کے کچھ بھی سنائی نہیں دیتا تھا کہ شہر کے لوگ اس پاگل کو امیر شہر بنانے کی سخت مخالفت کر رہے تھے۔

تاریخوں میں آیا ہے کہ لوگ مخالفت کرتے یا حمایت، پوری کی پوری فوج نے اس پاگل کو امیر تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ یہ پوری کی پوری فوج حسن بن صباح کی بنائی ہوئی تھی اور اس میں اس نے اپنے مریدوں کو بھرتی کیا تھا اور انہیں ذہن نشین کرا دیا تھا کہ اس شہر پر قبضہ کرنا ہے۔

سپہ سالار نے لوگوں سے کہا کہ اس اتنے بڑے شہر کے دفاع کے لئے فوج تھی ہی نہیں۔ ہم نے لوگوں کے جان و مال اور عزت و آبرو کی حفاظت کے لئے فوج بنائی ہے اور اس کے اخراجات امام حسن بن صباح پورے کر رہے ہیں۔ سپہ سالار نے اعلان کیا کہ یہ فوج کا فیصلہ ہے کہ امام حسن بن صباح کو امیر شہر بنایا جائے۔

اُس وقت تک بے شمار لوگ حسن بن صباح کے مرید بن چکے تھے۔ انہوں نے بیک زبان کہا کہ امیر شہر حسن بن صباح کو بنایا جائے۔ اس طرح حسن بن صباح الموت کا امیر بن گیا۔ اس نے مہدی علوی کی دونوں بیویوں اور اس کی اولاد کا باقاعدہ وظیفہ مقرر کروا دیا۔

○

مہدی علوی کو خوش و خرم فتح کے نشے سے سرشار خیمے سے نکلنا چاہئے تھا کہ اس نے چالیس راتوں کا چلہ کامیابی سے کاٹ لیا تھا۔ شہر میں آکر وہ حسن بن صباح سے کہتا کہ اب مجھے اس چلے کے نتائج دکھاؤ لیکن وہ خیمے سے پاگل ہو کر نکلا۔

مزمل آفندی کو قید خانے میں بند کر دیا گیا تھا۔ اُسے چالیس دنوں کے بعد قید خانے سے رہا کر دیا گیا۔ اسے پاگل ہو کر نکلنا چاہئے تھا لیکن وہ جب قید خانے سے نکلا تو اُس کی گردن تنی ہوئی تھی اور اس کی چال ڈھال ایسی تھی جیسے اس شہر کا امیر

وہی ہو اور جو کوئی اس کے راستے میں آئے گا اُسے وہ قتل کر دے گا۔ وہ قید خانہ سے نکل کر سیدھا حسن بن صباح کے پاس پہنچا۔ حسن بن صباح نے اُس کا پرتپاک استقبال کیا۔

"آ گئے مزمل!" ـــ حسن بن صباح نے اس سے دوستوں کی طرح پوچھا ـــ "اب کیا کرو گے؟"

"میرے کرنے کا ایک ہی کام ہے" ـــ مزمل آفندی نے بڑی دلیری اور جرأت مندی سے جواب دیا ـــ "مرو جاؤں گا اور نظام الملک کو قتل کروں گا"۔

"کب جاؤ گے؟"

"جب آپ حکم دیں گے" ـــ مزمل نے کہا ـــ "کہیں تو میں آج ہی روانہ ہو جاتا ہوں۔ چند دنوں میں نظام الملک کا سر کاٹ کر آپ کے قدموں میں لا رکھوں گا"۔

حسن بن صباح نے اُسے اپنے پاس بٹھائے رکھا اور اسے اپنے ہاتھوں سے شراب پیش کی۔ اُس رات مزمل نے کھانا بھی حسن بن صباح کے ساتھ کھایا۔

اگلی صبح اسے ایک نہایت اعلیٰ نسل کا گھوڑا دیا گیا۔ وہ گھوڑے پر سوار ہوا۔ حسن بن صباح نے باہر آ کر اسے رخصت کیا۔ مزمل گھوڑے پر یوں تن کے بیٹھا ہوا تھا جیسے یہ سارا علاقہ دُور دُور تک اس کی سلطنت ہو اور وہ اس کا سلطان ہو۔ اُس کی کمر کے ساتھ ایک تلوار لٹک رہی تھی اور اُس کے پاس بڑا ہی خوبصورت خنجر بھی تھا۔ وہ سلجوقیوں کے دارالسلطنت مرو جا رہا تھا۔

اس عرصے میں سلطان ملک شاہ اور نظام الملک اگر مزمل آفندی کو بھول نہیں گئے تھے تو انہوں نے اسے یاد بھی نہیں رکھا تھا۔ انہیں احمد اوزال نے یقین دلا دیا تھا کہ مزمل قتل ہو چکا ہے اور اب اس کی واپسی کی امیدیں دل سے نکل دی جائیں۔ وہ اگر زندہ تھا تو شمونہ اور اُس کی ماں میمونہ کے دلوں میں زندہ تھا۔ داستان گو پہلے تفصیل سے سنا چکا ہے کہ شمونہ مزمل آفندی پر دل و جان سے قربان ہو رہی تھی۔ یہ محبت جذباتی تو تھی ہی لیکن دونوں کا جذبہ بھی مشترک تھا۔ دونوں حسن بن صباح کو قتل کرنے کا عزم لئے ہوئے تھے۔ شمونہ اور مزمل کی محبت میں رومان کی چاشنی تو تھی ہی لیکن عزم کی گرمی زیادہ تھی۔

مزمل حسن بن صباح کو قتل کرنے کے لئے روانہ ہو گیا۔ اب شمونہ کے کانوں میں ایک ہی آواز گونجتی تھی کہ مزمل باطنیوں کے ہاتھوں قتل ہو چکا ہے۔ مزمل کو گئے ڈیڑھ مہینہ گزر گیا تھا۔ جب احمد اوزال خلجان سے بھاگ کر مرو آیا تھا تو اس نے یہ خبر سنائی تھی کہ مزمل آفندی حسن بن صباح کے جال میں آ گیا ہے اور اب تک وہ قتل ہو چکا ہو گا۔ سلطان ملک شاہ اور نظام الملک نے تو فوراً" مان لیا تھا کہ احمد اوزال جو کچھ کہہ رہا ہے وہی ہُوا ہو گا لیکن شمونہ نہیں مانتی تھی۔ وہ کہتی تھی کہ مزمل زندہ ہے۔ وہ احمد اوزال کے پیچھے پڑ گئی تھی کہ وہ واپس جائے اور مزمل کو ڈھونڈ کر لائے۔ احمد اوزال جانتا تھا کہ یہ حسین لڑکی جذبات کی رَو میں بہی جا رہی ہے اور یہ حقیقت کو قبول نہیں کر رہی۔ احمد اوزال نے اسے یقین دلانے کی بہت کوشش کر ڈالی تھی کہ مزمل اس دنیا سے اٹھ گیا ہے لیکن شمونہ چیخ چیخ کر کہتی تھی کہ مزمل مر نہیں سکتا' وہ حسن بن صباح کو مار کر مرے گا۔ یہ الفاظ اُس کی زبان پر چڑھ گئے تھے کہ حسن بن صباح زندہ ہے تو میرا مزمل بھی زندہ ہو گا۔

شمونہ اپنی ماں کو ساتھ لے کر سلطان ملک شاہ کے پاس گئی تھی اور رو رو کر اُس نے سلطان کی منتیں کی تھیں کہ وہ دو تین آدمیوں کو خلجان اور الموت بھیجے جو مزمل کو ڈھونڈ کر واپس لے آئیں۔ سلطان نے اسے بڑے پیار سے اور ہمدردی سے سمجھایا تھا کہ مزمل کے زندہ نکل آنے کی کوئی صورت ہے ہی نہیں۔ پھر وہ نظام الملک کے پاس گئی تھی۔ نظام الملک نے بھی اسے وہی جواب دیا تھا جو سلطان ملک شاہ دے چکا تھا۔

شمونہ احمد اوزال کے لئے مصیبت بن گئی تھی۔ احمد اوزال نے اسے ہر بار یہی کہا تھا کہ وہ خلجان اور الموت جانے سے نہیں ڈرتا لیکن وہاں اسے حسن بن صباح اور اس کے خفیہ آدمی بڑی اچھی طرح سے پہچانتے ہیں اور وہ اس خفیہ گروہ کے دو آدمی قتل کر کے بھاگا ہے۔ وہ فوراً" پکڑا جائے گا اور فوراً" ہی اسے قتل کر دیا جائے گا۔

"میں خود وہاں چلی جاؤں" ـــ شمونہ نے کئی بار کہا تھا ـــ "لیکن حسن بن صباح کے ساتھ میں رہی ہوں۔ بہت سارے لوگ وہاں مجھے پہچانتے ہیں۔ حسن بن صباح پہلے ہی مجھے قتل کرنے کا حکم دے چکا ہے۔ وہ تو مجھے دیکھتے ہی مار ڈالے گا۔ وہ

نہ دیکھ سکا تو اُس کا کوئی بھی آدمی مجھے پہچان لے گا اور مجھے پکڑ لے گا اور حسن بن صباح کے حوالے کر دے گا"۔

سلطان ملک شاہ نے شمونہ اور اس کی ماں کو مرو میں ایک بڑا اچھا مکان دے دیا تھا جس میں ماں بیٹی اکیلی رہتی تھیں۔ سلطان نے ان کے لئے وظیفہ بھی مقرر کر دیا تھا۔ سلطان اور نظام الملک کے بعد احمد اوزال سے مایوس ہو کر شمونہ نے ماں کو پریشان کرنا شروع کر دیا تھا۔ ماں نے کئی بار اسے ڈانٹ دیا اور کہا کہ وہ اپنے دماغ کو اپنے قابو میں رکھے ورنہ وہ پاگل ہو جائے گی۔ وہ مزمل کو بھولتی ہی نہیں تھی اور یہ مانتی ہی نہیں تھی کہ مزمل قتل ہو چکا ہے۔ اس کا یہ روز مرہ کا معمول بن گیا تھا کہ صبح چھت پر چلی جاتی اور اُس راستے کو دیکھتی رہتی تھی جو طلیطان سے مرو آتا تھا۔ دن میں کئی بار وہ چھت پر اُس طرف سے آنے والی پگڈنڈی کو دیکھنا شروع کر دیتی۔ کئی بار ماں چھت پر جا کر اُسے گھسیٹتے ہوئے نیچے لائی اور اسے ڈانٹا لیکن شمونہ ایک ہی بات کہتی تھی کہ مزمل زندہ ہے اور وہ واپس آئے گا۔

وہ گھوڑ سواری کی شوقین تھی۔ کبھی کبھی وہ سلطان کے اصطبل سے گھوڑا منگوا لیتی اور شہر سے باہر نکل جایا کرتی تھی۔ گھوڑے کو کچھ دیر دوڑاتی اور گھر آجایا کرتی تھی۔ ایک روز اس نے ماں سے کہا کہ اسے گھوڑا منگوا دے وہ باہر جانا چاہتی ہے۔

"شمونہ!" — ماں نے کہا — "اب میں تمہیں باہر جانے کی اجازت نہیں دے سکتی۔ تمہارا دماغ دن بدن بیکار ہوتا چلا جا رہا ہے۔ مجھے ڈر ہے کہ باہر جا کر طلیطان کا رخ کر لو گی"۔

"نہیں ماں!" — شمونہ نے کہا — "میں پہلے بتا چکی ہوں کہ میں مزمل کی تلاش میں باطنیوں کے علاقوں میں نہیں جا سکتی۔ میں پہلے نہیں گئی تو اب بھی نہیں جاؤں گی۔ گھر میرا دم گھٹتا ہے۔ مجھے ذرا کھلی ہوا میں گھومنے پھرنے کے لئے جانے دیں"۔

ماں نے اسے گھوڑا منگوا دیا اور وہ گھوڑے پر سوار ہوئی اور باہر نکل گئی۔ اس کی ماں بھی چاہتی تھی کہ یہ لڑکی اسی طرح گھوم پھر کر دل بہلائے رکھے تو ٹھیک ہے ورنہ وہ تو پاگل ہوتی جا رہی تھی مرو کے ارد گرد بہت ہی دلفریب مناظر تھے۔ ندی بھی قریب سے گزرتی تھی اور ایک جگہ سے چشمہ پھوٹتا تھا۔ لوگ سیر و تفریح کے

لئے وہیں جایا کرتے تھے لیکن شمونہ کو سیر کے لئے وہی پگڈنڈی اچھی لگتی تھی جو طلیطان سے آتی تھی۔ اُس روز بھی وہ گھوڑے پر سوار ہوئی، شہر سے نکلی اور گھوڑا اسی پگڈنڈی پر ڈال دیا۔ یہ اس کا معمول تھا۔ اس پگڈنڈی پر جا کر وہ گھوڑے کو ایڑ لگاتی، گھوڑا سرپٹ دوڑتا اور شمونہ کوس ڈیڑھ کوس جا کر گھوڑا روک لیتی اور وہاں سے واپس آجاتی۔ اُس روز بھی وہ اسی پگڈنڈی پر چلی گئی۔ اُس نے اپنے معمول کے مطابق گھوڑا سرپٹ دوڑا دیا۔ سامنے سے ایک گھوڑا سوار چلا آرہا تھا۔ شمونہ اس کے قریب سے گزری تو اس کی طرف دیکھا بھی نہیں۔ اُس کا گھوڑا ہوا سے باتیں کر رہا تھا۔

"شمونہ!" — گھوڑے کے قدموں کے بے ہنگم شور اور ہوا کی شائیں شائیں میں ایک آواز سنائی دی۔ پکارنے والا کوئی آدمی تھا۔

شمونہ نے گھوڑا روک لیا اور پیچھے کو موڑا۔ وہ گھوڑا سوار جو اُس کے قریب سے گزرا تھا، اس نے بھی گھوڑا موڑ لیا اور اس کی طرف بڑی تیزی سے آرہا تھا۔ دونوں گھوڑے قریب آئے اور سواروں نے ایک دوسرے کو دیکھا۔

"مزمل؟" — شمونہ کے منہ سے تو جیسے چیخ نکل گئی ہو۔

شمونہ کود کر گھوڑے سے اُتری — وہ مزمل آفندی ہی تھا۔ بلاشک و شبہ وہ مزمل ہی تھا — نظر کا دھوکہ نہیں تھا اور یہ خواب بھی نہیں تھا۔ شمونہ بازو پھیلا کر مزمل کی طرف دوڑی اور مزمل اُسی کی طرح بازو پھیلا کر اس طرف آیا پھر دونوں ایک دوسرے کے بازوؤں میں جکڑے گئے جیسے دو جسم ایک ہو گئے ہوں۔

"میں ہر روز کہتی تھی کہ میرا مزمل زندہ ہے" — شمونہ یہی الفاظ کہے جا رہی تھی۔

شمونہ کی جذباتی کیفیت اور بے تابی کا یہ عالم تھا جیسے ماں کو اس کا کھویا ہوا بچہ مل گیا ہو۔ وہ مزمل کو اپنے بازوؤں میں سے نکلنے ہی نہیں دے رہی تھی۔ بچھڑے ہوئے دو دلوں کو اس بے تابی اور دیوانگی سے ملتا ہوا دیکھ کر سورج افق کے پیچھے چھپ گیا اور دن پر شام کا پردہ ڈال دیا۔

رات شمونہ مزمل کو اپنے گھر لے گئی۔ مزمل کو اسی گھر میں آنا تھا۔ شمونہ کی ماں میمونہ نے بھی مزمل کو دیکھا تو اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہ آیا۔

"میں ابھی وزیراعظم نظام الملک کو اطلاع دیتی ہوں" — میمونہ نے کہا — "وہ سن کر بہت خوش ہوں گے کہ مزمل واپس آگیا ہے۔ یہاں تو سب یقین کئے بیٹھے تھے کہ تم قتل ہو چکے ہو"۔

"نہیں!" — مزمل نے کہا — "اُسے کوئی اطلاع نہیں دے گا۔ میں خود اُس کے پاس جاؤں گا"۔

میمونہ نے مزمل اور شمونہ کو تنہا بیٹھنے کے لئے یوں کیا کہ نیند کا بہانہ کر کے اپنے کمرے میں چلی گئی۔ شمونہ یہی چاہتی تھی۔ وہ مزمل کو اپنے کمرے میں لے گئی اور دروازہ بند کر لیا۔ وہ مزمل سے سننا چاہتی تھی کہ خلجان میں اُس پر کیا بیتی ہے۔ وہ محسوس کر رہی تھی کہ مزمل ذرا رک رک کر اور کچھ سوچ سوچ کر بات کرتا ہے۔

"سلطان اور وزیراعظم نظام الملک کہتے تھے کہ مزمل باطنیوں کے ہاتھوں قتل ہو گیا ہے" — شمونہ نے کہا — "میں کہتی تھی کہ مزمل زندہ ہے اور وہ واپس آئے گا۔ یہ لوگ نہیں مانتے تھے۔ احمد اوزال بھی یہی کہتا تھا"۔

"نظام الملک چاہتا ہی یہی تھا کہ میں قتل ہو جاؤں" — مزمل نے سنجیدہ سے لہجے میں کہا — "اب دیکھنا کون کس کے ہاتھوں قتل ہو گا"۔

"کیا کہہ رہے ہو؟" — شمونہ نے کہا — "میں محسوس کر رہی ہوں کہ وہاں تم پر بہت بری گزری ہے جس کا تمہارے دماغ پر بہت برا اثر معلوم ہوتا ہے۔ کس کے قتل کی بات کر رہے ہو؟"

"بہت بری نہیں شمونہ!" — مزمل نے کہا — "مجھ پر بہت اچھی گزری ہے۔ میری تو آنکھیں کھل گئی ہیں اور میرا دماغ روشن ہو گیا ہے۔ میں حسن بن صباح کو قتل کرنے گیا تھا۔ وہاں جا کر مجھ پر یہ راز کھلا کہ میں نے حسن بن صباح کو نہیں بلکہ کسی اور کو قتل کرنا ہے۔ میں نے بہت سوچا لیکن یہ راز مجھ پر نہیں کھل رہا تھا کہ وہ کون ہے جس نے میرے ہاتھوں قتل ہونا ہے۔ مجھے یہ یقین ہو گیا تھا کہ میں نے کسی کو قتل ضرور کرنا ہے..... کچھ دنوں بعد یہ راز بھی کھل گیا..... وہ شخص آنکھوں کے سامنے آگیا تھا جس کا خون میرے ہاتھ پر لکھا ہوا ہے"۔

"کون ہے وہ؟" — شمونہ نے گھبرا کر پوچھا۔

"نظام الملک!" — مزمل نے کہا۔

"مزمل؟" — شمونہ نے اس کے گالوں کو اپنے ہاتھوں میں لے کر پوچھا — "یہ کیا کہہ رہے ہو؟ کیا تم نظام الملک کو قتل کرو گے؟"

"شمونہ!" — مزمل نے شمونہ کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر اور اُسے اپنے قریب کر کے کہا — "اندازہ کرو کہ تمہاری محبت میرے دل اور روح میں کتنی گہری اُتری ہوئی ہے کہ میں تمہیں ایک ایسا راز بتانے لگا ہوں جو مجھے کسی کو بھی نہیں دینا چاہئے تھا۔ تمہارے بغیر میں ایک قدم چل نہیں سکتا۔ میں کسی اور ارادے سے خلجان گیا تھا لیکن اب میں کسی اور ارادے سے الموت سے یہاں آیا ہوں"۔

"کھل کر بات کرو مزمل!" — شمونہ نے کہا — "میں نے اپنی جان تمہارے لئے وقف کر رکھی ہے..... یہ راز اپنے سینے میں چھپا کر رکھوں گی۔ میں تم سے یہ سننا چاہتی ہوں کہ تم پر وہاں کیا گزری ہے"۔

"وہاں مجھ پر جو گزری ہے وہ اچھی گزری ہے" — مزمل نے بڑے سنجیدہ اور کچھ طنزیہ سے لہجے میں کہا — "بلکہ بہت اچھی گزری ہے۔ وہاں تک تو میں اندھیرے میں پہنچا تھا۔ یہ مجھے وہاں جا کر پتہ چلا کہ میری روح اب تک بھٹکتی رہی ہے۔ وہاں میری روح کو روشنی ملی پھر مجھے پتہ چلا اور میں نے صاف دیکھا کہ دوست کون اور دشمن کون ہے۔ میرے خیالات اور میرے عقیدے بدل گئے۔ اگر کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی تو وہ یہ تھی کہ مجھے شمونہ سے محبت ہے اور میرا دل اس تبدیلی کو بھی قبول نہیں کرے گا کہ میرا دل شمونہ کی محبت کو نکال دے"۔

شمونہ مزمل کی باتیں تو غور سے سن ہی رہی تھی مگر وہ زیادہ غور ان تاثرات پر کر رہی تھی جو مزمل کے چہرے پر آ اور جا رہے تھے۔ اس نے ایسے تاثرات مزمل کے چہرے پر کبھی نہیں دیکھے تھے۔

"راز اپنے سینے میں چھپا کر رکھوں گی مزمل!" — شمونہ نے کہا — "میرے جسم سے جان نکل سکتی ہے، یہ راز نہیں نکلے گا لیکن یہ تو بتاؤ کہ تم نظام الملک جیسے عظیم آدمی کو کیوں قتل کرو گے؟"

"عظیم انسان!" — مزمل نے کہا — "عظیم نظام الملک نہیں، حسن بن صباح عظیم ہے۔ میں اُسے قتل کرنے چل پڑا تھا لیکن وہاں جا کر میں نے محسوس کیا کہ میں

خوش نصیب ہوں کہ مجھے اس عظیم شخصیت کے پاس آنے کا ایک بہانہ مل گیا"۔

شمونہ لرز کر رہ گئی لیکن اس نے اپنے ردِّعمل کا اظہار نہ کیا نہ مزمل کو پتہ چلنے دیا کہ اس کا ردِّعمل کس قدر شدید ہے جسے برداشت کرنا اس کے لئے محال ہے۔

"ایک بات بتاؤ مزمل!" — شمونہ نے پوچھا — "نظام الملک کو کب قتل کرو گے؟..... میں اس لئے پوچھ رہی ہوں کہ تم جلد بازی نہ کر بیٹھو۔ تم نے مجھے کہا ہے کہ میں تمہارا ساتھ دوں۔ اگر تمہیں مجھ پر اعتماد ہے تو یہ کام مجھ پر چھوڑ دو۔ میں موقع پیدا کروں گی اور تم اپنا کام کر گزرنا لیکن میں موقع ایسا پیدا کروں گی کہ تم اسے قتل بھی کر دو اور پکڑے بھی نہ جاؤ"۔

"ہاں شمونہ!" — مزمل نے کہا — "مجھے تم پر اعتماد ہے اور مجھے تم سے یہی امید تھی کہ تم میرے اس کام میں میری مدد کرو گی۔ تم موقع پیدا کرو"۔

مزمل آفندی بڑے لمبے سفر سے آیا تھا اس لئے تھکا ہوا تھا۔ باتیں کرتے کرتے اُس کی آنکھ لگ گئی۔ شمونہ اٹھی، کمرے کا دروازہ بند کر دیا اور اپنی ماں کے پاس چلی گئی۔ اس نے اپنی ماں کو کچھ بھی نہ بتایا۔

شمونہ ساری رات سو نہ سکی۔ وہ سمجھ گئی تھی کہ مزمل کو باطنیوں نے پکڑ لیا تھا لیکن قتل کرنے کی بجائے انہوں نے یہ بہتر سمجھا کہ اسے قاتل ہی رہنے دیا جائے لیکن وہ قتل کسی اور کو کرے..... شمونہ حسن بن صباح کے ساتھ رہ چکی تھی۔ وہ حسن بن صباح کے منظورِ نظر داشتہ تھی۔ وہ قدرتی طور پر غیر معمولی ذہانت کی لڑکی تھی۔ اس نے حسن بن صباح سے کئی ایک راز لئے تھے اور حسن بن صباح اسے راز دے بھی دیتا تھا کیونکہ وہ شمونہ کے حسن و جوانی کو اپنے مقاصد کی تکمیل کے لئے استعمال کرتا تھا۔ خود شمونہ اپنے حسن کو بڑی خوبی اور کامیابی سے استعمال کرتی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ حسن بن صباح کے پاس ایسے حربے اور طریقے ہیں کہ وہ پتھر کو بھی موم کر لیتے ہیں۔ وہ کسی بھی شخص کو ایک خاص عمل میں سے گزار کر اس کی سوچیں، اس کے ارادے اور اس کے عقیدے یکسر بدل دیتے ہیں۔ اس کے سامنے دو آدمیوں پر یہ عمل کیا گیا تھا۔ یہ کوئی جادو یا روحانی عمل نہیں تھا بلکہ یہ ایک نفسیاتی طریقۂ کار تھا۔ شمونہ جان گئی کہ مزمل کا جسم اور اس کا نام نہیں بدلا جا سکا، اس کے کردار کو اور اس کے عقیدے کو اور اُس کے ارادوں کو بالکل الٹ کر دیا گیا

ہے۔ مہینہ ڈیڑھ مہینہ اس عمل کے لئے خاصا عرصہ تھا۔ اسے نظام الملک کے قتل کے لئے واپس بھیجا گیا ہے اور یہ شخص عزم لے کر آیا ہے کہ نظام الملک کو قتل کرنا ہے۔

○

اگلی صبح مزمل آفندی اٹھا۔ شمونہ خود ناشتہ لے کر اُس کے کمرے میں گئی اور دونوں نے اکٹھے ناشتہ کیا۔

"اب میری بات سنو مزمل!" — شمونہ نے کہا — "میں نے اپنی ماں کو یہ بات نہیں بتائی اور تم بھی نہ بتانا۔ نظام الملک سے ملے ہوئے مجھے کچھ دن گزر گئے ہیں۔ میں ابھی اس کے پاس جا رہی ہوں اور کچھ جذباتی سی باتیں کروں گی کہ میں اُسے صرف ملنے آئی ہوں۔ میں اُسے اسی طرح دو تین مرتبہ ملوں گی اور مجھے اُمید ہے کہ میں اسے اپنے جذبات میں الجھا لوں گی اور پھر میں ایک دن اسے باہر لے جاؤں گی۔ تمہیں پہلے بتا دوں گی۔ تم نے کوئی اوچھی اور الٹی سیدھی حرکت نہیں کرنی۔ میرے آخری اشارے کا انتظار کرنا"۔

مزمل آفندی کے چہرے پر سکون اور اطمینان کا تاثر آ گیا۔

"مجھے تم سے یہی اُمید تھی شمونہ!" — مزمل نے شمونہ کو اپنے ایک بازو کے گھیرے میں لے کر کہا — "تم تصور میں نہیں لا سکتیں کہ میں یہ کام کر چکا تو تمہیں کس جنت میں اپنے ساتھ لے کر جاؤں گا۔ تم موقع پیدا کرو۔ میں تمہارے آخری اشارے کا انتظار کروں گا"۔

شمونہ کو بہت دکھ ہوا کہ مزمل جیسا پیارا اور جذبے والا آدمی اور دینِ اسلام پر اپنا آپ بھی قربان کرنے والا یہ خوبرو جوان کس طرح ضائع ہو گیا ہے۔ اس نے مزمل پر ظاہر نہ ہونے دیا کہ اسے کتنا دکھ پہنچا ہے۔ اس نے اپنے ہونٹوں پر بڑی ہی جانفزا مسکراہٹ قائم رکھی۔ وہ ناشتے کے بعد کمرے سے نکل آئی۔ ماں سے کہا کہ وہ برتن اٹھا لے اور وہ خود گھر سے نکل گئی۔ وہ نظام الملک سے ملنے جا رہی تھی۔

نظام الملک گھر ہی مل گیا۔ وہ ابھی ابھی ناشتے سے فارغ ہوا تھا۔ اسے اطلاع ملی کہ شمونہ آئی ہے تو اُس نے اُسے بلا لیا اور سوچا کہ یہ لڑکی آج پھر ضد کرنے آئی ہے کہ وہ تین آدمیوں کو علیجان اور التونت بھیجو جو مزمل کو ڈھونڈ لائیں۔ اُس نے

شمونہ کو اس خیال سے بلا لیا تھا کہ اسے بہلائے پھسلائے گا اور اس کے دل سے مزل کو نکالنے کی کوشش کرے گا۔

"آ شمونہ!" — نظام الملک نے کہا — "بیٹھو۔ آج شاید تمہیں پھر مزل یاد آرہا ہے یا خواب میں آیا ہو گا!"

"نہیں محترم!" — شمونہ نے کہا — "وہ خواب میں نہیں آیا بلکہ وہ حقیقت میں آگیا ہے۔ کل شام زندہ و سلامت میرے پاس پہنچ گیا ہے"۔

"کیا تمہارا دماغ حاضر ہے شمونہ!" — نظام الملک نے اس طرح کہا جیسے اسے شک ہوا ہو کہ یہ لڑکی دماغی توازن کھو بیٹھی ہے — "وہ میرے پاس کیوں نہیں آیا؟ ..... کیا وہ کچھ بتاتا ہے کہ اس پر کیا بیتی ہے؟"

"محترم!" — شمونہ نے کہا — "میں اللہ کا شکر ادا کرتی ہوں کہ وہ میرے پاس آگیا تھا لیکن وہ سیدھا آپ کے پاس نہ پہنچ گیا ورنہ بات کچھ اور بن جاتی"۔

"کیا کہہ رہی ہو؟" — نظام الملک نے پوچھا — "کیا بات بن جاتی؟ معلوم ہوتا ہے تم ذہنی طور پر بہت پریشان ہو"۔

"ہاں محترم!" — شمونہ نے کہا — "میں ساری رات سوئی نہیں۔ میں تمہید باندھے بغیر یہ بتانے آئی ہوں کہ آپ نے جس کو حسن بن صباح کو قتل کرنے کے لئے بھیجا تھا وہ آپ کو قتل کرنے کے لئے واپس آیا ہے"۔

"مجھے حیران نہیں ہونا چاہئے" — نظام الملک نے کہا — "مجھے معلوم ہے کہ حسن بن صباح کے پاس ایسا جادو ہے جو مزل جیسے جوانوں کو اپنا گرویدہ بنا لیتا ہے۔ مزل پر بھی یہی جادو چل گیا ہو گا"۔

"محترم!" — شمونہ نے کہا — "آپ نے تو صرف سنا ہے کہ حسن بن صباح کے پاس کوئی ایسا جادو ہے، میں نے اپنی آنکھوں سے یہ جادو چلتا دیکھا ہے۔ یہ میں آپ کو تفصیل سے بتاؤں گی لیکن فوری طور پر یہ سوچیں کہ مزل کا کیا کیا جائے۔ اسے اس طرح آزاد نہیں چھوڑا جا سکتا۔ میں اسے محبت کی زنجیروں میں باندھ کر رکھ سکتی ہوں لیکن یہ زنجیریں کسی وقت کچی بھی ثابت ہو سکتی ہیں۔ کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ کسی بھی وقت وہ آپ پر قاتلانہ حملہ کر دے؟..... میں ڈرتی ہوں ایسا ہو جائے گا۔ آپ دانشمند ہیں۔ میں آپ کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں۔ ایک مشورہ

ہے۔ اگر آپ کو اچھا لگے تو مزل کو قید خانے میں بند کر دیں"۔

"نہیں شمونہ!" — نظام الملک جو عقل و دانش کے لئے مشہور تھا، بولا — "میں اتنا خوبصورت جوان اور اتنا جذبے والا جوان ضائع نہیں کروں گا۔ اسے کچھ دنوں کے لئے آزاد رکھنا پڑے گا لیکن میں اس کے لئے ایک جواز پیدا کروں گا۔ جس طرح اسے حسن بن صباح نے اپنے مقاصد کے لئے حسب از آلۂ کار بنایا ہے اسی طرح میں اسے واپس لاؤں گا اور اسے ویسا ہی مرد مومن بناؤں گا جیسا یہ تھا۔ اندازہ کرو شمونہ! اس نے اپنے ماں باپ اور بہن بھائیوں کو دل سے اتار دیا تھا اور یہ ایک عزم لئے ہوئے تھا کہ حسن بن صباح کو قتل کرے گا۔ میں یہ بھی جانتا ہوں کہ یہ حسن بن صباح کو ایک انسان سمجھ کر قتل نہیں کرنا چاہتا تھا بلکہ ایک باطل نظریے اور ابلیسیت کا گلا کاٹنا چاہتا تھا...... میں اسے صراط مستقیم پر لے آؤں گا لیکن اس کے لئے ہمیں ایک کھیل کھیلنا پڑے گا جس میں اپنے آپ کو خطرے میں ڈالوں گا"۔

"اگر اس کھیل میں میں نے کچھ کرنا ہے تو مجھے بتا دیں" — شمونہ نے کہا۔

"تمہارے ذمے ایک کام ہے" — نظام الملک نے کہا — "آج شام اسے میرے پاس بھیج دو۔ اسے کہنا کہ میں فلاں کمرے میں اکیلا ہوں گا۔ اسے یقین دلانا کہ نظام الملک کو قتل کرنے کا یہ بہترین موقع ہے۔ قتل کرنے کا طریقہ یہ بتانا کہ نظام الملک پیٹھ پھیرے تو خنجر نظام الملک کی پیٹھ میں اتار دینا...... باقی میں سنبھال لوں گا"۔

"نہیں محترم وزیر اعظم!" — شمونہ نے کہا — "میں ڈرتی ہوں کہیں ایسا نہ ہو کہ کھیل ہی کھیل میں خنجر آپ کے دل میں اتر جائے"۔

"تم اسے بھیج دینا" — نظام الملک نے کہا — "میں چوکنا رہوں گا...... تم جاؤ"۔

شمونہ واپس آئی اور اس نے مزل کو ویسے ہی بتایا جیسے نظام الملک نے اسے بتایا تھا۔ شمونہ نے مزل سے کہا کہ آج موقع ہے۔ یہ کام آج ہی کر گزرو۔

نظام الملک نے شمونہ کو وہ کمرہ دکھا دیا تھا۔ وہ کمرہ ایسا تھا جس کا تعلق اتنے بڑے مکان کے دوسرے کمروں کے ساتھ نہیں تھا۔ نظام الملک صرف اس وقت اس کمرے میں بیٹھا کرتا تھا جب اسے کسی پیچیدہ مسئلے پر غور کرنا ہوتا تھا۔ کوئی بھی

اس کے علم میں قتل نہیں ہو سکتا تھا۔

شام کو مزمل آفندی اپنے کپڑوں کے اندر خنجر چھپائے نظام الملک کے ہاں چلا گیا۔ دروازے پر کوئی دربان نہیں تھا۔ یہ بھی اس کھیل کا ایک حصہ تھا کہ دربان ہٹا دیئے گئے تھے۔ شمونہ نے مزمل کو وہ خاص کمرہ اچھی طرح سمجھا دیا تھا۔ مزمل اس گھر میں زخمی حالت میں رہ بھی چکا تھا پھر اس گھر میں وہ صحت یاب ہوا تھا اس لئے وہ اتنی بڑی حویلی سے واقف تھا۔ وہ اس کمرے کے دروازے پر پہنچ گیا اور دستک دی۔ نظام الملک نے خود اٹھ کر دروازہ کھولا۔ باہر مزمل کھڑا تھا۔ نظام الملک نے اُسے گلے لگا لیا اور خوشی کا اظہار کیا کہ وہ زندہ واپس آگیا ہے۔ اُسے کمرے میں لے جا کر اشارہ کیا کہ یہاں بیٹھ جاؤ۔

نظام الملک نے اس کی طرف پیٹھ کی اور دو تین قدم آگے کو چلا۔ اُسے معلوم تھا کہ اب کیا ہو گا۔ مزمل جو ابھی بیٹھ ہی رہا تھا' تیزی سے کھڑا ہو گیا' اور اسی تیزی سے کپڑوں کے اندر سے خنجر نکالا اور نظام الملک کی پیٹھ پر مارنے کے لئے اس نے ہاتھ اوپر اٹھایا۔ جب اس کا ہاتھ خنجر مارنے کے لئے آگے ہوا تو اسی تیزی سے نظام الملک پیچھے کو مڑا اور اس نے خنجر والے ہاتھ کی کلائی اپنے ہاتھ پر روک لی اور اس کلائی کو مضبوطی سے پکڑ لیا۔ اس کو اس نے زور سے جھٹکا دیا تو مزمل اس کے جسم کے ساتھ لگ گیا۔ نظام الملک نے نیچے سے اپنا گھٹنا اوپر کو مارا جو مزمل کے پیٹ میں لگا۔ مزمل درد کی شدت سے دوہرا ہو گیا۔ نظام الملک نے اس کی کلائی دونوں ہاتھوں سے مروڑی۔ مزمل اس طرف گھوما۔ نظام الملک نے ایسا داؤ چلا کہ مزمل پیٹھ کے بل فرش پر گرا اور اس کے ہاتھ سے خنجر گر پڑا۔ نظام الملک نے اپنا پاؤں گرتے ہوئے مزمل کی شہ رگ پر رکھ کر پورے جسم کا زور ڈالا۔ مزمل تڑپنے لگا۔

نظام الملک نے ایک آواز کا اشارہ مقرر کر رکھا تھا جو اس نے دیا۔ اس کے دو دربان دوڑے آئے اور آگے یہ منظر دیکھا۔ خنجر فرش پر پڑا تھا اور مزمل نظام الملک کے پاؤں کے نیچے تھا۔ دربانوں نے مزمل کو پکڑ لیا۔

"لے جاؤ" — نظام الملک نے کہا — "قید خانے میں بند کر دو۔ میں اسے کل دیکھوں گا"۔

دربانوں نے رسیوں سے مزمل کے ہاتھ باندھ دیئے اور اُسے لے گئے۔

نظام الملک بوڑھا آدمی تھا۔ اس میں اگر طاقت تھی تو وہ عقل و دانش کی اور ایمان کی طاقت تھی۔ وہ مزمل جیسے گٹھے ہوئے جوان آدمی کا مقابلہ کرنے کے قابل نہیں تھا لیکن اس کی روحانی قوتیں بیدار تھیں۔ پھر وہ صرف عالم دین ہی نہ تھا' وہ سالار بھی تھا۔ تیغ زنی اور تیر اندازی میں مہارت رکھتا تھا۔ اس نے اُسی روز سلطان ملک شاہ کو یہ واقعہ سنایا اور کہا کہ وہ مزمل کو واپس اپنی طرف لے آئے گا۔

"سلطان محترم!" — نظام الملک نے کہا — "اب ہمیں الموت پر فوج کشی کرنی پڑے گی۔ اس باطل کو فوجی طاقت سے ہی کچلا جا سکتا ہے۔ حملہ آور فوج کا سپہ سالار میں خود ہوں گا۔ آپ کی اجازت چاہئے"۔

"ہاں خواجہ!" — سلطان ملک شاہ نے کہا — "آپ کو اجازت ہے"۔

مزمل آفندی کو جب گھسیٹتے دھکیلتے ہوئے قید خانے میں لے گئے اور اسے ایک کوٹھڑی میں بند کر دیا تو اس نے سلاخوں کو پکڑ کر زور زور سے ہلانا اور چیخنا چلانا شروع کر دیا۔

"تم مجھے قبر میں دفن کر دو تو بھی اس شخص کو قتل کرنے کے لئے نکل آؤں گا"—مزمل یہی الفاظ دہرائے چلا جا رہا تھا۔

نظام الملک نے جب حکم دیا تھا کہ مزمل آفندی کو قید خانے میں ڈال دو تو اس نے یہ بھی کہا تھا کہ میں اُسے کل دیکھوں گا۔ اگلے روز اس نے قید خانے میں جانے کا ارادہ کیا تو اُسے خیال آگیا کہ پہلے معلوم کر لیا جائے کہ مزمل کس حال میں ہے اور اُس کا ردِ عمل اور رویہ کیا ہے۔ نظام الملک نے قید خانے میں ایک آدمی کو یہ پیغام دے کے بھیجا کہ معلوم کر کے آئے کہ مزمل کس حال میں ہے۔

کچھ وقت بعد اُسے بتایا گیا کہ مزمل رات بھر جاگتا، چیختا اور چلاتا رہا ہے اور اب بھی وہ اسی کیفیت میں ہے۔

"کیا کہتا ہے؟"—نظام الملک نے پوچھا۔

"کہتا ہے میں نظام الملک کو قتل کر کے مروں گا"—قید خانے سے آنے والے آدمی نے جواب دیا۔

نظام الملک کو شمونہ نے تفصیل سے بتایا تھا کہ حسن بن صباح کے ہاں کس طرح لوگوں کے دماغوں اور دلوں پر قبضہ کر کے انہیں اپنے سانچے میں ڈھال لیا جاتا ہے اور کس طرح انہیں قاتل بنایا جاتا ہے۔ نظام الملک نے اپنے ایک خاص معتمد کو بلایا اور اُسے سرگوشیوں میں کچھ ہدایات دے کر بھیج دیا۔ اس شخص کے جانے کے بعد نظام الملک نے اپنے ملازم کو بلایا اور اسے کہا کہ وہ طبیب نجم کو اپنے ساتھ لے آئے۔

جس طبیب کو نظام الملک نے بلایا تھا اُس کا پورا نام نجم بن انجم مدنی تھا۔ وہ ضعیف

العمر آدمی تھا۔ مرو میں ہی نہیں اور سلطنتِ سلجوقیہ میں ہی نہیں بلکہ دوسری بادشاہیوں اور دُور دُور کے علاقوں میں بھی اس کی شہرت تھی۔ اسے سلجوقی سلطان کچھ ایسے اچھے لگے کہ وہ یہیں کا ہو کے رہ گیا تھا۔ وہ اسلام کا اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا شیدائی تھا۔ وہ اتنا ضعیف ہو چکا تھا کہ اب کم ہی کبھی باہر نکلتا تھا اور عام قسم کی بیماریوں کے مریضوں کو دیکھنے کا اس کے پاس وقت ہی نہیں ہوتا تھا اور نہ اس میں اتنی ہمت رہی تھی لیکن وہ آرام بھی نہیں کرتا تھا' کیمیاگری اور تجربات میں لگا رہتا تھا۔

اسے جونہی نظام الملک کا پیغام ملا' وہ سواری پر بیٹھا اور نظام الملک کے پاس پہنچ گیا۔ نظام الملک کو اطلاع ملی کہ طبیب نجم مدنی کی سواری آئی ہے تو وہ باہر کو دوڑ پڑا اور طبیب کا استقبال اس طرح کیا جس طرح اُس نے سلطان ملک شاہ کا کبھی نہیں کیا تھا۔

"محترم طبیب!"—نظام الملک نے کہا—"مجھے خود آپ کے پاس آنا چاہئے تھا' میں آپ کو زحمت نہ دیتا....."

"وزیرِ اعظم!"—طبیب نجم مدنی نے اس کی بات کاٹ کر کہا—"کیا یہ بہتر نہیں ہو گا کہ آپ نے مجھے جس مقصد کے لئے بلایا ہے وہ بیان کر دیں؟"

نظام الملک نے طبیب کو مزمل آفندی کے متعلق بتانا شروع کر دیا۔ اس نے تفصیل سے بتایا کہ مزمل اس کے پاس کس جذبے سے اور کس طرح یہاں پہنچا تھا اور پھر اُس نے ایک جنگ میں کیا کارنامہ سرانجام دیا تھا اور پھر اس نے طبیب کو تفصیل سے بتایا کہ مزمل آفندی نے اپنے جینے کا یہی ایک مقصد بنا لیا تھا کہ وہ حسن بن صباح کو قتل کرے گا۔ پھر اس نے طبیب کو بتایا کہ مزمل آفندی حسن بن صباح کے قتل کے ارادے سے چلا گیا لیکن چالیس بیالیس روز بعد واپس آیا تو اس کی شکل و صورت اور چال ڈھال تو وہی تھی لیکن وہ بالکل ہی بدل گیا تھا۔

"اس نے آتے ہی مجھ پر قاتلانہ حملہ کیا"—نظام الملک نے کہا—"یہ تو مجھے قبل از وقت معلوم ہو گیا تھا کہ وہ مجھے قتل کرے گا اس لئے میں بچ گیا بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اسے یہ موقع میں نے خود فراہم کیا تھا کہ وہ مجھ پر قاتلانہ حملہ کرے"۔

نظام الملک نے شمونہ کا حوالہ دے کر طبیب کو تفصیل سے بتایا کہ اس لڑکی نے اُسے پہلے ہی خبردار کر دیا تھا کہ مزمل مجھ پر قاتلانہ حملہ کرے گا۔ نظام الملک نے طبیب کو شمونہ کے متعلق بھی سب کچھ بتایا اور اسے قاتلانہ حملے کا اور مزمل کی گرفتاری کا

واقعہ سنایا۔

"کیا وہ اس لڑکی شمونہ کو چاہتا ہے؟" — طبیب نے چونک کر پوچھا۔

"چاہتا ہی نہیں محترم طبیب!" — نظام الملک نے جواب دیا — "وہ تو اس لڑکی کو عشق کی حد تک چاہتا ہے اور اگر کسی انسان کے آگے سجدہ کرنے کی اجازت ہوتی تو مزمل اس لڑکی کے آگے سجدے کرتا رہتا"۔

"اس لڑکی کو یہیں بلا لو" — طبیب نے کہا — "آپ نے ابھی تک مجھے یہ نہیں بتایا کہ آپ چاہتے کیا ہیں۔ کیا آپ اس شخص مزمل آفندی کی قسمت کا فیصلہ کرنا چاہتے ہیں اور مجھ سے مشورہ لے رہے ہیں؟"

"اس کی قسمت کا فیصلہ کرنا میرے لئے کوئی مشکل نہیں تھا" — نظام الملک نے کہا — "فیصلہ کرنا ہوتا تو مجھے کسی کے مشورے کی ضرورت نہیں تھی۔ میں اُسے اسی وقت اپنے محافظوں کو حکم دے کر قتل کروا دیتا اور کہتا کہ اس کی لاش کو دفن نہیں کرنا' باہر پھینک دو کہ اسے کتے اور گدھ کھا جائیں' لیکن محترم طبیب! میں مزمل آفندی جیسے قیمتی' جواں سال اور خوبرو آدمی کو ضائع نہیں کرنا چاہتا۔ میں شاید آپ کو اچھی طرح بتا نہیں سکتا کہ اس جواں سال آدمی میں اسلام کی کس قدر شدید اور جذباتی محبت ہے۔ میرا ایک مقصد تو یہ ہے کہ میں اسے واپس اپنی اصلی حالت میں لے آؤں۔ دوسرا مقصد یہ ہے جو صرف آپ پورا کر سکتے ہیں' وہ یہ کہ اسے حسن بن صباح کے ہاں کسی ایسے عمل سے گزارا گیا ہے جس نے اس کے دل و دماغ کو اُلٹا دیا ہے۔ اُس کی نگاہ میں دوست دشمن بن گئے ہیں۔ میں آپ سے یہ درخواست کرتا ہوں کہ اپنے تجربے کی روشنی میں دیکھیں کہ وہ باطنی کس طرح اچھے بھلے انسان کو اپنوں کا ہی قاتل بنا دیتے ہیں"۔

"عزیز نظام الملک!" — طبیب نے کہا — "آپ نے یہ بات آج سوچی ہے' میں بڑے لمبے عرصے سے اس مسئلے پر کام کر رہا ہوں۔ ایک مدت گزری مجھے پتہ چلا ہے کہ باطنی لوگوں کی سوچوں پر اور خیالوں پر قابض ہو کر انہیں مکمل ابلیس اور مکمل انسان کش بلکہ آدم خور بنا رہے ہیں۔ میں نے اپنے آدمی وہاں بھیجے جنہوں نے مجھے کچھ ضروری باتیں بتائیں۔ یہ حشیش کا کمال ہے اور پھر یہ کمال ہے ان لوگوں کا یعنی ان باطنیوں کے اپنے دماغ کا کہ انہوں نے انسانی فطرت کی سب سے بڑی کمزوری کو استعمال کیا ہے"۔

"محترم طبیب!" — نظام الملک نے کہا — "یہ آپ بھی جانتے ہیں اور میں بھی

جانتا ہوں کہ وہ کس طرح لوگوں کے دل و دماغ پر قبضہ کرتے اور انہیں اپنے مقاصد کے لئے استعمال کرتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ ہمارے پاس اس کا کوئی توڑ ہے؟"

"جی ہاں!" — طبیب نے جواب دیا — "اس کا توڑ میں نے سال ہا سال کی محنت سے تیار کیا ہے..... لیکن میرے عزیز نظام الملک! ہم صرف اس شخص کو واپس اس کی اصلیت میں لا سکیں گے جو مزمل جیسا اِکا دُکا ہمارے پاس پہنچ جائے گا۔ حسن بن صباح اور اس کے ابلیسی گروہ نے اپنے زیر اثر علاقوں میں اجتماعی طور پر لوگوں کو اپنا گرویدہ بنا لیا ہے۔ اس کا ہمارے پاس کوئی توڑ نہیں..... ہاں' آپ کے پاس اس کا ایک علاج موجود ہے۔ وہ کریں اور اس ابلیسی فتنے کو ختم کریں..... یہ ہے فوج کشی..... حملہ کریں' حسن بن صباح' احمد بن عطاش اور ان کے خاص گروہ کو صفحۂ ہستی سے مٹا دیں اور اس کے بعد اسلام کی تبلیغ کریں"۔

"یہ تو ہم کر ہی رہے ہیں" — نظام الملک نے کہا — "میں نے سلطان ملک شاہ سے حملے کی اجازت لے لی ہے اور اس حملے کی قیادت میں خود کروں گا"۔

"لیکن آپ کو بہت کچھ سوچ کر قدم اٹھانا ہو گا" — طبیب نجم مدنی نے کہا — "میں نے کسی زمانے میں قلعہ الموت دیکھا تھا۔ اب تو سنا ہے کہ اس کے دفاعی انتظامات اور زیادہ مضبوط کر دیئے گئے ہیں۔ آپ کو معلوم ہو گا کہ وہ قلعہ بلندی پر ہے"۔

"ہاں محترم طبیب!" — نظام الملک نے کہا — "یہ فوجی اور جنگی مسئلے ہیں۔ یہ مجھ پر چھوڑیں۔ آپ اتنا کریں کہ مزمل آفندی کے دماغ کو اس کی اصلی حالت میں لے آئیں"۔

○

قید خانے کی ایک کوٹھڑی میں مزمل آفندی چیخ چلا کر تھک گیا تھا اور دیوار کے ساتھ پیٹھ لگائے فرش پر بیٹھا تھا۔ اس کا سر جھکا ہوا تھا۔ دروازے کی سلاخوں کے باہر ایک آدمی آ کر رُک گیا۔

"مزمل!" — اس آدمی نے سرگوشی کی۔

مزمل نے آہستہ آہستہ سر اٹھایا۔

"مزمل آفندی!" — اس آدمی نے اب ذرا بلند سرگوشی کی — "یہاں آؤ"

"مجھے کیوں بلا رہے ہو؟" — مزمل آفندی نے گرج کر کہا — "یہاں سے چلے

جاؤ ورنہ میں.....“

”آہستہ بول احمق آدمی!“ — اس آدمی نے ذرا اور بلند سرگوشی میں کہا — ”میں تمہارا دوست ہوں۔ یہاں آؤ“۔

مزمل آفندی سلاخوں کے قریب آ کر اس آدمی کے سامنے بیٹھ گیا۔

”مجھے آج صبح پتہ چلا ہے کہ تمہیں قید کر دیا گیا ہے“ — اس آدمی نے کہا — ”میں تمہیں یہاں سے فرار کراؤں گا۔ خاموشی سے یہاں بیٹھے رہو۔ انہیں تنگ نہ کرو ورنہ یہ تمہیں اتنا ماریں پیٹیں گے کہ تم جان سے ہی ہاتھ دھو بیٹھو گے۔ میں جانتا ہوں کہ تم الموت سے کیوں یہاں آئے تھے۔ تمہیں جن لوگوں نے بھیجا ہے میں ان کا جاسوس ہوں اور مجھے ہر بات کا علم ہے۔ اس قید خانے میں میرا اثر و رسوخ چلتا ہے۔ میں بھی نظام الملک کو قتل کرنا چاہتا ہوں لیکن الموت سے امام حسن بن صباح کا پیغام ملا ہے کہ یہ کام مزمل آفندی کرے گا۔ مجھے یہ فرض سونپا گیا ہے کہ میں تمہاری مدد کروں اور تم کسی مصیبت میں گرفتار ہو جاؤ تو میں تمہیں اس میں سے نکالوں۔ تم آرام سے اور مکمل خاموشی سے یہاں بیٹھے رہو، تمہیں یہاں سے نکلوانا اور واپس الموت بھیج دینا میرا کام ہے“۔

”کیا میں نظام الملک کو قتل کر سکوں گا؟“ — مزمل نے پوچھا۔

”پہلا کام تمہیں یہاں سے فرار کرانا ہے“ — اس آدمی نے کہا — ”اس کے بعد دیکھنا ہے کہ نظام الملک کو قتل کرنے کا موقع مل سکتا ہے یا نہیں۔ اگر دو یا تین دن موقع نہ ملا تو تمہیں واپس الموت بھجوا دیں گے اور موقع پیدا کر کے تمہیں واپس لے آئیں گے“۔

”ایک کام کر سکتے ہو؟“ — مزمل آفندی نے کہا — ”شمونہ نام کی ایک لڑکی یہاں ہے.....“

”ہاں مزمل!“ — اس آدمی نے کہا — ”میں اسے جانتا ہوں۔ یہ بھی کیا جاسوسی ہوئی کہ میں شمونہ کو جان نہ سکتا۔ میں یہ بھی جانتا ہوں کہ اس وقت وہ نظام الملک کے ہاں گئی ہوئی ہے“۔

”میں صرف یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ وہ ٹھیک تو ہے“ — مزمل نے کہا — ”کہیں ایسا تو نہیں کہ اسے بھی پریشان کیا جا رہا ہو“

”نہیں!“ — اس آدمی نے کہا — ”اسے کوئی پریشانی نہیں۔ اگر تمہارے ساتھ تعلقات کی وجہ سے اسے بھی مشکوک سمجھا گیا ہوتا تو اسے تمہارے ساتھ ہی قید خانے میں پھینک دیا گیا ہوتا..... تم چاہو گے تو اسے بھی یہاں سے نکلوا کر تمہارے ساتھ بھیج دیں گے“۔

مزمل آفندی یوں مطمئن ہو گیا جیسے دہکتے ہوئے انگاروں پر پانی پھینک دیا گیا ہو۔

”اب تمہارے کھانے پینے کا انتظام میرے ہاتھ میں ہو گا؟“ — اس آدمی نے کہا — ”میری کوشش یہ ہو گی کہ میں خود تمہیں کھانا دینے آیا کروں۔ اگر میں نہ آسکوں تو جو کوئی آدمی جو کچھ بھی کھانے پینے کے لئے لائے وہ آرام اور اطمینان سے لے کر کھا لینا..... یوں ظاہر کرو جیسے تم اندر سے مر گئے ہو اور اب تم کوئی ایسی ویسی حرکت نہیں کرو گے..... مجھے اب یہاں سے چلے جانا چاہئے“۔

”ہاں بھائی میرے!“ — مزمل نے کہا — ”میں تم پر بھروسہ کروں گا۔ تم جاؤ لیکن میرے فرار کا انتظام جلدی کرو۔ میں کوشش یہ کروں گا کہ نظام الملک کو قتل کر کے واپس الموت جاؤں“۔

”ایسا ہی ہو گا مزمل!“ — اس شخص نے کہا اور وہ چلا گیا۔

○

شمونہ نظام الملک کے خاص کمرے میں بیٹھی طبیب نجم مدنی کو سنا رہی تھی کہ وہ جب حسن بن صباح کے ساتھ تھی تو کیا کیا طریقے استعمال کر کے اپنے مطلب کے لوگوں کو اپنا آلۂ کار بنایا جاتا تھا۔ شمونہ نے طبیب کو یہ بھی بتایا کہ اُسے اور اُس جیسی لڑکیوں کو تربیت دے کے استعمال کیا جاتا تھا۔

”محترم بزرگ!“ — شمونہ نے کہا — ”حسن بن صباح کے پاس جادو بھی ہے اور میں یہ بھی جانتی ہوں کہ یہ جادو اُس نے احمد بن عطاش سے سیکھا ہے لیکن یہ جادو کم ہی استعمال کیا جاتا ہے۔ اس کی بجائے ایک اور جادو استعمال کیا جاتا ہے جس سے کوئی نہیں بچ سکتا، وہ جادو میں ہوں۔ مجھے دیکھ لیں..... میں نے یہ جادو اپنے ہاتھوں اور اپنی زبان سے چلایا بھی ہے اور چلتا دیکھا بھی ہے“۔

”تو اب میری بات سنو شمونہ!“ — طبیب نجم نے کہا — ”اب تمہیں یہی جادو مزمل آفندی پر چلانا ہے۔ میرا خیال ہے کہ تمہارا جادو آسانی سے چل جائے گا کیونکہ مجھے

بتایا گیا ہے کہ وہ تم سے دِلی نہیں بلکہ روحانی محبت کرتا ہے"۔

"ہاں میرے بزرگ!" ــــ شمونہ نے کہا ــــ "مزمل کو واپس اُسی مقام پر لانے کے لئے میں تو اپنی جان بھی قربان کر دوں گی۔ آپ مجھے کہیں گے کہ اپنی جان دے دو تو مزمل اپنی اصلی حالت میں آجائے گا تو میں اس کے لئے تیار ہوں"۔

"ایسی ضرورت نہیں پڑے گی" ــــ طبیب نے کہا ــــ "میں تمہیں کچھ باتیں اور کچھ طریقے بتاؤں گا۔ تم نے اس کے مطابق عمل کرنا ہے"۔

اُس زمانے میں برین واشنگ کی اصطلاح سے کوئی واقف نہیں تھا لیکن برین واشنگ کا عمل موجود تھا اور حسن بن صباح برین واشنگ کا غیر معمولی طور پر ماہر تھا اور اُس نے جو طریقے وضع کئے تھے انہیں آج کے ماہرینِ نفسیات اور ڈاکٹر بھی مستند مانتے ہیں۔

"میرے عزیز نظام الملک!" ــــ طبیب نجم مدنی نے کہا ــــ "اللہ نے ہر جاندار کا جوڑا پیدا کیا ہے..... نر اور مادہ..... کیا آپ نے جانوروں کو دیکھا نہیں کہ ایک مادہ کی خاطر وہ ایک دوسرے کا خون بہا دیتے ہیں۔ انسان کو خدا نے عقل دی ہے' جذبات دیئے ہیں اور کچھ حِسیں دی ہیں اس لئے انسانی نر اور مادہ ایک دوسرے کی محبت حاصل کرنے کے لئے ایسے ایسے طریقے سوچ لیتے ہیں کہ انسان خود بھی حیران رہ جاتا ہے۔ مرد کی فطرت میں عورت کی طلب بڑی شدید ہوتی ہے۔ مرد نے جب بھی دھوکا کھایا عورت کے ہاتھوں کھایا۔ اس لڑکی شمونہ جیسی عورت ایک دلکش نشہ بن کر اپنی پسند کے آدمی پر طاری ہو جاتی ہے۔ اگر عورت خود غرض ہے اور وہ اپنی پسند کے مرد سے کوئی دنیاوی فائدہ اٹھانا چاہتی ہے مثلاً اس کے مال و اموال پر قبضہ کرنا چاہتی ہے تو وہ اپنی نسوانیت کے نشے کے ساتھ کوئی اور نشہ بھی شامل کر لیتی ہے جو وہ دھوکے سے اس شخص کو دیتی رہتی ہے۔ اُس کے ساتھ وہ پیار و محبت کی ایسی ایسی مصنوعی حرکتیں کرتی ہے کہ اُس کے چنگل میں آیا ہُوا مرد اس کے قدموں میں لُوٹ پُوٹ ہوتا رہتا ہے۔ حسن بن صباح یہی نسخہ استعمال کر رہا ہے۔ میں اس کی عقل کی تعریف کرتا ہوں کہ حشیش کو جس طرح اس نے استعمال کیا ہے وہ آج تک اور کسی کے دماغ میں نہیں آیا..... میں مزمل آفندی کے دماغ پر جو حشیش کے اثرات ہیں وہ اتار دوں گا"۔

"کیا آپ اسے کوئی دوا پلائیں گے یا کوئی اور طریقہ اختیار کرنا ہے؟" ــــ نظام الملک نے پوچھا۔

"ہاں!" — طبیب ہم نے جواب دیا — "اسے دوائی پلائی جائے گی لیکن آپ نے بتایا ہے کہ وہ قید خانے کی کوٹھڑی میں بہت زیادہ اودھم برپا کر رہا ہے۔ آپ اسے دوائی کس طرح پلائیں گے؟ یہ کام آپ کو کرنا ہو گا"۔

"ہاں محترم طبیب!" — نظام الملک نے کہا — "میں نے ایک انتظام تو کیا ہے کہ اس شخص پر قابو پایا جا سکے..... ذرا ٹھہرئیے..... میں معلوم کرتا ہوں کہ وہ آدمی واپس آیا ہے یا نہیں"۔

نظام الملک نے دربان کو بلا کر پوچھا کہ وہ آدمی آیا ہے کہ نہیں۔ دربان کو معلوم تھا کہ کس شخص کے متعلق پوچھا جا رہا ہے۔ اُس نے بتایا کہ وہ ابھی ابھی آیا ہے۔ نظام الملک نے اسے کہا کہ اسے فوراً اندر بھیج دو۔ دربان کے جانے کے تھوڑی دیر بعد وہی آدمی جو قید خانے میں حسن بن صباح کا جاسوس بن کر مزمل آفندی کے پاس گیا اور اسے ٹھنڈا کر آیا تھا' اندر آیا۔

"کہو بھائی!" — نظام الملک نے اُس سے پوچھا — "کیا کر کے آئے ہو!"

"سب ٹھیک کر آیا ہوں" — اس شخص نے جواب دیا — "وہ بالکل ٹھنڈا ہو گیا ہے۔ میں نے اسے کہا ہے کہ آئندہ اس کے کھانے پینے کا انتظام میں کروں گا۔ اس نے بخوشی یہ صورت قبول کر لی ہے۔ اس نے مجھ پر مکمل اعتماد کیا ہے"۔

"آفرین!" — نظام الملک نے کہا پھر وہ طبیب سے مخاطب ہوا — "اب اُسے وہ دوائی آسانی سے پلائی جا سکے گی جو آپ اسے دینا چاہیں گے"۔

نظام الملک نے اس آدمی کو باہر بھیج دیا۔

"میں آپ کو خبردار کر دینا ضروری سمجھتا ہوں" — طبیب نے کہا — "دوائی تو میرے پاس تیار ہے۔ یہ میرا پہلا تجربہ ہو گا۔ اس دوائی کا اثر یہ ہو گا کہ مزمل بے ہوش ہو جائے گا یا یوں کہہ لیں کہ سو جائے گا۔ ایسا ہونا تو نہیں چاہئے لیکن میں ڈرتا ہوں کہ دوائی کی مقدار ایک آدھا قطرہ بھی زیادہ ہو گئی تو اس شخص کی موت واقع ہو سکتی ہے"۔

"نہیں میرے بزرگ!" — شمونہ نے تڑپ کر کہا اور طبیب کے دونوں گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر التجا کے لہجے میں بولی — "ایسا نہ کہیں۔ جان لینی ہے تو میری لے لیں۔ موت واقع ہو تو میری ہو۔ مجھے کوئی طریقہ بتائیں۔ اگر کہیں تو میں اس کی کال کوٹھڑی میں بند ہو جاتی ہوں۔ شب و روز اس کے ساتھ رہوں گی اور مجھے امید ہے کہ اسے

واپس اپنی اصلی ذہنی اور جذباتی حالت میں لے آؤں گی"۔

"شمونہ بیٹی!" — نظام الملک نے کہا — "ہم مزمل جیسے قیمتی آدمی کو زیادہ دیر تک ایسی حالت میں نہیں دیکھ سکتے۔ میں بھی تمہاری طرح مزمل کو زندہ رکھنا چاہتا ہوں"۔

"گھبراؤ نہیں لڑکی!" — طبیب نے اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر کہا — "میں نے یہ تو نہیں کہا کہ وہ ضرور ہی مر جائے گا' میں نے صرف اظہار کیا ہے ایک خطرے کا۔ ہمیں یہ خطرہ مول لینے دو۔ زیادہ تر کام تو تم نے کرنا ہے اور یہ میں تمہیں بتاؤں گا کہ تم نے کیا کرنا ہے"۔

"محترم طبیب!" — نظام الملک نے کہا — "آپ وہ دوائی دے دیں۔ صرف یہ خیال رکھیں کہ اس کی مقدار کم رکھیں۔ میں نہیں سمجھتا کہ جڑی بوٹیوں سے بنائی ہوئی دوائی کسی کی جان بھی لے سکتی ہے"۔

"میں آپ کو یہ بھی بتا دیتا ہوں کہ اس دوائی میں کیا کیا ڈالا گیا ہے؟" — طبیب نے کہا — "یہ نایاب جڑی بوٹیوں سے بنی ہے جو ہمارے علاقے میں شاید ہی کہیں نظر آئیں۔ اس میں صحرائی سانپ کے زہر کا کشتہ بھی شامل ہے۔ اس میں کچھوے کی چربی بھی ایک خاص عمل سے گزار کر شامل کی گئی ہے۔ یہ تو آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ صحرائی سانپ ملنا کتنا دشوار ہے۔ صحرا کہاں ہے' اور کون وہاں سانپ کے انتظار میں بیٹھا رہتا ہو گا۔ بہرحال میں نے یہ سانپ حاصل کیا اور اس کا زہر مار کر دوائی میں شامل کیا ہے"۔

طبیب نے شمونہ اور نظام الملک کو کچھ ہدایات دینی شروع کر دیں۔

○

سورج غروب ہو گیا۔ قید خانے کی راہداریوں کی مشعلیں جلا دی گئیں۔ کچھ دیر بعد قیدیوں میں کھانا تقسیم ہونے لگا۔

ایک سنتری نے مزمل آفندی کی کوٹھڑی کا دروازہ کھولا اور خود ایک طرف ہو گیا۔ کوٹھڑی میں وہ شخص داخل ہوا جو مزمل کو ٹھنڈا کر گیا تھا۔ اس نے کھانا اٹھا رکھا تھا۔ سالن اور روٹیوں کے علاوہ ایک پیالہ دودھ کا بھرا ہوا تھا۔ مزمل یہ کھانا دیکھ کر حیران رہ گیا۔

"تمہارے چہرے پر حیرت کیوں؟" — اس آدمی نے کہا — "میں نے تمہیں کہا

تھا کہ آئندہ تمہارے کھانے کا انتظام میں کیا کروں گا۔ تمہیں اب یہی کھانا ملا کرے گا میں نے تمہارے فرار کا انتظام کر لیا ہے۔ تمہیں دو تین دن انتظار کرنا پڑے گا۔ آرام سے کھانا کھاؤ اور یہ دودھ پی لو۔ میں جا رہا ہوں"۔

اس شخص نے یہ بات مزمل کے کان میں اتنی دھیمی آواز میں کہی تھی کہ سنتری کو سنائی نہیں دیتی تھی..... کوٹھڑی کا دروازہ پھر بند ہو کر مقفل ہو گیا۔ سنتری اس راہداری میں جس میں مزمل آفندی کی کوٹھڑی تھی' آہستہ آہستہ ٹہل رہا تھا۔ یہ اس کی اور اس جیسے سنتریوں کی ہر رات کی ڈیوٹی تھی لیکن یہ سنتری جب مزمل کی کوٹھڑی کے آگے سے گزرتا تھا تو اس کے قدم رک جاتے اور مزمل کو وہ سلاخوں میں سے غور سے جھانکتا تھا۔ مزمل کھانا کھا رہا تھا۔ سنتری دوسرے چکر پر آیا تو دیکھا کہ مزمل نے دودھ کا پیالہ منہ سے لگا رکھا تھا۔

سنتری آگے نکل گیا اور کہیں رک گیا تھا۔ کچھ وقت گزار کر وہ پھر راہداری میں آیا اور حسب معمول مزمل کی کوٹھڑی کے سامنے آ کر بہت آہستہ ہو گیا۔ اس نے دیکھا کہ پیالہ فرش پر پڑا تھا۔ مزمل نے سارا دودھ پی لیا تھا اور دیوار کے ساتھ پیٹھ لگائے بیٹھا تھا۔ اس کا سر ڈول رہا تھا اور آنکھیں بند ہو رہی تھیں۔ سنتری دو چار قدم آگے گیا اور رک گیا۔ وہ پھر واپس آیا تو دیکھا کہ مزمل فرش پر پیٹھ کے بل پڑا تھا اور اس کے خراٹے سنائی دے رہے تھے۔ سنتری دوڑ پڑا اور راہداری سے نکل گیا۔

تھوڑی ہی دیر بعد وہی شخص آیا جو مزمل کا دوست بن کر اسے کھانا اور دودھ دے گیا تھا۔ سنتری اس کے ساتھ تھا۔ اس کے اشارے پر سنتری نے دروازہ کھولا۔ وہ شخص اندر گیا اور مزمل کے پاس بیٹھ کر اسے دیکھنے لگا۔ اس نے مزمل کے سر پر ہاتھ رکھ کر ہلایا۔

مزمل بیدار نہ ہوا۔

دوسری بار اس آدمی نے مزمل کے سر کو ذرا زور سے ہلایا' پھر بھی مزمل کی آنکھ نہ کھلی۔ وہ آدمی اٹھا اور سنتری کو یہ کہہ کر تیزی سے نکل گیا کہ کوٹھڑی کو مقفل کر دو۔

وہ آدمی دوڑتا ہوا راہداری سے نکلا' دوڑتا ہوا ہی قید خانے سے نکلا' باہر اس کا گھوڑا کھڑا تھا' اس پر سوار ہو کر اس نے ایڑ لگا دی۔ قید خانہ شہر سے ذرا دور ویران اور بنجر سے علاقے میں تھا۔

اُس نے گھوڑا ملک شاہ کے دروازے پر جا روکا اور وہ کود کر گھوڑے سے اُترا۔ یہ دوڑتا ہوا اندر چلا گیا۔ دربان اور محافظ کھڑے تھے لیکن انہوں نے اُسے نہ روکا۔ وہ جانتے تھے کہ یہ شخص آئے تو اسے روکنا نہیں۔

وہ ایک کمرے میں چلا گیا جہاں طبیب نجم مدنی، نظام الملک اور شمونہ موجود تھے۔

"کیا خبر ہے؟" — نظام الملک نے پوچھا۔

"بڑی اچھی خبر ہے" — اس آدمی نے جواب دیا — "وہی اثر ہوا ہے جو محترم طبیب نے بتایا تھا۔ وہ اتنی گہری نیند سو گیا ہے کہ میں نے اسے زور زور سے ہلایا، اُس کے سر کو جھنجھوڑا لیکن اُس کے پپوٹوں میں ذرا سی بھی حرکت نہیں ہوئی"۔

"کیا وہ زندہ ہے؟" — شمونہ نے تڑپ کر پوچھا۔

"ہاں، وہ زندہ ہے" — اس آدمی نے جواب دیا — "کیا میں اتنا احمق نظر آتا ہوں کہ مجھے سوئے ہوئے اور مرے ہوئے آدمی میں فرق معلوم نہ ہو؟"

"نظام الملک!" — طبیب نجم نے کہا — "اسے یہاں لے آؤ"۔

○

کچھ دیر بعد مزمل آفندی کی کوٹھڑی کا دروازہ کھلا۔ ایک چارپائی کوٹھڑی میں داخل ہوئی جس کے ساتھ چار آدمی تھے۔ چارپائی فرش پر رکھ کر ان آدمیوں نے فرش پر پڑے ہوئے مزمل کو اٹھایا اور چارپائی پر ڈال دیا۔ اس میں بیداری کے کوئی آثار نہیں تھے۔

ان آدمیوں نے چارپائی اٹھائی اور کوٹھڑی سے نکل گئے پھر وہ قید خانے سے بھی نکل گئے۔

نظام الملک، طبیب اور شمونہ بیتابی سے انتظار کر [illegible] ان میں شمونہ بہت ہی بے چین اور بیتاب تھی۔ اس کے حسین چہرے پر گھبراہٹ اور دل میں دعائیں تھیں۔ وہ بار بار باہر دیکھتی تھی۔

آخر وہ لوگ مزمل کو اٹھائے ہوئے آ گئے اور چارپائی اسی کمرے میں لا رکھی۔ شمونہ نے لپک کر مزمل کی کلائی پکڑی اور اس کی نبض محسوس کی۔ اس کے چہرے پر سکون اور اطمینان کا تاثر آ گیا۔ مزمل آفندی زندہ تھا۔

مزمل کو اٹھا کر پلنگ پر ڈال دیا گیا اور وہ آدمی چارپائی اٹھا کر کمرے سے نکل گئے۔

"شمونہ!" — طبیب نے مزمل کی نبض پر انگلیاں رکھے ہوئے کہا — "خطرہ ٹل

گیا ہے۔ نبض بالکل ٹھیک چل رہی ہے۔ اگر دوائی کا اثر وہ ہوتا جو میں نے بتایا تھا کہ ہو سکتا ہے تو مزمل کی نبض اس وقت تک خاموش ہو چکی ہوتی..... ہم چلے جائیں گے۔ تم یہاں رہو گی اور اگر تمہیں ساری رات جاگنا پڑا تو جاگتی رہنا۔ میں نے تمہیں ساری بات بتا دی ہے اور اچھی طرح سمجھا دیا ہے کہ تم نے کیا کرنا ہے۔ دودھ رکھا ہے، یہ جاگ اٹھے تو پہلا کام یہ کرنا کہ اسے یہ دودھ پلا دینا اور جو کچھ تم نے کرنا ہے وہ میں تمہیں بتا چکا ہوں۔ یہ پھر سو جائے گا۔ اسے زبردستی بیدار کرنے کی کوشش نہ کرنا۔ تم خود بھی سو جانا۔ یہ بہت دیر بعد، کل دن کو کسی وقت جاگے گا۔ آج رات کے پچھلے پہر اسے کچھ بیدار ہونا چاہئے"۔

"اور شمونہ!" — نظام الملک نے کہا — "دروازے کے باہر چار آدمی ہر وقت موجود رہیں گے۔ کوئی مشکل پیش آ جائے یا مزمل بیدار ہو کر پھر ہنگامہ برپا کرنے یا بھاگنے کی کوشش کرے تو یہ آدمی اسے سنبھال لیں گے"۔

"اب یہ سوچ لو شمونہ!" — طبیب نجم نے کہا — "اب تم پر منحصر ہے کہ اسے سنبھال لیتی ہو یا مزید بگاڑ دیتی ہو۔ تم خود عقل والی ہو اور مردوں کو لگام ڈالنا جانتی ہو۔ یہ تو پہلے ہی تمہاری محبت میں گرفتار ہے"۔

شمونہ نے انہیں تسلی دی کہ وہ مزمل کو سنبھال لے گی۔ وہ دونوں کمرے سے نکل گئے اور شمونہ اُس پلنگ پر بیٹھ گئی جس پر مزمل پیٹھ کے بل پڑا دھیمے دھیمے خراٹے لے رہا تھا۔

○

یہ کمرہ خاص طور پر مزمل آفندی کے لئے تیار کیا گیا تھا۔ نظام الملک کے گھر کا کوئی کمرہ اسی طرح تیار کیا جا سکتا تھا لیکن طبیب نے وہ مناسب نہ سمجھا کیونکہ مزمل نظام الملک کی دشمنی لے کر آیا تھا۔ خطرہ تھا کہ بیداری کے بعد اسے پتہ چلتا کہ وہ نظام الملک کے گھر میں ہے تو وہ پھر بے قابو ہو سکتا تھا۔ نظام الملک نے سلطان ملک شاہ کو اس سارے واقعے سے باخبر رکھا ہوا تھا۔ طبیب نے سلطان سے کہا تھا کہ وہ اس کے محل کا ایک کمرہ استعمال کرنا چاہتا ہے۔ سلطان نے بخوشی اجازت دے دی تھی۔

اس کمرے کی زیب و زینت کا اہتمام طبیب نے اپنی پسند اور ضرورت کے مطابق کیا تھا۔ بستر نہایت نرم ملائم اور آرام دہ تھا۔ کمرے کے دروازوں اور کھڑکیوں پر خاص

رنگ کے پردے لٹکائے گئے تھے۔ قالین بیش قیمت اور دلفریب تھا۔ کمرے میں خاص قسم کے پھولوں والے پودے جو گملوں میں لگے ہوئے تھے' رکھوائے گئے تھے۔ طبیب نے ایک خاص قسم کا عطر تیار کر رکھا تھا جو اس نے تھوڑا تھوڑا بستر پر اور پردوں پر مل دیا تھا۔

شمونہ کے لئے طبیب نے کچھ سوچ کر انتخاب کیا تھا کہ یہ کون سا لباس پہنے۔ اُس نے شمونہ سے کہا تھا کہ وہ بالوں کو گوندھ کر یا باندھ کر نہ رکھے بلکہ بال کھلے چھوڑ دے۔ اُسے قمیض ایسی پہنائی گئی تھی کہ اُس کے کندھے اور بازو ننگے رکھے گئے تھے۔ طبیب نے اُسے بتا دیا تھا کہ وہ اپنے آپ کو کس طرح استعمال کرے گی۔ طبیب نے زور دے کر کہا تھا کہ اپنے جسم کو بچا کر رکھے اور اپنی روح کو پیار اور محبت کے ذریعے مزمل کی روح پر غالب کر دے۔ شمونہ نے طبیب سے کہا تھا کہ وہ اس کھیل کی مہارت اور تجربہ رکھتی ہے۔ مزمل کے معاملے میں سہولت یہ تھی کہ وہ ایک دوسرے کو دل کی گہرائیوں سے چاہتے تھے۔

شمونہ سوئے ہوئے مزمل کو دیکھتی رہی۔ وہ اس کے بیدار ہونے کا انتظار کر رہی تھی۔ کبھی وہ اٹھ کھڑی ہوتی اور کمرے میں ٹہلنے لگتی۔ کبھی وہ مزمل کے بالوں میں انگلیاں پھیرنے لگتی۔ اس کا انداز ایک ماں جیسا تھا جس کا پیارا بچہ سویا ہوا ہو۔

رات آدھی سے زیادہ گزر گئی تھی۔ شمونہ کو غنودگی آنے لگی تھی۔ وہ سو ہی جانے کو تھی کہ مزمل کے جسم کو حرکت ہوئی۔ شمونہ بیدار ہو گئی اور مزمل کے پلنگ پر جا بیٹھی۔ مزمل نے کروٹ بدلی۔ شمونہ کو معلوم تھا کہ اب اس نے کیا کرنا ہے۔

مزمل نے کروٹ اس طرح بدلی تھی کہ اُس کا منہ شمونہ کی طرف تھا۔ شمونہ اُس کے ساتھ لگ کر بیٹھی ہوئی تھی۔ مزمل کا ایک ہاتھ شمونہ کی گود میں آ گیا۔ شمونہ وہ ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر اسے آہستہ آہستہ مسلنے لگی۔ پھر اس نے مزمل کے بالوں میں انگلیاں پھیرنی شروع کر دیں۔

مزمل کی آنکھیں آہستہ آہستہ کھلنے لگیں۔

"مزمل!" — شمونہ نے اس پر جھک کر اپنے ہونٹ مزمل کے کان کے قریب کر کے کہا — "تم میرے پاس آ گئے ہو۔ اب کوئی ہمیں جدا نہیں کر سکتا"۔

مزمل کی آنکھیں پوری کی پوری کھل گئیں اور وہ پیٹھ کے بل ہو گیا۔ شمونہ اس پر

اس طرح جھک گئی کہ اس کے ریشم جیسے کھلے بال مزمل کے گالوں اور گردن پر رینگنے لگے۔

"میں کہاں ہوں؟" — مزمل نے خوابناک آواز میں پوچھا — "تم کون ہو؟"

"تم میرے پاس ہو" — شمونہ نے پیار بھری آواز میں کہا — "تم اُس پیار کی جنت میں آ گئے ہو جہاں کوئی کسی کا خون نہیں بہا سکتا۔ میں ہوں تمہاری روح"۔

"میں قید خانے میں ہوں؟" — مزمل نے یوں پوچھا جیسے نیند میں بول رہا ہو۔

"ہاں تم میرے دل کے قید خانے میں بند ہو" — شمونہ نے پہلے سے زیادہ پیاری آواز میں کہا — "تم میری محبت کی زنجیروں میں بندھے ہوئے ہو"۔

مزمل آفندی کی آنکھیں پوری طرح کھل گئیں۔ اُس کے اور مزمل آفندی کے چہرے کے درمیان فاصلہ نہ ہونے کے برابر تھا۔ اس کا ایک ہاتھ اپنے آپ ہی شمونہ کے بالوں میں الجھ گیا۔ شمونہ کے ہونٹوں پر تبسم تھا۔ اُس نے آنکھیں مزمل کی آنکھوں میں ڈال دیں۔ طبیب نے شمونہ کو جو ہدایات دی تھیں' ان کے مطابق اس نے مزمل کے ساتھ باتیں کیں۔ اس کا اثر یہ ہُوا کہ مزمل ایک جھٹکے سے اٹھ کر بیٹھ گیا۔ وہ کمرے کو دیکھنے لگا۔ اس کی نظریں سارے کمرے میں گھوم گئیں۔

"شمونہ!" — مزمل نے دھیمی سی اور حیرت زدہ سی آواز میں پوچھا — "تم کب آئیں؟..... تم جھوٹ تو نہیں بولو گی..... میں کہاں سویا تھا؟..... میں نے..... میں نے شمونہ!..... میں نے شاید خواب دیکھا ہے" — اس کے ماتھے پر شکنیں ظاہر ہوئیں جیسے وہ ذہن کے ویرانے میں کچھ ڈھونڈ رہا ہو لیکن اُسے کچھ یاد نہیں آ رہا تھا۔

شمونہ نہیں چاہتی تھی کہ مزمل ایک بار پھر سو جائے۔ وہ اسے بیدار رکھنا چاہتی تھی اور اُسے واپس اسی ذہنی کیفیت میں لانا چاہ رہی تھی جس کیفیت میں وہ حسن بن صباح کو قتل کرنے کے ارادے سے روانہ ہُوا تھا لیکن طبیب نجم مدنی نے اسے کہا تھا کہ یہ جاگ اٹھے تو اس کے ساتھ ایک دو باتیں کرنا اور یہ تمہیں پہچان لے کہ تم شمونہ ہو اور اس کے بعد اسے پھر دودھ کا پیالہ پلا دینا۔ شمونہ کو معلوم تھا کہ اس دودھ میں وہی دوائی شامل کی گئی ہے لیکن اس کی مقدار اب کم رکھی گئی ہے۔

"مزمل!" — شمونہ نے اس کے گالوں کو اپنے دونوں ہاتھوں میں لے کر کہا — "تم بڑے لمبے اور بڑے کٹھن سفر سے واپس آئے ہو۔ میں تمہیں دودھ پلاؤں گی پھر

جاتا۔ تھکن دور ہو جائے گی تا تو میں تمہارے پاس بیٹھوں گی اور ہم پھر وہی پیار کی باتیں کریں گے"۔

شمونہ اٹھی اور دودھ کا پیالہ اٹھا لائی۔ مزمل اسے حیرت زدہ نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ شمونہ نے پیالہ اپنے ہاتھوں میں ہی رکھا اور اس کے ہونٹوں سے لگا دیا۔ مزمل نے دو تین سانسوں میں دودھ پی لیا۔ دودھ میں اتنا شہد ملا دیا گیا تھا جس سے دوائی کا ذائقہ دب گیا تھا۔

مزمل پھر غنودگی میں چلا گیا۔ شمونہ کو طبیب نے بتایا تھا کہ یہ پھر غنودگی میں جائے گا تو اس کے ساتھ کیا باتیں کرنی ہیں اور اس وقت تک یہ باتیں کرنی ہیں جب تک یقین نہ ہو جائے کہ یہ سو گیا ہے۔

شمونہ نے اب جو پیار کی باتیں شروع کیں تو اس کے اپنے آنسو نکل آئے۔ پیار کی ان باتوں میں ایک انسان کی دوسرے انسان سے محبت کی بات نہیں تھی بلکہ بنی نوع انسان کی محبت ان باتوں میں رچی بسی ہوئی تھی۔ طبیب کا دراصل مطلب یہ تھا کہ غنودگی کے عالم میں مزمل کے ذہن سے تخریب کاری اور قتل کے خیالات نکال کر اس میں پیار و محبت اور روحانیت کا نور بھرا جائے۔ شمونہ نے ایسے پراثر طریقے سے یہ باتیں آہستہ آہستہ کیں کہ مزمل نے شمونہ کا ایک ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر ہونٹوں سے لگایا اور اس کے ساتھ ہی وہ گہری نیند سو گیا۔ شمونہ کو ایسی بری نیند آئی تھی کہ وہ بھی وہیں لڑھک گئی اور سو گئی۔

○

صبح طلوع ہوئی تو طبیب اور نظام الملک یہ دیکھنے آئے کہ رات کس طرح گزری ہے۔ نظام الملک نے دروازے پر دستک دی اور انتظار کرنے لگا۔ خاصی دیر گزر جانے کے بعد بھی اندر سے کوئی جواب نہ آیا نہ شمونہ باہر نکلی تو اس نے ایک بار پھر دستک دی۔ پھر بھی کوئی جواب نہ آیا تو نظام الملک نے دروازہ کھولا اور طبیب کو ساتھ لے کر وہ اندر چلا گیا۔ دیکھا کہ شمونہ اس طرح گہری نیند سوئی ہوئی تھی کہ اس کا سر مزمل کے سینے پر تھا اور اس کی ٹانگیں پلنگ سے نیچے لٹک رہی تھیں۔ مزمل ہلکے ہلکے خراٹے لے رہا تھا۔ طبیب نے وہ پیالہ دیکھا جس میں رات کو پلانے والا دودھ تھا۔ پیالہ خالی تھا۔

"آئیں نظام الملک!" ۔۔۔ طبیب نے کہا ۔۔۔ "شمونہ نے اسے رات کو دودھ پلا

دیا تھا۔ پیالہ خالی پڑا ہے۔ یہ دوپہر کے بعد جاگے گا۔ شمونہ شاید جلدی جاگ اٹھے۔ اس کی نیند جاتی رہی ہے کہ یہ رات بھر سو نہیں سکی"۔

دونوں کمرے سے نکل گئے۔

تین دن اور راتیں مسلسل مزمل کو یہ دوائی دودھ میں ملا کر پلائی جاتی رہی۔ ہر بار دوائی کی مقدار کم کرتے چلے گئے۔ وہ جب بیدار ہوتا تھا تو شمونہ اس کے ساتھ اس طرح کی باتیں کرتی تھی جس طرح اسے طبیب نجم مدنی نے بتائی تھیں۔ اس وقت مزمل کا ذہن نیم بیدار ہوتا تھا اور شمونہ جس پیارے انداز میں بات کرتی تھی وہ اس کے ذہن میں اترتی چلی جاتی تھی۔

یہ عمل طبیب کی نگرانی میں جاری رکھا گیا اور چوتھے دن اسے کوئی دوائی نہ دی گئی۔ جب وہ بیدار ہوا تو طبیب نے اس کے پاس بیٹھ کر اس کی کنپٹیاں اپنے دونوں انگوٹھوں سے آہستہ آہستہ ملنی شروع کر دیں اور اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کچھ باتیں کیں۔ یہ ایک قسم کا وہ عمل تھا جسے آج ہپناٹزم کہتے ہیں۔ یہ برین واشنگ جیسا ہی ایک عمل تھا جو سات آٹھ روز چلتا رہا اور کامیاب رہا۔ مزمل خاصی تیزی سے واپس اپنے آپ میں آ گیا۔ طبیب کو توقع نہیں تھی کہ وہ اتنی جلدی اصلی ذہنی کیفیت میں آ جائے گا۔ طبیب کی دوائی کا اپنا اثر تو تھا ہی خود طبیب نے کہا کہ اس دوائی کے اثر کو تیز اور کئی گنا زیادہ کرنے میں شمونہ کا ہاتھ تھا۔ ایک روز نظام الملک مزمل کے سامنے آیا۔ کوئی نہیں بتا سکتا تھا کہ مزمل کا ردعمل اور رویہ کیا ہو گا۔ طبیب نجم مدنی بھی وہاں موجود تھا اور شمونہ بھی تھی۔ کمرے کے دروازے کے ساتھ ہی باہر نظام الملک کے محافظ تیار کھڑے تھے۔

مزمل آفندی نے نظام الملک کو دیکھا اس کے چہرے پر حیرت کا تاثر تھا۔ نہایت آہستہ آہستہ اٹھا۔ نظام الملک بازو پھیلا کر اور ہونٹوں پر مسکراہٹ لئے ہوئے اس کی طرف تیزی سے بڑھا۔

مزمل نے بھی بازو پھیلا دیئے اور دوسرے لمحے وہ ایک دوسرے کے بازوؤں میں تھے۔

"کیوں مزمل!" ۔۔۔ نظام الملک نے اس کے چہرے کو اپنے ہاتھوں میں لے کر بڑے پیار سے پوچھا ۔۔۔ "کہاں چلے گئے تھے؟ ۔۔۔ میں تو سمجھا کہ تم اچھے ہی [illegible] ہو

"یہ تو میں بتا نہیں سکتا" ۔۔ مزمل نے کہا ۔۔ "آپ کو دیکھ کر کچھ یاد آتا ہے.... یہ بھی یاد آتا ہے کہ آپ نے مجھے جانے سے روکا تھا اور میں پھر بھی چلا گیا تھا"۔

"اور اب؟" ۔۔ نظام الملک نے بڑے پیارے لہجے میں پوچھا ۔۔ "اب تو نہیں جاؤ گے؟"

"نہیں!" ۔۔ مزمل نے مسکرا کر جواب دیا ۔۔ "نہیں جاؤں گا..... اب کہیں نہیں جاؤں گا"۔

دو تین دن اور گزرے تو مزمل کو سب کچھ یاد آنے لگا۔ اب ایسا کوئی خطرہ نہیں تھا کہ اس کی حالت پھر بگڑ جائے گی۔ اس پر ایک اور ہی قسم کی کیفیت طاری ہو گئی۔ یہ پچھتاوے، شرمندگی اور حسن بن صباح سے انتقام لینے والی کیفیت تھی۔ نظام الملک اور شمونہ نے اسے اپنے پاس بٹھایا اور ایک دو دن صَرف کر کے اسے اس کیفیت سے نکال لیا۔

"مزمل آفندی!" ۔۔ ایک روز نظام الملک نے اسے کہا ۔۔ "جو ہو گیا سو ہو گیا۔ اب مجھے یہ بتاؤ کہ وہاں تمہارے ساتھ کیا سلوک ہوا تھا۔ میں اس لئے پوچھ رہا ہوں کہ ہمیں معلوم ہونا چاہئے کہ یہ باطنی کس طرح تم جیسے جذبے والے آدمی پر بھی غالب آ جاتے ہیں اور اسے اپنا آلۂ کار بنا لیتے ہیں"۔

"میں بتا سکتا ہوں" ۔۔ مزمل آفندی نے کہا ۔۔ "مجھے وہاں گزارا ہوا ایک ایک لمحہ یاد آ گیا ہے..... میں خود چاہتا ہوں کہ آپ کو وہ ساری روداد سناؤں۔ آپ کسی اور خیال سے مجھ سے وہ باتیں سننا چاہتے ہیں لیکن میں اس خیال سے آپ کو سنانا چاہتا ہوں کہ آپ کو پتہ چلے کہ میں کتنا مجبور ہو گیا تھا۔ میرا دماغ میرے قابو سے نکل گیا تھا"۔

"وہ بھول جاؤ" ۔۔ نظام الملک نے کہا ۔۔ "تم نے کوئی گناہ نہیں کیا۔ مجھے بتاؤ کہ تمہارے ذہن پر قبضہ کس طرح کیا گیا تھا؟"

"انہوں نے مجھے کال کوٹھڑی میں بند کر دیا" ۔۔ مزمل آفندی نے کہا ۔۔ "اس کوٹھڑی میں ایسی بدبو تھی جیسے وہاں مردار یا انسانی لاشیں گل سڑ رہی ہوں۔ مجھے تین دن نہ کچھ کھانے کے لئے دیا گیا اور نہ پینے کے لئے پانی کا گھونٹ دیا گیا۔ ایک طرف میرا خون کھولتا تھا، الٹا تھا کہ میں دھوکے میں آ گیا ہوں۔ اگر میں حسن بن صباح کو قتل کر چکا ہوتا تو پھر وہ مجھے کیسی ہی اذیتیں کیوں نہ دیتے، میں برداشت کر لیتا اور اس موت کو خندہ

پیشانی سے قبول کر لیتا جو آہستہ آہستہ اور مجھے اذیتیں دے دے کر مارتی۔ دوسری طرف جسم جواب دے رہا تھا۔ میں سات آٹھ دن بھوکا رہ سکتا تھا لیکن پانی کے بغیر ایک دن بھی گزارنا محال تھا.....

"اس کمرے میں جو بدبو تھی وہ میں بیان ہی نہیں کر سکتا کہ یہ کیسی تھی۔ اس بدبو نے میرا دماغ ماؤف کر کے رکھ دیا۔ پھر میں خود اپنا خون پی رہا تھا کہ جس مقصد کے لئے آیا تھا وہ پورا نہیں ہوا تھا۔ ایک طرف بھوک اور پیاس اور دوسری طرف یہ جلنا اور کڑھنا۔ تیسرے چوتھے دن مجھے یوں محسوس ہونے لگا کہ میں بہت جلدی پاگل ہو جاؤں گا بلکہ پاگل پن شروع ہو چکا تھا۔ پھر ایک روز مجھے آدھی روٹی اس طرح دی گئی کہ دروازہ کھلا اور وہیں سے ایک آدمی نے میری طرف آدھی روٹی اس طرح پھینکی جیسے کتے کی طرف کوئی چیز پھینکی جاتی ہے۔ اس نے مٹی کا ایک غلیظ سا پیالہ دروازے کے قریب رکھ دیا اور چلا گیا۔ میں اپنی خودداری اور اپنے وقار کو بھول گیا تھا۔ میں کتوں کی طرح ہی روٹی کے آدھے ٹکڑے پر جھپٹ پڑا اور گھٹنوں اور ہاتھوں کے بل اس چھوٹے سے پیالے تک گیا جو وہ آدمی دروازے کے اندر رکھ گیا تھا۔ وہ تھوڑا سا سالن تھا۔ میں نے یہ تو دیکھا ہی نہیں کہ یہ کس چیز کا شوربہ تھا یا گدلا نمکین پانی تھا، میں لقمے اس میں ڈبو ڈبو کر حلق میں اتار گیا۔ آدھی روٹی ذرا سی دیر میں ختم ہو گئی اور اس سے میری بھوک اور تیز ہو گئی۔ میں اٹھا اور دروازے کی سلاخیں پکڑ کر چلانے لگا کہ مجھے اور روٹی دو، خدا کے لئے مجھے اور روٹی دو.....

"ایک سنتری آیا۔ میں دروازے کی سلاخیں پکڑے کھڑا تھا۔ اس نے سلاخوں کے درمیان سے میرے منہ پر اتنی زور سے گھونسہ مارا کہ میں پیچھے دیوار کے ساتھ جا لگا۔ سر کا پچھلا حصہ بڑی زور سے ٹکرایا تھا جس سے میری آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا۔ معلوم نہیں میں کتنی دیر غشی میں پڑا رہا.....

"جب میں ہوش میں آیا تو میں کوٹھڑی میں نہیں تھا۔ وہ ذرا بہتر اور صاف ستھرا کمرہ تھا۔ میں فرش پر لیٹا ہوا تھا۔ ایک آدمی ہاتھ میں برچھی لئے میرے پاس کھڑا تھا۔ اس نے جب دیکھا کہ میری آنکھیں کھل گئی ہیں تو اس آدمی نے میرے پہلو میں پاؤں سے ٹھوکر لگا کر کہا، ہوش آ گئی ہے؟ میں تو بول بھی نہیں سکتا تھا۔ میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔ وہ آدمی باہر نکل گیا پھر وہ فوراً ہی واپس آ گیا۔ اس کے ساتھ ایک اور آدمی تھا جس کی چال ڈھال،

ڈیل ڈول اور لباس ایسا تھا جس سے پتہ چلتا تھا کہ یہ شخص کوئی بڑا عہدیدار ہے"۔

مزمل آفندی نے آگے اپنی جو داستان سنائی وہ کچھ اس طرح تھی۔ یہ معزز آدمی اس کے پاس آ کر کھڑا ہو گیا۔

"مزمل آفندی!" — اس آدمی نے کہا — "تم یہاں کیوں آئے تھے؟"

"پانی!" — مزمل کے منہ سے جیسے سسکی نکلی ہو — "پانی..... پانی.....!"

"تم یہاں کیوں آئے تھے؟" — اس عہدیدار نے کہا — "میرے سوال کا جواب دو گے تو پانی مل جائے گا..... تم یہاں کیوں آئے تھے؟"

"قتل ہونے کے لئے!" — مزمل نے بڑی مشکل سے یہ الفاظ اپنے منہ سے باہر دھکیلے۔

"یہ میرے سوال کا جواب نہیں" — عہدیدار نے کہا۔

مزمل آفندی کا منہ پیاس کی شدت سے کھل گیا تھا۔ وہ تو اب سرگوشی بھی نہیں کر سکتا تھا۔ اس نے ہونٹوں پر ہاتھ رکھ کر اشارہ کیا جس کا مطلب یہ تھا کہ وہ بولنے کے قابل نہیں۔ اس کے ہونٹ ہلے۔ صاف پتہ چلتا تھا کہ اس نے دو مرتبہ پانی پانی کہا ہے۔

"نہیں!" — عہدیدار نے کہا — "پانی نہیں ملے گا"۔

مزمل کی آنکھیں بند ہونے لگیں اور وہ ایک طرف لڑھک گیا۔ پیاس کی شدت نے اس پر غشی طاری کر دی تھی۔

مزمل آفندی ہوش میں آیا تو اس نے محسوس کیا کہ وہ اب فرش پر نہیں ایک نرم سے بستر پر پڑا ہے۔ اس کے پاس ایک نوخیز دوشیزہ بیٹھی ہوئی تھی۔ مزمل نے آنکھیں کھولیں تو اسے سب سے پہلی جو چیز نظر آئی وہ اس لڑکی کی دلفریب مسکراہٹ تھی۔ مزمل نے الحکام الملک کو سنایا کہ وہ اسے خواب سمجھا۔

"اٹھو مزمل!" — لڑکی نے بڑے پیار سے کہا — "کھانا کھا لو"۔

"پانی!" — مزمل کے ہونٹوں سے سرگوشی پھسلی — "پانی!" — مزمل کا منہ کھلا رہا۔ اس کے حلق میں کانٹے چبھ رہے تھے اور اس کی زبان اکڑ گئی تھی۔

"خالی پیٹ پانی نہیں دوں گی" — لڑکی نے کہا — "پہلے کھانا کھا لو..... تھوڑا سا کھا لو پھر پانی پینا"۔

مزمل اتنا کمزور ہو چکا تھا کہ اس لڑکی نے اسے سہارا دے کر اٹھایا۔ مزمل نے دیکھا کہ یہ نہایت اچھا سجا سجایا کمرہ تھا۔ کمرے کے وسط میں ایک گول میز رکھی ہوئی تھی اور اس میز پر کھانا پڑا ہوا تھا۔ تب مزمل کو پکے ہوئے گوشت اور روٹیوں کی بو محسوس ہوئی۔ وہ فوراً" اٹھا اور میز کے قریب پڑے ہوئے سٹول پر بیٹھ گیا۔

وہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ سالن ایک قسم کا نہیں بلکہ تین چار قسم کے سالن تھے۔ یہ کسی شہزادے یا بہت بڑے حاکم کا کھانا تھا۔ مزمل آفندی ذرا جھینپ گیا۔ اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ یہ کھانا اس کے لئے رکھا گیا ہے لیکن وہ اس قدر بھوکا تھا کہ اس نے نتائج سے بے پرواہ کھانا شروع کر دیا۔ وہ شائستہ اور معزز خاندان کا تہذیب یافتہ بیٹا تھا لیکن بھوک نے اور پیاس نے اس کا دماغ ایسا ناکارہ کر دیا تھا کہ وہ جانوروں کی طرح کھانا کھا رہا تھا۔ اسے یہ بھی خیال نہیں رہا تھا کہ سالن میز پر گر رہا ہے۔ وہ دسترخوان کے آداب بھول چکا تھا۔

بڑی تیزی سے ایک دوسرے کے پیچھے چھ ایک نوالے حلق سے اتار کر وہ صراحی پر لپکا جو میز پر پڑی ہوئی تھی۔ لڑکی بڑی تیزی سے آگے آئی اور اس نے مزمل کے ہاتھ سے صراحی لے لی۔

"پانی میں پلاؤں گی" — لڑکی نے کہا — "بہت تھوڑا تھوڑا ایک ایک گھونٹ پلاؤں گی..... ایک ہی بار پانی نہیں پینا"۔

لڑکی نے ایک خوشنما پیالے میں تھوڑا سا پانی ڈال کر مزمل کو دیا۔ مزمل ایک ہی بار یہ پانی پی گیا اور پھر کھانے پر ٹوٹ پڑا۔ تھوڑا سا کھا کر وہ پھر صراحی پر جھپٹا لیکن لڑکی نے پہلے کی طرح اس کے ہاتھ سے صراحی لے لی اور اب ذرا زیادہ پانی پیالے میں ڈال دیا۔ مزمل نے وہ پانی بھی ایک ہی سانس میں پی ڈالا۔

دیکھتے ہی دیکھتے مزمل تمام روٹیاں اور اتنے زیادہ سالن صاف کر گیا۔ یوں پتہ چلتا تھا جیسے سالن والے برتن دھلے ہوئے ہیں۔ مزمل نے ان میں لقمے پھیر پھیر کر ان برتنوں کو صاف کر دیا تھا۔ اب کے اس نے لڑکی سے پانی مانگا۔

"اب پانی نہیں" — لڑکی نے بڑی دلفریب مسکراہٹ سے کہا — "اب شربت پلاؤں گی"۔

لڑکی نے ایک اور صراحی اٹھائی اور اس میں سے شربت گلاس میں انڈیل دیا جو

مزمل نے اٹھا کر ایک ہی بار خالی کر دیا۔

مزمل آفندی لڑکی سے پوچھنا چاہتا تھا کہ اسے اتنی غلیظ کوٹھڑی سے نکال کر یہاں کیوں لایا گیا ہے اور ایسا امیرانہ کھانا اسے کیوں دیا گیا ہے لیکن وہ کچھ بھی نہ پوچھ سکا کیونکہ اس پر غنودگی طاری ہو گئی تھی اور وہ بستر کی طرف دیکھنے لگا تھا۔ لڑکی نے اسے کہا کہ وہ سو جائے۔ وہ اٹھ کر بستر پر بیٹھا تو حیرت زدہ نظروں سے لڑکی کو دیکھنے لگا۔ اس کی آنکھوں میں ایک سوال تھا لیکن یہ سوال زبان پر آنے سے پہلے اس کی آنکھیں بند ہو گئیں اور لڑکی نے اسے سہارا دے کر پلنگ پر لٹا دیا۔

○

صبح جب مزمل اس کمرے سے نکلا تو اس نے یوں محسوس کیا جیسے یہ دنیا ہی بدل گئی ہو۔ اس کے سامنے ایک وسیع باغ تھا جس میں ایسے ایسے پھول تھے جو اس نے پہلے کبھی نہیں دیکھے تھے۔ گھاس بہت ہی سرسبز تھی اور یہ گھاس اوپر سے اس طرح تراشی ہوئی تھی جیسے زمین پر سبز رنگ کا قالین بچھا ہوا ہو۔ مزمل آگے بڑھا تو کمرے سے لڑکی نکل آئی۔ وہ بھی اس کے ساتھ چل پڑی۔

"کیا تم مجھے کچھ بتا سکتی ہو؟" — مزمل نے لڑکی سے پوچھا — "مجھے اس غلیظ کوٹھڑی میں سے نکال کر اس امیرانہ کمرے میں کیوں لایا گیا ہے اور ایسا مرغن اور پُرلطف اور لذیذ کھانا کیوں دیا گیا ہے؟"

"تمہیں امام کے حکم سے قید خانے سے نکالا گیا" — لڑکی نے جواب دیا — "اور یہ کھانا اسی کے حکم سے تمہیں کھلایا گیا ہے اور مجھے امام نے ہی تمہاری خدمت کے لئے بھیجا ہے"۔

"کون امام؟" — مزمل نے حیران سا ہو کے پوچھا۔

"امام حسن بن صباح!" — لڑکی نے جواب دیا۔ مزمل چلتے چلتے رک گیا اور اس نے حیرت زدگی کے عالم میں لڑکی کو دیکھا۔ لڑکی مسکرا رہی تھی۔

"کیا میں خواب تو نہیں دیکھ رہا؟" — مزمل نے کہا جیسے اپنے آپ سے بات کر رہا ہو۔

"میں سمجھتی ہوں تم کیا سوچ رہے ہو" — لڑکی نے کہا — "امام کو کل بتایا گیا ہے کہ تم اسے قتل کرنے کے لئے آئے تھے۔ اسے یہ بھی بتایا گیا کہ تمہیں قید خانے کی

انتہائی غلیظ کوٹھڑی میں بند کر دیا گیا ہے۔ امام نے تمہیں قید خانے میں ڈالنے والوں کو بلایا اور حکم دیا کہ انہیں بیس بیس کوڑے لگائے جائیں کیونکہ انہوں نے اس کے حکم کے بغیر ایک مہمان کو قید خانے میں ڈال دیا تھا۔ اس طرح تمہاری رہائی کا حکم دیا گیا اور تم یہاں پہنچ گئے..... کیا تم واقعی حسن بن صباح کو قتل کرنے آئے تھے؟"

"ہاں!" — مزمل نے یوں کہا جیسے اسے شرمندگی تھی کہ وہ حسن بن صباح کو قتل کرنے آیا ہے۔

"امام کسی وقت یہاں آئے گا" — لڑکی نے کہا — "یا وہ تمہیں اپنے پاس بلائے گا"۔

"کیا ایسا ہو سکتا ہے کہ وہ یہاں نہ آئے؟" — مزمل نے پوچھا — "اور کیا یہ ممکن ہے کہ وہ مجھے اپنے پاس نہ بلائے؟"

"تم یہ کیوں سوچ رہے ہو؟"

"میں نے اگر اسے کہہ دیا کہ میں اسے قتل کرنے آیا تھا تو وہ پھر مجھے قید خانے میں پھینک دے گا" — مزمل نے کہا — "میں اس کے آگے جھوٹ نہیں بول سکوں گا"۔

"تم نہیں جانتے مزمل!" — لڑکی نے کہا — "امام حسن بن صباح ایک برگزیدہ اور اللہ کی بڑی پیاری شخصیت ہے۔ وہ صرف سچ سنتا ہے اور سچ بولتا ہے..... تم صاف کہہ دینا کہ میں آپ کے دشمنوں سے متاثر ہو کر آپ کو قتل کرنے چلا آیا تھا"۔

لڑکی مزمل کے ساتھ باتیں کرتے ہوئے حسن بن صباح کی ایسی تصویر پیش کرتی رہی جو کسی فرشتے کی یا کسی پیغمبر کی ہی ہو سکتی تھی۔ باتیں کرتے کرتے وہ مزمل کو واپس کمرے میں لے آئی۔ مزمل نے کمرے میں پہنچتے ہی اسی شربت کی فرمائش کی جو لڑکی نے گزشتہ رات اسے پلایا تھا۔ صراحی کمرے میں ہی رکھی تھی۔ لڑکی نے اسے پیالہ بھر دیا جو مزمل نے پی لیا۔

مزمل کا جی چاہتا تھا کہ یہ لڑکی اس کے ساتھ باتیں کرتی رہے اور وہ خود بھی بولے اور بولتا ہی چلا جائے۔ اس غلیظ اور بدبودار کوٹھڑی کی قید نے بھوک اور پیاس نے اس کے دماغ پر ایسا اثر کیا تھا جیسے اس کی سوچنے کی صلاحیت سو گئی ہو یا آدمی سے زیادہ صلاحیت مر ہی گئی ہو۔ پھر اس کے دماغ پر یہ لڑکی اور اس کی باتیں غالب آ گئیں۔ بات یہ ہوئی کہ ایک تو یہ لڑکی نشہ بن کر اس پر طاری ہوئی اور دوسری یہ بات کہ اس لڑکی

نے اسے حشیش پلانی شروع کر دی تھی۔

O

مزمل کے ذہن پر اور ضمیر پر بھی اب کوئی بوجھ نہیں تھا۔ وہ ایسے احساس سے سرشار اور مخمور ہوا جا رہا تھا جیسے وہ ماضی میں سے ہو کر ہو اور یہ احساس بھی کہ وہ مکمل طور پر ہوش میں ہے۔

دروازے پر دستک ہوئی۔ مزمل نے چونک کر دروازے کی طرف دیکھا۔ لڑکی نے جا کر دروازہ کھولا۔

"امام تشریف لا رہے ہیں" ---- مزمل کو باہر سے آواز سنائی دی۔

لڑکی نے دروازے کے دونوں کواڑ کھول دیئے۔ حسن بن صباح کمرے میں داخل ہوا۔ مزمل اسے دیکھ کر اٹھا اور حیرت سے اسے دیکھتا ہی رہا۔

لڑکی دروازہ بند کر کے باہر ہی کھڑی ہو گئی۔ کمرے میں حسن بن صباح اور مزمل رہ گئے۔ حسن بن صباح کے چہرے پر سنجیدگی سی تھی۔ مزمل اسے خاموشی سے دیکھتا رہا اور حسن بن صباح آہستہ آہستہ کمرے میں ٹہلنے لگا۔ کمرے میں سناٹا طاری تھا۔ یہی وہ حسن بن صباح تھا جسے قتل کرنے کو مزمل اس قدر بے تاب تھا کہ منع کرنے کے باوجود وہ اسے قتل کرنے یہاں پہنچ گیا تھا لیکن اب اس کی حالت یہ تھی کہ اس کے دماغ میں یہ بھی سوچ نہیں آ رہی تھی کہ وہ حسن بن صباح کا سامنا کس طرح کرے اور کیا کہے۔ اس کا دل اس جذبے سے خالی ہو چکا تھا جو جذبہ اسے یہاں لایا تھا۔

دہکتے ہوئے انگارے برف کے ٹکڑے بن گئے تھے۔

"مزمل آفندی!" ---- حسن بن صباح نے مزمل کے سامنے کھڑے ہو کر کہا ---- "مجھے بہت ہی افسوس ہے کہ تم میرے قلعے میں مہمان بن کر آئے اور تمہیں ان بدبختوں نے قید خانے میں بند کر دیا..... تم مجھے قتل کرنے آئے ہو"۔

حسن بن صباح مزمل کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کر رہا تھا اور مزمل یوں محسوس کر رہا تھا جیسے یہ شخص اس کی روح میں اتر گیا ہو۔ اس کے منہ سے ایک لفظ بھی نہ نکلا۔ اس نے اتنا ہی محسوس کیا کہ وہ کچھ کہنا چاہتا ہے لیکن نہ دماغ اس کا ساتھ دے رہا ہے نہ زبان میں حرکت ہو رہی ہے۔

حسن بن صباح نے چغہ پہن رکھا تھا جو اس کے ٹخنوں تک لمبا تھا۔ اس نے چغے

کے اندر ہاتھ ڈالا اور جب ہاتھ باہر نکلا تو اس ہاتھ میں تلوار تھی۔ مزمل نے جب حسن بن صباح کے ہاتھ میں تلوار دیکھی تو اسے موت نظر آنے لگی۔ وہ خالی ہاتھ تھا۔

"یہ لو" ــــ حسن بن صباح نے تلوار اپنے دونوں ہاتھوں میں رکھ کر مزمل کو پیش کی اور بولا ــــ "تلوار لو اور مجھے قتل کرو"۔

مزمل تلوار کی طرف تو دیکھ ہی نہیں رہا تھا۔ اس کی نظریں حسن بن صباح کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔ حسن بن صباح نے تلوار کا دستہ اس کے ہاتھ میں دے دیا۔ مزمل نے تلوار اپنے ہاتھ میں لے لی۔ حسن بن صباح نے اس کی طرف پیٹھ کر لی۔

مزمل خاص طور پر محسوس کر رہا تھا کہ اس میں اتنی ہمت ہے ہی نہیں کہ وہ تلوار سے حسن بن صباح کی گردن اڑا دے۔ اسے تو جیسے یاد ہی نہیں رہا تھا کہ حسن بن صباح کو وہ اپنا نہیں بلکہ اسلام کا بدترین دشمن سمجھتا تھا۔

حسن بن صباح کچھ دیر مزمل کی طرف پیٹھ کر کے کھڑا رہا پھر وہ آہستہ آہستہ مڑا اور اس نے مزمل کا سامنا کیا۔

"اگر میں جھوٹا ہوتا تو اب تک میرا سر تمہارے ہاتھوں میرے جسم سے الگ ہو چکا ہوتا" ــــ حسن بن صباح نے کہا ــــ "تم ایسے لوگوں کی باتوں سے متاثر ہو کر یہاں آ گئے ہو جو میری صداقت سے واقف نہیں۔ سلطنت سلجوق کے سلطان نہیں چاہتے کہ کوئی ایسی طاقت ابھرے جو بنی نوع انسان کو ان سلطانوں اور بادشاہوں سے آزاد کرا دے۔ بادشاہی صرف اللہ کی ہے اور میں جو کچھ کر رہا ہوں وہ اللہ کے حکم سے کر رہا ہوں ..... تم تلوار چلاؤ۔ تلوار میرے جسم کے قریب آ کر رک جائے گی کیونکہ اللہ نے ابھی میرے خلاف فیصلہ نہیں دیا"۔

مزمل کی برین واشنگ پہلے ہی ہو چکی تھی۔ اگر کچھ کسر رہ گئی تھی تو وہ حسن بن صباح نے پوری کر دی۔ مزمل نے تلوار اپنے دونوں ہاتھوں پر اٹھائی اور حسن بن صباح کے آگے دو زانو ہو کر اس نے ہاتھ آگے کئے اور تلوار حسن بن صباح کو پیش کی۔ حسن بن صباح نے تلوار لے لی اور چغے کے اندر نیام میں ڈال لی۔

"مزمل آفندی!" ــــ حسن بن صباح نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر پیار سے کہا ــــ "تم میرے مہمان ہو..... میرے ساتھ آؤ"۔

○

مزمل آفندی حسن بن صباح کے ساتھ چلا گیا۔ حسن بن صباح نے غالباً" دیکھ لیا تھا کہ مزمل دلیر اور خطرے مول لینے والا جوان ہے اور یہ بڑا ہی آسان شکار ہے اس لئے حسن بن صباح نے اسے اپنے ساتھ رکھ لیا تھا۔

"محترم وزیر اعظم!" —— مزمل نے نظام الملک کو اپنی یہ پُراسرار داستان سناتے ہوئے کہا —— "حسن بن صباح مجھے جب اپنے ساتھ لے گیا تو میں ایک ایسی دنیا میں داخل ہو گیا جسے میں آج ایک بڑا ہی حسین اور طلسماتی خواب سمجھتا ہوں۔ اگر جنت کا وجود ہے تو میں نے وہ حسن بن صباح کی دنیا میں دیکھی ہے۔ آج جب میں اپنے ہوش و حواس میں آگیا ہوں' اس جنت کو خواب ہی سمجھتا ہوں۔ حسن بن صباح میرے ساتھ خاص طور پر شفقت کرتا تھا۔ میں اسے یوں مقدس اور متبرک شخصیت سمجھنے لگا تھا کہ آسمان پر خدا ہے تو زمین پر حسن بن صباح ہے۔ اس نے چند دنوں میں ہی مجھے اپنے راز دینے شروع کر دیئے تھے۔ اُس نے نہایت پُرکشش طریقے سے مجھے آپ کے خلاف کیا اور میرے دل میں آپ کی دشمنی بھر دی۔ میں تو بہت جلدی آپ کو قتل کرنے کے لئے تیار ہو گیا تھا۔ حسن بن صباح کو مجھ پر ایسا اعتبار آیا کہ اس نے اپنے کچھ راز بھی مجھے دے دیئے"۔

"اب دوسری باتوں کو چھوڑو" —— نظام الملک نے کہا —— "میں راز کی باتیں سننا چاہتا ہوں"۔

مزمل آفندی نے راز کی جو باتیں سنائیں وہ ابوالقاسم رفیق دلاوری نے متعدد مؤرخوں کے حوالوں سے آئمۂ تلبیس میں تفصیل سے بیان کی ہیں۔ وہ یوں ہیں کہ حسن بن صباح نے اپنے خاص مریدوں کو تین گروہوں میں تقسیم کر رکھا تھا۔ ایک گروہ دوسرے ملکوں میں تبلیغ کا کام کرتا تھا لیکن اس گروہ کے آدمی عام لوگوں کے ساتھ کوئی رابطہ نہیں رکھتے تھے بلکہ وہ حاکموں اور سرداروں کی سطح کے لوگوں سے ملتے اور انہیں اپنے نظریات بتاتے اور ایسے طریقے اختیار کرتے کہ یہ سرکردہ لوگ ان کے ہمنوا ہو جاتے تھے۔ دوسرے گروہ کے آدمیوں کو رفیق کہا جاتا تھا۔ یہ حسن بن صباح کا ذاتی حلقہ تھا اور تمام رفیق اس کے اس حلقے میں شامل تھے۔

تیسرا گروہ فدائیوں کا تھا۔ یہ جانباز لوگ تھے جن میں سے وہ کسی کو حکم دیتا کہ اپنے آپ کو قتل کر دو تو وہ شخص تلوار اپنے دل میں اتار لیتا تھا۔ مزمل نے بتایا کہ اس تیسرے

گروہ میں جو لوگ شامل تھے اور جنہیں شامل کیا جا رہا تھا وہ تھے تو انسان ہی لیکن ان کی فطرت میں خونخواری اور مردم کُشی بھر دی گئی تھی۔ انہیں بلّی کا گوشت کھلایا جاتا تھا۔ وہ اس لئے کہ بلّی جب حملہ کرتی ہے تو بڑی غضبناک ہو کر حملہ کرتی ہے اور اپنے شکار کو مار کر ہی دم لیتی ہے۔

فدائیوں کو تو بلّی کا گوشت کھلایا جاتا تھا لیکن رفیقوں کو یعنی دوسرے گروہ کے آدمیوں کو بادام' شہد اور کلونجی کھلائی جاتی تھی۔ یہ خوراک ان کے جسموں میں گرمی پیدا کرتی تھی اور جب یہ گرمی دماغ کو چڑھتی تھی تو انہیں جو بھی حکم دیا جاتا وہ اُسی وقت پورا کرتے تھے۔ رفیق آمنے سامنے کی لڑائی لڑتے تھے لیکن فدائی اپنے شکار کو دھوکے میں لا کر زمین دوز طریقوں سے ختم کرتے تھے۔ حسن بن صباح نے جتنی تاریخی شخصیتوں کو قتل کروایا ہے وہ ان ہی فدائیوں کے ہاتھوں کروایا ہے۔

داستان گو آگے چل کر حسن بن صباح کی جنت اور اس کی دنیا کے خفیہ گوشے تفصیل سے بیان کرے گا۔ یہاں بات صرف مزمل آفندی اور نظام الملک کی ہو گی۔ نظام الملک نے قلعہ المُوت پر حملے کا فیصلہ کر لیا تھا اور اس کی فوج کو ٹریننگ دی جا رہی تھی۔

"اب بتاؤ مزمل" —— نظام الملک نے پوچھا —— "کیا اب بھی تم چاہتے ہو کہ اکیلے جا کر حسن بن صباح کو قتل کر دو؟"

"نہیں وزیر اعظم!" —— مزمل نے جواب دیا —— "مجھے المُوت جانے سے روکنے والے سچ کہتے تھے کہ انسان حسن بن صباح کے ہاتھوں قتل ہو سکتا ہے اسے دھوکے میں لا کر قتل نہیں کیا جا سکتا۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ ہم حسن بن صباح کو زندہ رہنے کا حق دیئے رکھیں۔ اگر آپ میرے مشورے کو قبول کریں تو میں یہی کہوں گا کہ فوج کشی کے بغیر آپ باطنیوں کے پھیلتے ہوئے طوفان کو نہیں روک سکتے۔ میں کچھ دن اس دنیا میں گذار آیا ہوں۔ میں نے وہاں دیکھا ہے اور میں پورے وثوق سے کہتا ہوں کہ آپ نے حسن بن صباح کا راستہ نہ روکا تو وہ دن جلدی آ جائے گا جب سلطنتِ سلجوق پر بھی حسن بن صباح کی بادشاہی ہو گی"۔

○

نظام الملک نے اپنی فوج کو قلعہ المُوت پر حملے کے لئے تیار کر لیا تھا۔ اس نے بہتر یہ سمجھا کہ خونریزی نہ ہی ہو تو اچھا ہے۔ اس نے سلطان ملک شاہ سے کہا کہ وہ حسن بن

صباح کی طرف اپنا ایک ایلچی بھیجنا چاہتا ہے سلطان نے اسے اجازت دے دی اور اسی روز ایک ایلچی اس پیغام کے ساتھ المُوت بھیج دیا گیا کہ حسن بن صباح اپنی یہ سرگرمیاں جو اسلام کے سراسر خلاف ہیں ختم کر دے اور سلطان ملک شاہ کی اطاعت قبول کر لے۔

ایلچی چلا گیا اور المُوت پہنچ کر وہ حسن بن صباح سے ملا اور اسے سلطان ملک شاہ اور نظام الملک کا پیغام دیا۔

"اپنے سلطان کو اور نظام الملک کو میرا پیغام دینا" — حسن بن صباح نے کہا — "میں نے کبھی کسی کی اطاعت قبول نہیں کی۔ اے نظام الملک! ہم دونوں اکٹھے پڑھے ہیں اور ایک ہی استاد سے پڑھے ہیں۔ مجھے تم اُس زمانے سے جانتے ہو۔ میں تمہیں ایک مخلص دوست کی حیثیت سے مشورہ دیتا ہوں کہ المُوت کا کبھی رُخ نہ کرنا اور اے سلطنتِ سلجوق کے سلطان ملک شاہ! اپنی سلطنت کی حدود میں رہو، یہی تمہارے لئے بہتر ہے اور تمہارے لئے یہ بھی بہتر ہے کہ مجھے میری دنیا میں آزاد رہنے دو۔ اگر تمہیں میرا یہ مشورہ اچھا نہ لگے تو میں تمہیں خبردار کرتا ہوں کہ تمہارا اور تمہاری فوج کا انجام بہت بُرا ہو گا"۔

ایلچی وہاں سے رخصت ہونے لگا تو حسن بن صباح نے اسے روک لیا۔

"ٹھہر جاؤ" — حسن بن صباح نے اسے کہا — "تم شاید سمجھے نہیں کہ میں نے کیا کہا ہے، یا شاید تم یہ سمجھے ہو گے کہ میں نے ویسے ہی بڑ ماری ہے۔ میں تمہیں اپنے الفاظ کو عملی شکل میں دکھاتا ہوں"۔

حسن بن صباح کے حکم سے سو ڈیڑھ سو آدمی جو دراصل اس کے فدائین تھے وہاں ایک صف میں آ کر کھڑے ہو گئے۔

"میرے دوستو!" — حسن بن صباح ان سے مخاطب ہُوا — "میں تم سے کسی ایک کو اللہ کے پاس بھیجنا چاہتا ہوں۔ جو اللہ کے پاس جانا چاہتا ہے وہ آگے آ جائے"۔

تمام آدمی ایک ہی بار آگے آ گئے اور ہر ایک نے بلند آواز سے کہا کہ میں اللہ کے پاس جانا چاہتا ہوں۔ حسن بن صباح نے ایک آدمی کو اشارے سے اپنے پاس بلایا۔ وہ آدمی دوڑتا ہُوا اس کے پاس پہنچ گیا۔

"اپنے آپ کو قتل کر دو" — حسن بن صباح نے اسے کہا۔

جواں سال آدمی نے اپنے کمربند میں اُڑسا ہُوا خنجر نکالا، خنجر کی نیام الگ کر کے

پرے پھینکی اور خنجر پوری طاقت سے اپنے دل میں اتار دیا۔ وہ کچھ دیر کھڑا رہا پھر اس کے منہ سے بڑی زور کا نعرہ نکلا — "امام حسن بن صباح زندہ باد" — اور اس کے بعد وہ آدمی گر پڑا اور مر گیا۔

حسن بن صباح نے ایک اور ویسے ہی جواں سال آدمی کو بلایا۔ وہ سب آدمی جوان تھے یا نوجوان تھے۔ وہ آدمی دوڑتا ہُوا حسن بن صباح کے سامنے جا رکا۔

"دوڑ کر قلعے کی دیوار پر چڑھ جاؤ" — حسن بن صباح نے اسے کہا — "اور اپنے آپ کو سر کے بل نیچے گرا دو"۔

وہ نوجوان فوراً دوڑ پڑا اور تھوڑی دیر بعد وہ قلعے کی اتنی اونچی دیوار پر کھڑا نظر آیا۔ اس نے اپنے آپ کو اس طرح سر کے بل دیوار سے گرایا جس طرح تیراک بلندی سے پانی میں ڈائیو کیا کرتے ہیں۔

زیادہ تر مؤرخوں نے ان دو آدمیوں کا ہی ذکر کیا ہے، بعض مؤرخوں نے لکھا ہے کہ حسن بن صباح نے اپنے ایک اور فدائی کو بلایا اور اسے کہا کہ وہ ڈوب کر مر جائے۔ وہ فدائی اُسی وقت چلا گیا اور ڈوب کر مر گیا۔ اس تیسرے فدائی کی موت کے ساتھ یہ نہیں لکھا گیا کہ وہ دریا میں کودا تھا یا کوئی جھیل تھی یا کوئی گہرا حوض تھا، بہرحال یہ لکھا گیا ہے کہ وہ ڈوب کر مر گیا۔

"اپنے سلطان ملک شاہ کو یہ سب کچھ سنانا جو تم نے دیکھا ہے" — حسن بن صباح نے ایلچی سے کہا — "میں تمہیں یہ بھی بتا دیتا ہوں کہ میرے پاس اس قسم کے بیس ہزار فدائین ہیں۔ سلطان سے پوچھنا کہ تمہارے اتنے بڑے لشکر میں کوئی ایک بھی سپاہی ہے جو اس طرح تمہارے اشارے پر اپنی جان دے دے؟..... اور میرے دوست نظام الملک سے کہنا کہ میں آج بھی تمہارا احترام کرتا ہوں۔ لڑکپن کی دوستی کو قائم رکھو اور مجھ پر فوج کشی کا خیال دل سے نکال دو۔ اگر تمہیں میری بات سمجھ نہیں آئی تو بے شک آ جاؤ اور جتنا بڑا لشکر اکٹھا کر سکتے ہو، لے آؤ"۔

ایلچی کے چہرے پر حیرت زدگی بلکہ کسی حد تک خوف زدگی کے تاثرات صاف نظر آ رہے تھے۔ وہ چپ چاپ وہاں سے چل پڑا۔

○

ایلچی واپس مَرو پہنچا تو سلطان ملک شاہ اور نظام الملک نے بیتابی سے اس سے پوچھا

کہ حسن بن صباح نے کیا جواب دیا ہے۔ ایلچی نے جو سرفروشی اور جاں نثاری کے مظاہرے وہاں دیکھے تھے' وہ انہیں سنا دیئے اور حسن بن صباح نے جو جواب دیا تھا وہ بھی انہیں سنا دیا۔

سلطان ملک شاہ پر خاموشی طاری ہو گئی لیکن نظام الملک کو جیسے غصہ آگیا ہو۔ وہ اٹھ کر کمرے میں تیز تیز ٹہلنے لگا اور بار بار وہ اپنے ایک ہاتھ کا مُکا اپنے دوسرے ہاتھ پر مارتا تھا۔

"کیا سوچ رہے ہو خواجہ!" ___ سلطان ملک شاہ نے پوچھا۔ اس کا لب و لہجہ کچھ ٹھنڈا سا تھا۔

"میں اس کے سوا اور کچھ بھی نہیں سوچ سکتا کہ فوراً" کوُچ کیا جائے" ___ نظام الملک نے کہا ___ "کیا یہ ابلیس یہ سمجھتا ہے کہ ہم اس کی گیدڑ بھبکیوں سے ڈر جائیں گے؟..... سلطانِ محترم! میں کل صبح فجر کی نماز کے بعد کوُچ کر جاؤں گا۔ اُمید ہے آپ مجھے روکیں گے نہیں"۔

"ہاں خواجہ!" ___ سلطان ملک شاہ نے کہا ___ "تم کل صبح لشکر لے کر نکل جاؤ' میری دعائیں تمہارے ساتھ جائیں گی"۔

اگلی صبح فجر کی نماز سے فارغ ہو کر خواجہ حسن طوسی نظام الملک نے اپنے لشکر سے خطاب کیا۔ اس نے گزشتہ روز تمام لشکر کو تیاری کا حکم دے دیا تھا۔ صبح لشکر کوچ کے لئے تیار تھا۔ نظام الملک نے مختصر الفاظ میں اپنے لشکر سے کہا کہ وہ کسی کا ملک فتح کرنے نہیں جا رہے۔ اس نے حسن بن صباح اور باطنیوں کے متعلق کچھ باتیں کیں اور کہا کہ ہم سلطنتِ سلجوق کی توسیع کے لئے نہیں جا رہے بلکہ ایک ابلیسی قوت کو ہمیشہ کے لئے ختم کرنے جا رہے ہیں۔ اس نے یہ بھی کہا کہ اگر ہم نے وقت ضائع کیا یا وہاں جا کر ہم نے جانیں قربان کرنے سے منہ پھیر لیا تو سمجھ لو کہ تمہارا دینِ اسلام چند دنوں کا مہمان ہے۔ پھر یہاں نہ کوئی اللہ کا اور نہ اللہ کے رسول ؐ کا نام لینے والا زندہ رہے گا۔

لشکر روانہ ہو گیا۔ عورتوں نے اپنے گھروں کی چھتوں پر کھڑے ہو کر لشکر کو اپنی دعاؤں کے ساتھ رخصت کیا۔ کچھ لوگ لشکر کے ساتھ دور تک گئے اور لشکر کو خدا حافظ کہہ کر واپس آ گئے۔

لشکر ابھی آدھے راستے میں ہی تھا کہ حسن بن صباح کو جاسوسوں نے اطلاع دی کہ

سلجوقیوں کا لشکر آ رہا ہے۔ انہوں نے لشکر کی صحیح تعداد بھی بتا دی۔ حسن بن صباح کے جاسوس ہر جگہ موجود تھے۔ مؤرخ لکھتے ہیں کہ کوئی بات ابھی سلطان تک نہیں پہنچتی تھی لیکن حسن بن صباح تک پہلے پہنچ جاتی تھی۔

مسلمان مؤرخوں کے علاوہ دو یورپی مؤرخوں نے بھی لکھا ہے کہ جب حسن بن صباح کو اطلاع ملی کہ نظام الملک لشکر لا رہا ہے تو حسن بن صباح کا ردِ عمل صرف اتنا سا تھا کہ اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آگئی۔ اس نے ایسا نہیں کیا کہ اٹھ کر دوڑ پڑتا اور اپنے لشکر کو تیاری کا حکم دیتا یا لشکر کو اکٹھا کر کے کوئی اشتعال انگیز تقریر کرتا' وہ اطمینان اور آرام سے بیٹھا رہا۔ اس کے پاس تین چار خاص معتمد اور مشیر بیٹھے ہوئے تھے۔

"تم نے سن لیا ہے" ___ حسن بن صباح نے انہیں کہا ___ "نظام الملک کو راستے میں ہی قتل کر دو"۔

بس اتنی سی بات تھی جو حسن بن صباح کے منہ سے نکلی۔ اس کے پاس بیٹھے ہوئے آدمیوں میں سے ایک اٹھا اور باہر نکل گیا۔

یہاں تاریخ نویسوں میں تھوڑا سا اختلاف پایا جاتا ہے جو کوئی اتنا اہم نہیں لیکن اس کا ذکر ضروری ہے۔ کچھ نے لکھا ہے کہ نظام الملک کو سلطان ملک شاہ نے مَرو سے ہی رخصت کر دیا تھا لیکن زیادہ تعداد تاریخ نویسوں کی ایسی ہے جنہوں نے لکھا ہے کہ سلطان ملک شاہ بغداد جا رہا تھا۔ وہ لشکر کے ساتھ چل پڑا اس کا ارادہ یہ تھا کہ راستے سے بغداد کی طرف چلا جائے گا۔ چونکہ مؤرخوں کی زیادہ تعداد نے یہی لکھا ہے کہ سلطان ملک شاہ لشکر کے ساتھ گیا تھا اور اس سے آگے کے جو حالات تاریخ میں نظر آتے ہیں' وہ بھی گواہی دیتے ہیں کہ سلطان ملک شاہ ساتھ گیا تھا اس لئے داستان گو یہی صحیح سمجھتا ہے۔

راستے میں جا کر سلطان ملک شاہ نے خواہش ظاہر کی کہ نہاوند کے مقام پر پڑاؤ کیا جائے۔ نہاوند بڑا مشہور قصبہ تھا جس کی جغرافیائی اور تاریخی اہمیت تھی۔ بیسویں ہجری میں یہ مقام حضرت عمرؓ کے دورِ خلافت میں فتح ہُوا تھا۔ اس لڑائی میں صحابہ کرام کی اچھی خاصی تعداد شہید ہوئی تھی۔

وہ رمضان المبارک کا مہینہ تھا۔ ان لوگوں نے نہاوند پہنچ کر روزہ افطار کیا۔ رات تراویح کی نماز سب نے پڑھی۔ نمازِ تراویح کے بعد نظام الملک اپنی قیام گاہ کی طرف چل

پڑا۔ تاریخ کے مطابق لشکر نے تو اپنے لئے خیمے گاڑ لئے تھے لیکن سلطان ملک شاہ اور نظام الملک کی رہائش کا انتظام قصبے میں ایک بڑے اچھے مکان میں کیا گیا تھا۔ اُس وقت سلطان ملک شاہ نظام الملک کے ساتھ نہیں تھا۔

نظام الملک جب اپنی قیام گاہ کے قریب پہنچا تو وہاں بہت سے لوگ اکٹھے دیکھے جو نظام الملک کو دیکھنے یا اسے ملنے آئے تھے۔ نظام الملک ان کے درمیان جا پہنچا اور جو کوئی بھی آگے آیا اس کے ساتھ اس نے ہاتھ ملایا۔

"کیا سلجوقیوں کا وزیرِ اعظم ایک مظلوم کی فریاد سنے گا؟" ـــــ ایک آواز سنائی دی ـــــ "میں درخواست لکھ کر لایا ہوں"۔

نظام الملک عدل و انصاف کا پابند تھا اور ہر کسی سے انصاف کرنا وہ اپنا دینی فریضہ سمجھتا تھا۔ اس نے جب یہ فریاد سنی تو بلند آواز سے کہا کہ یہ شخص آگے آکر اپنی عرضی مجھے دے۔

ایک جواں سال آدمی آگے آیا اور اس نے احتجاج یا غصے کا مظاہرہ اس طرح کیا کہ اس کے ہاتھ میں جو کاغذ تھا وہ نظام الملک کے ہاتھ میں دینے کی بجائے اس کے قدموں میں پھینک دیا اور غصے سے بولا' یہ لو میری فریاد اور مجھے انصاف دو۔

نظام الملک کاغذ اٹھانے کے لئے جھکا۔ کاغذ پھینکنے والے شخص نے بڑی تیزی سے اپنے کپڑوں کے اندر سے خنجر نکالا اور جھکے ہوئے نظام الملک کی پیٹھ میں اس قدر زور سے مارا کہ خنجر دل کو چیرتا ہُوا دوسری طرف نکل گیا۔

لوگوں نے قاتل کو وہیں پکڑ لیا۔ نظام الملک پیٹھ میں خنجر لئے ہوئے سیدھا ہُوا۔ اس کے آخری الفاظ یہ تھے ـــــ "اسے میرے قصاص میں قتل نہ کرنا" ـــــ لیکن لوگوں نے اس کی نہ سنی۔ کچھ نے نظام الملک کو اٹھالیا اور زیادہ تر نے قاتل کے جسم کو قیمہ بنا ڈالا۔

اس قاتل کا نام ابو طاہر تھا وہ حسن بن صباح کے فدائین میں سے تھا۔

نظام الملک کو 1092ء میں قتل کیا گیا تھا۔

سلطان ملک شاہ کو اطلاع ملی تو وہ دوڑا آیا۔ نظام الملک فوت ہو چکا تھا اور قاتل کی لاش اس حالت میں باہر پڑی تھی کہ لوگوں نے اس کے اعضاء بھی کاٹ کر اِدھر اُدھر پھینک دیے تھے۔ سلطان نے المُوت پر فوج کشی کا ارادہ ترک کر دیا اور وہیں سے واپس آگیا۔

خواجہ حسن طُوسی نظام الملک کوئی معمولی آدمی نہیں تھا۔ وہ درباری قسم کا یا رسمی سا وزیرِ اعظم بھی نہیں تھا۔ اس نے اپنی زندگی میں ہی ایک مدرسہ کھولا تھا جو آج بھی بغداد میں موجود ہے۔ نظام الملک نے اس مدرسے کا نام مدرسۂ نظامیہ رکھا تھا۔ اس مدرسے نے بڑی نامور اور تاریخی شخصیتیں پیدا کی ہیں۔ امام غزالیؒ اسی مدرسے سے پڑھے تھے۔ سلطان صلاح الدّین ایّوبی نے اسی مدرسے سے تعلیم حاصل کی تھی اور بہاؤالدین شدّاد جو ایک مشہور سکالر اور عالم تھا' سلطان صلاح الدّین ایوبی کے ساتھ اس مدرسے میں پڑھا تھا۔ بہاؤالدین شدّاد تمام صلیبی جنگوں میں صلاح الدّین ایّوبی کے ساتھ پرسنل سیکرٹری کی حیثیت سے' ایلچی اور مشیر کی حیثیت سے رہا تھا۔ سلطان ایّوبی کی وفات کے بعد بہاؤالدین شدّاد نے اس کی زندگی پر ایک کتاب لکھی تھی جس کا حال ہی میں انگریزی میں ترجمہ ہُوا ہے۔

سلطان ملک شاہ کی فوج جب واپس آتے ہوئے مَرْو سے کچھ دور تھی تو لوگ گھروں سے نکل آئے اور جو کوئی جس کام میں مصروف تھا وہ چھوڑ کر اُس راستے پر آکھڑا ہُوا جس پر فوج آرہی تھی۔ عورتیں چھتوں پر چڑھ گئیں۔ لوگوں میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ وہ سمجھے فوج جو اتنی جلدی واپس آرہی ہے' وہ یقیناً "فتح یاب واپس آرہی ہے۔

لوگ دوڑ کر آگے چلے گئے تاکہ اپنی فاتح فوج کا استقبال جوش و خروش اور فتح کے نعروں سے کریں۔ انہوں نے دیکھا کہ فوج کے آگے آگے مجاہدین نے کسی کی لاش اٹھا رکھی تھی۔ پوچھا تو جواب ملا کہ وزیرِ اعظم نظام الملک قتل ہو گئے ہیں۔ یہ بھی لوگوں کو بتا دیا گیا کہ قاتل باطنیوں کا فدائی تھا۔ لوگ واپس شہر کی طرف دوڑے اور نظام الملک کے

قتل کی خبر سارے شہر میں پھیلادی۔

پورا شہر ماتم کدہ بن گیا۔ نظام الملک لوگوں کے دلوں پر حکومت کرتا تھا۔ وہ ہر کس و ناکس کا ہمدرد تھا۔ شہر میں کہرام بپا ہوگیا۔ عورتیں باہر آکر بین کرنے لگیں۔

لوگوں نے حسن بن صباح اور باطنیوں کے خلاف اشتعال انگیز نعرے لگانے شروع کردیے۔

"ایک بھی باطنی کو زندہ نہیں چھوڑیں گے"۔

"حسن بن صباح کو یہاں لاکر درخت کے ساتھ لٹکا کر پھانسی دیں گے"۔

"انتقام..... خون کا بدلہ خون..... انتقام!"

"فوج کو پھر واپس لے جاؤ"۔

اور ایسی بے شمار آوازیں تھیں جو بگولے بن کر اٹھ رہی تھیں۔ مائیں بین کرتے ہوئے کہہ رہی تھیں کہ ہم اپنے جوان بیٹے قربان کردیں گی۔ لڑکے اور نوجوان بے قابو ہوئے جارہے تھے۔ وہ کہتے تھے کہ وہ الگ لشکر بنا کر الموت پر حملہ کریں گے۔

نظام الملک کی میّت اس کے گھر لائی گئی جہاں میت کو غسل دے کر اسے کفن پہنا دیا گیا پھر میّت کو ایک خوشنما پلنگ پر رکھ کر سر سبز لان میں رکھ دیا گیا۔ شہر کے تمام لوگ ایک قطار میں میّت کے قریب سے گزرنے اور اپنے محبوب وزیر اعظم کا آخری دیدار کرنے لگے۔ وہاں صرف یہ نہیں تھا کہ تمام آنکھیں اشکبار تھیں بلکہ لوگ دھاڑیں مار مار کر رو رہے تھے۔ بعض جوشیلے آدمی میّت کے قریب کھڑے ہو کر انتقام اور خون کا بدلہ خون کے نعرے لگا کر آگے جاتے تھے۔ لوگ اس قدر مشتعل تھے کہ ماتم ایک بے قابو ہنگامے کی صورت اختیار کرتا جارہا تھا۔ کئی عورتیں سینہ کوبی کررہی تھیں۔

سلطان ملک شاہ کی جذباتی حالت عام شہریوں جیسی ہی تھی۔ وہ تو ہچکیاں لے لے کر رو رہا تھا۔ نظام الملک اس کا دستِ راست تھا۔ اُس کی تو جیسے کمر ہی ٹوٹ گئی تھی۔ نظام الملک صرف انتظامی امور کا ہی ماہر نہ تھا بلکہ جنگی امور اور سپہ سالاری میں بھی مہارت رکھتا تھا۔ سلطان ملک شاہ نے دیکھا کہ لوگ انتقام کی آگ میں جلنے لگے ہیں اور ان پر قابو پانا ضروری ہے تو وہ نظام الملک کے گھر کے اندر چلا گیا۔ وہ بالائی منزل کی ایک کھڑکی میں جا کھڑا ہوا جو باہر کی طرف کھلتی تھی۔

"مرو کے لوگو!" ___ سلطان ملک شاہ نے بلند آواز سے کہا ___ "تھوڑی سے دیر

کے لئے خاموش ہو جاؤ"۔

کئی آوازیں سنائی دیں ___ "خاموش..... خاموش..... سلطان کی بات سنو..... خاموش"۔

"اپنے جذبات پر قابو پاؤ" ___ سلطان ملک شاہ نے کہا ___ "مت سوچو کہ میں نظام الملک کے خون کو بھول جاؤں گا۔ باطنیوں نے نظام الملک کی پیٹھ میں خنجر نہیں مارا بلکہ انہوں نے سلطنتِ سلجوقیہ کے دل میں خنجر اتار دیا ہے لیکن یہ سلطنت خداداد اس طرح نہیں گرے گی جس طرح حسن بن صباح اور اس کے باطنی سمجھتے ہیں۔ میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ نظام الملک کے خون کے ایک ایک قطرے کے بدلے بیس بیس باطنیوں کا خون بہایا جائے گا۔ یہ باطنی اسلام کا چہرہ مسخ کررہے ہیں۔ ہم نے لشکر کشی سے کوئی ملک فتح نہیں کرنا۔ ہم نے اس باطل کو خاک و خون میں گم کردینا ہے۔ میں اپنی فوج کو نہاوند سے ہی اس لئے واپس لے آیا ہوں کہ تمام فوج پر رنج و غم کے بادل چھا گئے تھے اور ہر مجاہد پر ماتم اور انتقام کی کیفیت طاری ہوگئی تھی۔ اس جذباتی کیفیت میں لڑائیاں لڑی تو جا سکتی ہیں لیکن جیتی نہیں جاسکتیں۔ میں اپنے لشکر کی نفری میں اضافہ کروں گا اور ہم الموت پر ایسا حملہ کریں گے کہ باطنیوں کا نام و نشان بھی باقی نہیں رہے گا اور الموت کو ہم کھنڈر بنا کر واپس آئیں گے"۔

"ہم سب اس لشکر میں شامل ہوں گے" ___ پہلے ایک آواز آئی اور پھر بہت سی آوازیں گونجنے اور گرجنے لگیں ___ "لشکر فوراً بناؤ۔ ہم سب تیار ہیں۔ ہم کسی باطنی کو زندہ نہیں چھوڑیں گے"۔

عورتوں کا جوش و خروش الگ تھا۔ عورتوں کی طرف سے بار بار یہی للکار سنائی دے رہی تھی ___ "ہمارے بیٹوں کو لے جاؤ۔ انہیں اسلام کے نام پر قربان کردو۔ نظام الملک کے خون کا انتقام لو"۔

○

اُدھر الموت میں حسن بن صباح کو خبر مل چکی تھی کہ نظام الملک کو نہاوند میں ابو طاہر نام کے ایک فدائی نے قتل کردیا ہے۔ حسن بن صباح نے یہ خبر ملتے ہی اپنے خصوصی نائبین کو بلا کر اپنے پاس بٹھا لیا تھا۔

"ابو طاہر نے ایک آدمی کو ہی قتل نہیں کیا" ___ حسن بن صباح کہہ رہا تھا ___

"اس نے ایک فوج کو قتل کر دیا ہے..... کہاں ہے سلجوقیوں کی وہ فوج جو الموّت کو محاصرے میں لینے آ رہی تھی؟.....وہ فوج واپس چلی گئی ہے۔ میں نے تمہیں کچھ عرصہ پہلے یہ بات کہی تھی کہ فوج کا آمنے سامنے آکر لڑنا نقصان دہ ہوتا ہے۔ اس کا بہترین علاج یہ ہے کہ حملہ آور فوج کو مارنے کی بجائے اُس حاکم کو مار ڈالو جس کے حکم سے فوج لڑتی ہے۔ اب تم نے عملی طور پر اس اصول کا مظاہرہ اور نتیجہ دیکھ لیا ہے۔ تم کسی دشمن بادشاہ کے لشکر کو کیوں مارنے یا شکست دینے کی کوشش کرتے ہو؟..... خود اس بادشاہ کو ہی مار ڈالو' اس کا لشکر خود ہی بھاگ جائے گا..... کیا مَرو تک ہمارا کوئی آدمی پہنچا ہے یا نہیں؟"

"ہاں امام!" — ایک آدمی نے جواب دیا — "وہ تو اُسی وقت بھیج دیا گیا تھا جس وقت یہ اطلاع پہنچی تھی کہ نظام الملک کو ہمارے ایک فدائی نے قتل کر دیا ہے"۔

"مجھے بہت جلدی معلوم ہو جانا چاہئے کہ مَرو کے لوگوں کا کیا ردِ عمل ہے" — حسن بن صباح نے کہا — "سب سے زیادہ ضروری بات تو یہ معلوم کرنی ہے کہ سلطان ملک شاہ اب کیا جوابی کارروائی کرے گا۔ وہ دبک کر تو نہیں بیٹھ جائے گا' اس نے انتقامی کارروائی ہر حال میں کرنی ہے لیکن میں وہاں کے لوگوں کے تاثرات معلوم کرنا چاہتا ہوں"۔

"ہاں امام!" — وہی آدمی بولا — "ہم نے یہ بندوبست بھی کر لیا ہے"۔

"مجھے ایک ایک لمحے کی اطلاع ملنی چاہئے کہ مَرو میں کیا ہو رہا ہے" — "حسن بن صباح نے کہا — "اگر سلطان ملک شاہ الموّت پر حملے کی تیاری کر رہا ہو تو ہم اسے بھی نظام الملک کی طرح خدا کے پاس بھیج دیں گے"۔

سلطان ملک شاہ کے تین بیٹے تھے۔ بڑے کا نام برکیارق تھا اس سے چھوٹا محمد تھا اور اس کے بعد سنجر تھا۔ چھوٹے دونوں بھائی نوجوان تھے اور برکیارق اچھا خاصا بارعب جوان بن چکا تھا اور وہ عقلی طور پر اتنا بالغ ہو گیا تھا کہ باپ کو بڑے کار آمد مشورے دینے لگا تھا۔ ان کا ردِ عمل تو بہت ہی شدید تھا۔ مزمل آفندی بھی مَرو میں ہی رہتا تھا۔ اس کی سلطان ملک شاہ کے تینوں بیٹوں کے ساتھ گہری دوستی تھی۔ مزمل آفندی پر تو دیوانگی طاری ہو چکی تھی۔ وہ حسن بن صباح کو قتل کرنے گیا تھا لیکن وہاں اس کی ایسی برین واشنگ ہوئی کہ وہ نظام الملک کو قتل کرنے کے ارادے سے واپس آگیا تھا۔ یہ تو شاہی

طبیب شمونہ کا کمال تھا کہ ان دونوں نے مزمل آفندی پر قابو پالیا اور اسے بیدار کر لیا تھا۔ اس کے سینے میں تو حسن بن صباح کی نفرت ایسی شدید صورت اختیار کر گئی تھی جیسے اس کے وجود میں آگ لگی ہوئی ہو۔ اس کے ذہن میں ایک ہی سوچ تڑپتی رہتی تھی کہ وہ حسن بن صباح کو قتل کرے گا لیکن ہُوا یہ کہ اس کا پیرو مرشد نظام الملک حسن بن صباح کے ایک فدائی کے ہاتھوں قتل ہو گیا۔

نظام الملک کو دفن ہوئے بہت دن گذر گئے تھے۔ سلطان ملک شاہ نے حکم دے دیا تھا کہ لشکر کی نفری بڑھائی جائے اور لشکر کو تیار کیا جائے۔ شہر کے جوان دھڑا دھڑ لشکر میں شامل ہو رہے تھے اور ان کی ٹریننگ شروع کر دی گئی تھی۔ ان ہی دنوں مزمل آفندی سلطان ملک شاہ کے تینوں بیٹوں کے پاس گیا۔ ملک شاہ کے بیٹوں پر بھی جوش و خروش اور انتقام کا جذبہ غالب تھا۔

"میرے دوستو!" — مزمل آفندی نے کہا — "بہت بڑا لشکر تیار ہو رہا ہے۔ میں تمہیں آج ہی بتا دیتا ہوں کہ بڑے سے بڑا لشکر بھی الموُت جا کر ناکام ہو جائے گا۔ اس کی کئی ایک وجوہات ہیں۔ ایک تو الموُت کا قلعہ ایسا ہے کہ اسے محاصرے میں لیا ہی نہیں جا سکتا۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ حسن بن صباح کے پاس جو جانباز ہیں ان جیسے جانباز ہمارے لشکر میں نہیں۔ حسن بن صباح کوئی ایسی چال چلے گا جس سے ہمارا لشکر بیکار ہو کر رہ جائے گا"۔

"پھر کیا کرنا چاہئے؟" — سلطان ملک شاہ کے بڑے بیٹے برکیارق نے پوچھا — "یہ تو ہو نہیں سکتا کہ ہم خاموش ہو کر بیٹھ جائیں"۔

"یہی بات تو میں تم تینوں سے کرنے آیا ہوں" — مزمل آفندی نے کہا — "باطنیوں کو شکست دینے کا صرف ایک طریقہ ہے اور وہ یہ ہے کہ حسن بن صباح اور اس کے پیرو مرشد احمد بن غطاش کو قتل کر دیا جائے لیکن کام یہ بھی آسان نہیں۔ تم تینوں اچھی طرح جانتے ہو کہ میں حسن بن صباح کو قتل کرنے گیا تھا پھر مجھ پر جو بیتی وہ بھی تم جانتے ہو۔ میں کہنا یہ چاہتا ہوں کہ اس قسم کے چند ایک جانباز تیار کرو جیسے حسن بن صباح نے تیار کر رکھے ہیں۔ میں ان کے ساتھ جاؤں گا اور ان کی راہنمائی کروں گا' لڑنا ہُوا تو لڑوں گا اور قتل کرنے کا موقعہ ملا تو جس جس کو قتل کرنا ہے کروں گا"۔

"میں آج ہی سالاروں کو بلا کر کہہ دوں گا" — برکیارق نے کہا — "مجھے امید

ہے کہ اپنی جانوں پر کھیلنے والے چند ایک آدمی تو ضرور ہی مل جائیں گے"۔

"لیکن برکیارق!" — مزمل آفندی نے کہا — "اگر تمہارا یہ خیال ہے کہ تم کسی کو سونے چاندی کا لالچ دے کر تیار کر لو گے کہ وہ اپنی جان پر کھیل جائے گا تو تم بہت بڑی اور بڑی ہی خطرناک خوش فہمی میں اپنے آپ کو مبتلا کرو گے۔ حسن بن صباح نے اپنے جانبازوں پر مذہب اور عقیدے کا جنون طاری کر رکھا ہے۔ اس کے ساتھ ہی اس نے اپنے جانبازوں کو حشیش پلا پلا کر ان کے دماغوں پر قبضہ کر رکھا ہے۔ وہاں تو یہ عالم ہے کہ سوچتا حسن بن صباح ہے اور عمل اس کے فدائی کرتے ہیں۔ کیا ہم اس طرح اور اس طریقے سے جانباز پیدا نہیں کر سکتے؟"

"کر سکتے ہیں" — برکیارق کے چھوٹے بھائی محمد نے کہا — "لیکن پہلے سالاروں کے ساتھ بات کر لی جائے"۔

یہاں جانبازوں کی باتیں تو ہو رہی تھیں اور ان لوگوں کو اُمید تھی کہ وہ اسی قسم کے جانباز تیار کر سکیں گے جیسے حسن بن صباح نے تیار کر رکھے تھے لیکن مؤرخ لکھتے ہیں کہ حسن بن صباح نے جس طرح فدائی تیار کئے تھے اس طرح بعد میں کوئی نہیں کر سکا۔ داستان گو پہلے تفصیل سے سنا چکا ہے کہ حسن بن صباح کے جانبازوں کو خوراک کیا کھلائی جاتی تھی' پلایا کیا جاتا تھا اور انہیں عیش و عشرت کے لئے کیسے کیسے سامان مہیا کئے جاتے تھے۔ باطنی جانبازوں کو تو حسن بن صباح نے درندے بنا ڈالا تھا جن کا کام چیرنے پھاڑنے کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ ان کے ذہنوں میں یہ ڈالا گیا تھا کہ جان دے کر ایک اور زندگی شروع ہوتی ہے جس میں صرف عیش و عشرت ہے' اس کے سوا اور کوئی ذمہ داری اور کوئی کام نہیں۔

مَرو میں شمونہ بھی تھی۔ اسے چھوٹی سی عمر میں حسن بن صباح کے ڈاکوؤں نے قافلے سے اغوا کیا تھا اور اس طرح اسے ماں باپ سے جدا کر دیا تھا پھر ان لوگوں نے اُس کے باپ کو قتل کر دیا تھا۔ وہ مرو میں جس طرح آئی اور جس طرح نظام الملک کے سائے میں پہنچی وہ داستان گو سنا چکا ہے۔ وہ تو نظام الملک کو اپنا روحانی باپ سمجھتی تھی۔ اس باپ کو بھی حسن بن صباح کے ایک فدائی نے قتل کر دیا۔ وہ اس قدر روئی کہ اس کی ماں کو یہ خطرہ نظر آنے لگا تھا کہ یہ لڑکی روتے روتے مر جائے گی یا دماغی توازن کھو بیٹھے گی۔

ایک روز اچانک اس کا رونا بند ہو گیا اور اس کی آنکھیں خشک ہو گئیں۔ وہ ماں کے

پاس جا بیٹھی۔

"رات خواب میں نظام الملک سے ملاقات ہوئی ہے" — شمونہ نے ماں سے کہا — "انہوں نے گلہ کیا ہے کہ تم نے ابھی تک میرے قتل کا انتقام نہیں لیا"۔

اُس کی ماں نے یہ بات سنی اور جس انداز سے شمونہ نے یہ بات کی تھی' اس سے ماں کو یقین ہونے لگا کہ اس کی بیٹی کا دماغی توازن بگڑ گیا ہے۔

"انہیں تم سے بہت پیار تھا" — ماں نے کہا — "بس یہ وجہ ہے کہ وہ تمہیں خواب میں نظر آئے ہیں"۔

"نہیں ماں!" — شمونہ نے کہا — "وہ مجھے کہنے آئے تھے کہ میرے خون کا انتقام صرف تم لے سکتی ہو اور تم انتقام لو..... میں اب انتقام لے کے ہی رہوں گی۔ نظام الملک میرے روحانی باپ تھے"۔

"انتقام لو گی کیسے؟" — ماں نے پوچھا — "کیا تم الموت جا کر حسن بن صباح کو قتل کر سکتی ہو؟" — ماں نے پوچھا اور کہا — "تم اس کے پاس رہ چکی ہو۔ وہ جونہی تمہیں دیکھے گا حکم دے دے گا کہ اس لڑکی کو قتل کر دیا جائے۔ اس کے کئی آدمی تمہیں پہچانتے ہوں گے"۔

"میری بات غور سے سنو ماں!" — شمونہ نے کہا — "میں نے زبان کے داؤ پیچ اور ہیر پھیر حسن بن صباح سے سیکھے ہیں۔ یہ اسی پر آزماؤں گی۔ میرے پاس خنجر ہو گا۔ میں اس کے پاس چلی جاؤں گی اور کہوں گی کہ تمہاری محبت مجھے تمہارے پاس کھینچ لائی ہے۔ اس سے پہلے کہ وہ مجھے جلاّد کے حوالے کرے میں خنجر اس کے دل میں اتار چکی ہوں گی"۔

ماں نے اسے اس ارادے سے باز رکھنے کے لئے بہت دلیلیں دیں۔ اپنی محبت کا واسطہ بھی دیا اور یہ بھی کہا کہ تم نہ رہیں تو میرا اس دنیا میں اور کون ہو گا' میں اپنی جان خود ہی لے لوں گی لیکن شمونہ پر کسی بات کا ذرا سا بھی اثر نہ ہُوا۔ شمونہ اپنے ارادے پر ڈٹی رہی۔ وہ ماں کی کوئی بات سننے کے لئے تیار ہی نہ ہوتی تھی۔

ماں نے جا کر مزمل آفندی کو بتایا۔ مزمل آفندی ان کے گھر چلا گیا۔ اس نے شمونہ کو ایسی جذباتی اور ہیجانی کیفیت میں دیکھا جس سے صاف پتہ چلتا تھا کہ یہ حسین و جمیل لڑکی اپنے آپ میں ہے ہی نہیں اور اس کا دماغی توازن مشکوک ہے۔ مزمل نے اس پر اپنی

محبت کا طلسم طاری کرنے کے لئے کچھ جذباتی باتیں کیں۔

"مجھے کچھ نہ کہو مزمل!" ___ شمونہ نے کہا ___ "محبت بعد کی بات ہے۔ اس وقت میری عقل اور میری روح پر نظام الملک کا خون سوار ہے۔ جب تک میں اس خون کا قرض چکا نہیں لیتی میں اس محبت کو ذہن میں لا ہی نہیں سکتی"۔

"یہ بھی سن لو شمونہ!" ___ مزمل نے کہا ___ "جب تک میں زندہ ہوں تم گھر سے باہر قدم نہیں رکھو گی۔ کیا تم یہ سمجھتی ہو کہ ہم مرد مر گئے ہیں یا ہم اتنے بے حس اور بے غیرت ہو گئے ہیں کہ نظام الملک جیسے انسان کا خون ذہن سے اتار دیں گے؟..... میں جاؤں گا۔ ہم جانبازوں کا ایک گروہ تیار کر رہے ہیں۔ مجھے پوری امید ہے کہ وہ دن جلدی طلوع ہو گا جس دن میں احمد بن عطاش اور حسن بن صباح کی لاشیں تمہارے قدموں میں لا کر رکھوں گا"۔

"تم تو پہلے بھی وہاں گئے تھے!" ___ شمونہ نے کہا۔

"وہ تجربہ اب مجھے کام دے گا" ___ مزمل نے کہا ___ "اب میں اکیلا نہیں جاؤں گا۔ جانبازوں کا ایک گروہ لے کر جاؤں گا۔ کیا تم دیکھ نہیں رہی ہو کہ الموت پر حملے کے لئے اتنا بڑا لشکر تیار ہو رہا ہے؟"

"میں کچھ دن انتظار کر لوں گی" ___ شمونہ نے کہا ___ "اگر تم لوگ ناکام ہو گئے تو پھر یہ کام میں کر کے دکھا دوں گی"۔

وہاں اگر کوئی سب سے زیادہ اذیت میں مبتلا تھا تو وہ سلطان ملک شاہ تھا۔ اس سلطان کے آباؤ اجداد نے اسلام کے گرتے ہوئے پرچم کو سنبھالا اور سلطنت سلجوقیہ قائم کی تھی۔ تمام مؤرخ اس حقیقت پر متفق ہیں کہ سلطان ملک شاہ اس دور میں اسلام کا محافظ اور پاسبان تھا۔ اس وقت کا خلیفہ تو برائے نام خلیفہ تھا۔ سلطان ملک شاہ حالات کے ایسے بھنور میں آ گیا تھا جس میں سے اس کے لئے اکیلے نکلنا محال تھا۔ اس کے انتظامی اور دیگر امور اور مسائل میں نظام الملک کی حیثیت ایسی ہی تھی جیسے جسم میں دماغ ہوتا ہے' نظام الملک سلطان ملک شاہ کا بازو ہی نہیں بلکہ زورِ بازو بھی تھا۔ اسے اپنے تین بیٹوں میں سے کسی پر بھی اعتماد نہیں تھا۔ ان میں قومی اور دینی جذبہ تو تھا اور ان میں جوش و خروش بھی تھا لیکن ان میں وہ عقل اور فہم و فراست نہیں تھی جس کی ان حالات میں ضرورت تھی۔

جو مشکلات اس کے سامنے آن کھڑی ہوئی تھیں' ان میں ایک یہ تھی کہ قلعہ الموت عام قلعوں جیسا نہیں تھا۔ پہلے اس قلعے کی ساخت اور محلِ وقوع بیان ہو چکا ہے۔ یہاں مختصراً ذکر ہو گا کہ یہ قلعہ کیسا تھا۔ یہ قلعہ پہاڑی کے اوپر تھا۔ اس کے ایک طرف دریا اور دوسری طرف دلدل اور جھیلیں تھیں۔ یہ خطہ تو بہت ہی خوبصورت اور خوشنما تھا۔ وہاں گھنے درخت تھے' رنگا رنگ پھولوں والے خود رو پودے تھے' رنگا رنگ پتوں والی خوشنما جھاڑیاں تھیں اور گھاس مخمل کے فرش کی طرح پھیلی ہوئی تھی۔ جس پہاڑی پر یہ قلعہ اور شہر تھا' وہ تو ہریالی اور خود رو پھولدار پودوں اور بڑے ہی خوشنما درختوں کی وجہ سے اس قدر خوبصورت تھی کہ یہ اس زمین کا حصہ معلوم ہی نہیں ہوتا تھا۔ اس سارے خطے کو دیکھ کر بڑے ہی حسین خواب کا گماں ہوتا تھا لیکن قدرت کے اس حسن میں بڑے ہی خوفناک خطرے پوشیدہ تھے۔

یہ ایک قدیم قلعہ تھا جو سلطان ملک شاہ نے دو تین مرتبہ دیکھا تھا۔ اس قلعے میں خطرہ یہ تھا کہ جتنا اوپر نظر آتا تھا اس سے تین گنا زیادہ نیچے پہاڑی کے اندر یعنی زمین دوز تھا۔ نیچے بڑی مضبوط چٹان تھی جو خاصی لمبی اور چوڑی تھی۔ کاریگروں نے اس چٹان کو نیچے سے کاٹ کاٹ کر راہداریوں' کمروں اور راستوں کی بھول بھلیاں بنا ڈالی تھیں۔ کوئی اجنبی وہاں جا نکلتا تو پھر اس کا وہاں سے نکل آنا ممکن نہیں ہوتا تھا۔ وہاں گھوڑے اور اونٹ غائب ہو جاتے تھے۔ سلطان ملک شاہ کو جو مسئلہ پریشان کر رہا تھا وہ یہ تھا کہ اس قلعے کو محاصرے میں لینے کے لئے اور پھر اس پر حملہ کرنے کے لئے بہت ہی بڑے لشکر کی ضرورت تھی اور پھر اصل ضرورت یہ تھی کہ اس لشکر کو خاص قسم کی ٹریننگ دی جائے۔

سلطان ملک شاہ نے وہاں اور ارد گرد کے علاقے میں اپنے جاسوس پھیلا رکھے تھے۔ الموت کے اندر بھی جاسوس موجود تھے۔ وہ وقتاً فوقتاً مرو آ کر سلطان ملک شاہ کو وہاں کی خبریں اور اطلاعیں دیتے رہتے تھے لیکن اب وہاں سے جو اطلاعیں آ رہی تھیں وہ مشکلات میں اضافہ کر رہی تھیں مثلاً نظام الملک کے قتل کے ایک مہینے بعد دو جاسوسوں نے الموت سے آ کر سلطان ملک شاہ کو آ کر بتایا کہ باطنیوں کے حوصلے بلند ہو گئے ہیں اور انہوں نے تبلیغ کا کام تیز کر دیا ہے اور اس کے ساتھ ہی انہوں نے ارد گرد کے بلکہ دور دور تک کے قلعوں پر لڑے بغیر قبضہ کرنے کی کوششیں شروع کر دی ہیں۔ سب سے

زیادہ خطرناک خبریہ تھی کہ ان تمام علاقوں پر باطنی اس طرح غالب آ گئے تھے جیسے وہاں کے لوگ حسن بن صباح کو امام ہی نہیں بلکہ نبی تک ماننے لگے تھے۔ عام سی قسم کے لوگوں میں بھی حسن بن صباح کے حکم پر جانیں قربان کرنے کا جذبہ پیدا ہو گیا تھا۔

ایک روز سلطان ملک شاہ نے اپنے تینوں بیٹوں کو بلایا۔

"میرے عزیز بیٹو!" ـــــ سلطان ملک شاہ نے کہا ـــــ "اسلام پر اتنا خطرناک وقت پہلے کبھی نہیں آیا تھا جتنا خطرناک اور خوفناک وقت اب آیا ہے۔ ہم نے اپنی سلطنت کا ہی دفاع نہیں کرنا بلکہ ہماری ذمہ داری اسلام کا تحفظ اور فروغ ہے۔ جس روز سلطنتِ سلجوقیہ ختم ہو گئی اُسی روز اسلام کا پرچم بھی گر پڑے گا۔ بادشاہ کسی کے آگے جواب دہ نہیں ہُوا کرتے لیکن میں اللہ کے حضور جوابدہ ہوں۔ یہ سلطنت میری نہیں، تمہاری نہیں اور تمہارے آباؤ اجداد کی بھی نہیں۔ یہ اللہ کی سلطنت ہے جس کا دفاع ہماری ذمہ داری ہے۔ میں نے تمہیں بتایا نہیں تھا کہ میں کئی راتیں سویا بھی نہیں ہوں۔ میں ہمہ وقت پریشان رہتا ہوں۔ میں اپنے سر میں گرانی محسوس کرنے لگا ہوں۔ میں اکیلا رہ گیا ہوں"۔

"پدرِ محترم!" ـــــ بڑے بیٹے برکیارق نے کہا ـــــ "ہم تین بھائیوں کی موجودگی میں آپ کو یہ نہیں کہنا چاہئے کہ آپ اکیلے رہ گئے ہیں۔ میں ایک بات کہوں گا۔ نظام الملک شہید کو ہم اپنا روحانی باپ سمجھتے تھے۔ اللہ نے جو عقل و دانش انہیں عطا کی تھی وہ ہر کسی کو عطا نہیں ہُوا کرتی۔ یہ میں بھی محسوس کیا کرتا ہوں کہ نظام الملک کے اٹھ جانے سے ہم کمزور ہو گئے ہیں لیکن ہم نے یہ کمزوری اپنے آپ میں اُن کی زندگی میں ہی پیدا کر لی تھی۔ آپ کے سامنے کوئی مسئلہ آیا تو آپ نے خود سوچنے اور فیصلہ کرنے کی بجائے وہ مسئلہ نظام الملک کے سپرد کر دیا۔ یہ وجہ ہے کہ آج آپ اپنے آپ کو تنہا اور کمزور سمجھ رہے ہیں۔ بہت بڑا لشکر تیار ہو رہا ہے اور اس لشکر میں آگ جیسا جذبہ موجود ہے۔ یہ لشکر جب حملہ کرے گا تو باطنیوں کے لئے یہ خاک و خون کا طوفان ثابت ہو گا"۔

"نہیں بیٹے!" ـــــ سلطان ملک شاہ نے کہا ـــــ "یہی تو اس مسئلے کا وہ پہلو ہے جسے تم سمجھ نہیں رہے۔ المُوت کو لشکر کے زور پر فتح نہیں کیا جا سکتا۔ میں تو سوچ سوچ کر پریشان ہو گیا ہوں۔ تم مجھے سوچنے میں مدد دو۔ ہمیں کوئی اور طریقہ اختیار کرنا پڑے

گا"۔

"ہمیں موقع دیں پدرِ محترم!" ـــــ اس کے بیٹے محمد نے کہا ـــــ "آپ اتنے زیادہ بھی پریشان نہ ہو جائیں۔ ہم خود بھی ایک اور طریقہ اختیار کر رہے ہیں۔ ہم جانبازوں کا ایک گروہ تیار کر رہے ہیں"۔

سلطان ملک شاہ نے اپنے بیٹوں کو اپنی جو ذہنی اور جذباتی حالت بتائی تھی وہ بہت ہی کم بتائی تھی۔ مؤرخ لکھتے ہیں کہ اُس وقت سلطان ملک شاہ اعصابی تکلیف میں مبتلا ہو چکا تھا۔ مسائل تو الگ تھے، صرف نظام الملک کے غم نے ہی اسے نڈھال کر دیا تھا۔ وہ عیش و عشرت کا دلدادہ سلطان نہیں تھا۔ بنی نوع انسان کی محبت دل میں رکھنے والا سادہ طبیعت انسان تھا۔ اس کی عمر بھی کچھ زیادہ ہو گئی تھی جس سے جسم میں قوتِ مدافعت کم ہو گئی تھی۔ غم اور مسائل نے اس کے اعصاب پر اتنا زیادہ بوجھ ڈال دیا تھا جو اس کے اعصاب برداشت نہ کر سکے۔ ایک روایت یہ بھی ہے کہ تنہائی میں اسے روتے بھی دیکھا گیا تھا۔ اس کی چال ڈھال میں پہلے والی شان و شوکت نہیں رہی تھی۔ اُس نے راتوں کو اٹھ اٹھ کر اللہ کی عبادت شروع کر دی تھی۔ شب بیداریوں کا اثر الگ تھا۔

○

جس طرح المُوت کی خبریں اور اطلاعیں سلطان ملک شاہ کے جاسوس مَرو تک پہنچا رہے تھے اسی طرح حسن بن صباح کے جاسوس مَرو کی خبریں حسن بن صباح تک لے جا رہے تھے۔

دونوں اطراف میں فرق یہ تھا کہ سلطان ملک شاہ کو جب المُوت کے بارے میں راز کی کوئی بات معلوم ہوتی تھی تو وہ پریشان ہو جاتا تھا لیکن جب حسن بن صباح کو اس کا کوئی جاسوس مَرو سے جا کر یہ بتاتا تھا کہ مَرو میں بہت بڑا لشکر تیار ہو رہا ہے اور اس لشکر کو جنگی تربیت دی جا رہی ہے اور اس لشکر میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے تو حسن بن صباح کے چہرے پر پریشانی کے آثار نمودار ہونے کی بجائے اس کے ہونٹوں پر لطیف سا تبسم آ جاتا تھا۔ اسے یہاں تک معلوم ہو گیا تھا کہ سلطان ملک شاہ پہلے والا تندرست و توانا اور چاق و چوبند سلطان نہیں رہا۔ جاسوسوں نے حسن بن صباح کو یہ بھی بتایا تھا کہ سلطان ملک شاہ کی چال ڈھال اور بولنے کے انداز میں بھی نقاہت آ گئی ہے۔

ایک روز مزمل آفندی گھوڑ دوڑ کے میدان کے باہر تماشائیوں میں کھڑا سواروں کی

ٹریننگ دیکھ رہا تھا۔ اسے کوئی جوان سال آدمی ملتا تو وہ اسے سب سے پہلے یہ بات کہتا تھا کہ وہ لشکر میں کیوں شامل نہیں ہوا۔ اُس روز وہ گھوڑ سواروں کی ٹریننگ اتنی دلچسپی سے نہیں دیکھ رہا تھا جتنی توجہ سے وہ تماشائیوں کو دیکھتا پھرتا تھا۔ وہ تین چار نوجوانوں سے کہہ چکا تھا کہ وہ تماشا دیکھنے کی بجائے لشکر میں شامل ہو جائیں تو انہیں شہسوار بنا دیا جائے گا۔ وہ اس کوشش میں تھا کہ لشکر میں اضافہ ہوتا چلا جائے اور زیادہ نوجوان لشکر میں بھرتی ہوں۔

وہ تماشائیوں میں گھوم پھر رہا تھا کہ اسے اپنی عمر کا یعنی جوان سالی ایک آدمی نظر آیا۔ یہ چہرہ اسے کچھ مانوس سا معلوم ہُوا۔ وہ سوچنے لگا کہ اسے اس نے پہلے کہاں دیکھا ہے۔ اتنا تو وہ سمجھ سکتا تھا کہ اس شہر کی آبادی بھی کچھ کم نہیں۔ چلتے پھرتے' کہیں نہ کہیں یہ شخص سامنے آگیا ہو گا لیکن مزمل یاد کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ اسے کہیں اور دیکھا تھا اور کسی خاص موقعہ پر اور کس خاص صورتِ حال میں دیکھا تھا۔ اس نے اس آدمی کے چہرے کو اور زیادہ غور سے دیکھا۔

مزمل کو دراصل اس آدمی کی دائیں آنکھ کے ذرا نیچے گال کی ہڈی پر ایک تِل نظر آرہا تھا جو مٹر کے دانے جتنا تھا اور یہ کالا تِل اُبھرا ہُوا تھا۔ مزمل اس تِل یا موکے کو نظرانداز نہ کر سکا۔ اس آدمی نے مزمل کی طرف دیکھا تو اس شخص کے چہرے کا تاثر بدل گیا اور وہ وہاں سے کھسکنے لگا۔ اس سے مزمل کو کچھ شک ہُوا۔

"ذرا رُکنا بھائی!" — مزمل نے اُس کے پیچھے جاتے ہوئے کہا۔

وہ آدمی یوں چلتا چلا گیا جیسے اس نے مزمل کی آواز سنی نہ ہو۔ مزمل تیز تیز چلتا اس کے پاس جا پہنچا۔

"ہم اس سے پہلے کہاں ملے تھے؟" — مزمل نے پوچھا اور اس کا چہرہ اور زیادہ غور سے دیکھتے ہوئے بولا — "آپ کو میں نے یہاں اس شہر میں نہیں دیکھا' ہم کہیں اور ملے تھے"۔

"ضرور ملے ہوں گے بھائی!" — اس آدمی نے کہا — "میں تمہارے اخلاق کی تعریف کروں گا کہ تم نے مجھے یاد رکھا اور اتنی محبت سے مجھے بلایا۔ مجھے بالکل یاد نہیں کہ ہم کہیں ملے بھی تھے یا نہیں۔ ہو سکتا ہے ہم کسی قافلے میں ہمسفر رہے ہوں یا کسی سرائے میں تم نے مجھے دیکھا ہو۔ میں تجارت پیشہ آدمی ہوں۔ شہر شہر' قصبہ قصبہ گھومتا

رہتا ہوں۔ میں یہاں کا رہنے والا نہیں!"

"مجھے تمہارا یہ موٹا تِل یاد ہے" — مزمل نے کہا۔

اس آدمی نے زوردار قہقہہ لگایا اور مزمل کا دایاں ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں لے کر زور سے دبایا۔

"اس تِل کی وجہ سے ہی جو مجھے ایک بار دیکھ لیتا ہے وہ ہمیشہ یاد رکھتا ہے" — اس آدمی نے بڑے ہی شگفتہ لہجے میں کہا اور پوچھا — "کیا تم یہیں کے رہنے والے ہو؟"

"ہاں بھائی!" — مزمل آفندی نے جواب دیا — "میں یہیں کا رہنے والا ہوں"۔

"اچھا دوست!" — اس آدمی نے مزمل سے ہاتھ ملایا اور کہا — "میں تمہاری محبت کو یاد رکھوں گا"۔

وہ آدمی چلا گیا اور مزمل کھڑا سوچتا رہا۔ اسے اتنا ہی یاد آرہا تھا کہ یہ شخص اسے کسی خاص صورتِ حال اور کسی خاص جگہ ملا تھا اور اس کے ساتھ اس کی اچھی خاصی باتیں بھی ہوئی تھیں۔ کچھ دن اور گزر گئے۔ مزمل سلطان ملک شاہ کے بیٹوں سے ملتا ملاتا ہی رہتا تھا۔ ان میں بڑا بیٹا برکیارق چونکہ عمر میں ذرا بڑا تھا اس لئے فہم و فراست رکھتا تھا اس لئے ہوش مندی کی بات کر بھی لیتا تھا اور سمجھتا بھی تھا۔ مزمل آفندی زیادہ تر اسی کے ساتھ رابطہ رکھتا تھا۔ دوستی کے علاوہ ان کا ایک تعلق یہ بھی تھا کہ دونوں ایک جانباز گروہ تیار کر رہے تھے۔ ایک صبح مزمل برکیارق کے ہاں گیا۔ دونوں اکٹھے وہاں جایا کرتے تھے جہاں فوجیوں کو تیغ زنی' تیر اندازی اور برچھی بازی سکھائی جاتی تھی۔ مزمل نے اُس روز برکیارق کو پریشان سا دیکھا۔ مزمل نے اس سے پوچھا کہ آج کوئی خاص بات ہو گئی ہے کہ وہ اتنا پریشان نظر آرہا ہے؟

"ہاں بھائی!" — برکیارق نے بتایا — "سلطان تو صاحب فراش ہی ہو گئے ہیں"۔

"کوئی خاص تکلیف ہو گئی ہے؟" — مزمل نے پوچھا۔

"کسی خاص مرض کا نام نہیں لیا جا سکتا" — برکیارق نے جواب دیا — "کہتے ہیں کہ سر میں گرانی ہے اور کسی وقت سارے جسم میں ایسی بے چینی شروع ہو جاتی ہے جو ان کی برداشت سے باہر ہو جاتی ہے۔ کمزوری اتنی محسوس کرنے لگے ہیں کہ ان کی ٹانگیں جسم کا بوجھ سہارنے کے قابل نہیں رہیں"۔

"طبیب نے دیکھا ہو گا؟"

"طبیب تو تین چار دنوں سے باقاعدہ آرہا ہے" — برکیارق نے جواب دیا — "طبیب نے کہا ہے کہ سلطان کو ذہنی سکون کی شدید ضرورت ہے۔ وہ مسکّن اور مقوّی دوائیاں دے رہا ہے لیکن کوئی افاقہ نظر نہیں آتا بلکہ حالت کبھی تو زیادہ ہی بگڑ جاتی ہے"۔

"انہیں نظام الملک کا غم لے بیٹھا ہے" — مزمل نے کہا — "پھر ان کے ذہن اور دل پر یہ بوجھ آپڑا ہے کہ وہ باطنیوں کو شکست نہیں دے سکیں گے۔ یہ ہمارا کام ہے کہ انہیں یقین دلائیں کہ ہم باطنیوں کو تہس نہس کر کے رکھ دیں گے..... کیا یہ مناسب ہو گا کہ مجھے سلطان کے پاس لے چلو؟ مجھے امید ہے کہ میں انہیں اٹھا لوں گا۔ میرے ساتھ ان کا اچھا خاصا پیار ہے"۔

"نہیں مزمل بھائی!" — برکیارق نے کہا — "طبیب نے سختی کے ساتھ کہہ دیا ہے کہ باہر کا کوئی آدمی سلطان کے پاس نہ آئے۔ جب تک سلطان خود کسی کو نہ بلائیں' گھر کا بھی کوئی فرد ان کے پاس نہ جائے"۔

اس کے بعد مزمل اپنے کام میں مصروف ہو گیا۔ اس کا اب یہی ایک عزم تھا کہ جانبازوں کا ایک گروہ تیار کرنا ہے اور انہیں اسی طرح بنانا ہے جس طرح سلطان کا ایک ایلچی الموْت جا کر حسن بن صباح کے فدائیوں کو دیکھ آیا تھا۔ مزمل چاہتا تھا کہ خواہ بیس ہی جانباز تیار ہو جائیں لیکن وہ اس طرح تیار ہوں کہ اگر کسی سے کہا جائے کہ وہ اپنے پیٹ میں تلوار اتار لے تو وہ بلا حیل و حجت اپنے پیٹ میں تلوار اتار لے۔ مزمّل کا یہ عزم تو تھا لیکن اسے ایسا کوئی تجربہ حاصل نہیں تھا کہ اس طرح کے جانباز کیسے تیار کئے جاتے ہیں۔ بہرحال اسے دس بارہ نوجوان مل گئے تھے جنہیں ایک سالار ہتھیاروں کے استعمال کی تربیت دے رہا تھا۔ اس کے بعد انہیں حسن بن صباح کے فدائیوں کی طرح جانبازی کے لئے تیار کرنا تھا۔ مزمل زیادہ تر وقت ان کے ساتھ صرف کر رہا تھا اور ان کے دلوں میں وہ باطنیوں کی نفرت کی آگ جلانے کی کوششیں کر رہا تھا۔

○

ایک روز برکیارق اپنے گھر سے نکلا تو اسے باہر والے دروازے پر ایک درویش صورت آدمی کھڑا نظر آیا۔ دربان اس آدمی کو اندر جانے سے روک رہے تھے۔ اس

درویش نے برکیارق کو دیکھا تو دور سے ہی ماتھے پر ہاتھ رکھ کر سلام کیا۔ برکیارق اُس تک جا پہنچا۔ دربانوں نے اسے بتایا کہ یہ درویش اندر جانے اور سلطان کو دیکھنے کی اجازت مانگ رہا تھا۔

درویش کے ایک ہاتھ میں تسبیح اور دوسرے ہاتھ میں عصا تھا۔ اس نے سر پر سفید پگڑی لپیٹ رکھی تھی اور اس پر ایک چوڑا سبز رنگ کا کپڑا ڈال رکھا تھا جو اس کے کندھوں تک آیا ہُوا تھا۔ اُس نے سبز رنگ کا چغہ پہن رکھا تھا جو اُس کے ٹخنوں تک لمبا تھا۔ اس نے گلے میں موٹے موتیوں کی ایک مالا ڈال رکھی تھی۔ اس کی داڑھی خشخشی تھی اور اس داڑھی اور چہرے سے وہ چالیس سال کے لگ بھگ عمر کا لگتا تھا۔ بہرحال وہ ہر پہلو سے درویش معلوم ہوتا تھا۔

"آپ سلطان سے کیوں ملنا چاہتے ہیں؟" — برکیارق نے پوچھا اور اسے بتایا — "آپ کو شاید معلوم نہیں کہ سلطان بیمار پڑے ہیں اور طبیب نے ان کی ملاقاتیں بند کر دی ہیں۔ آپ مجھے بتائیں میں آپ کی خدمت کے لئے حاضر ہوں۔ یہاں جو بھی آتا ہے وہ مایوس واپس نہیں جایا کرتا۔ میں نے آپ کو مجبوری بتادی ہے ورنہ سلطان فوراً آپ کو ملاقات کے لئے بلاتے"۔

"میں جانتا ہوں" — درویش نے کہا — "میں یہی سن کر آیا ہوں کہ سلطان بیمار پڑے ہیں۔ میں نے یہ بھی معلوم کر لیا ہے کہ سلطان کو کیا مرض لاحق ہو گیا ہے۔ مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ سلطان کو طبیب نے ایسی دوائیاں دی ہیں جن کے زیرِ اثر سلطان سوئے رہتے ہیں۔ میں یہ نہیں کہتا کہ طبیب کا علاج روک دیا جائے۔ وہ علاج جاری رکھا جائے۔ میں روحانی عامل ہوں۔ مجھے شک ہے کہ سلطان پر کوئی سفلی عمل کیا گیا ہے اور میں یہ بھی کہہ سکتا ہوں کہ یہ سفلی عمل باطنیوں نے کروایا ہے۔ مجھے صرف ایک بار سلطان سے ملنے دیں' میں صرف انہیں دیکھوں گا"۔

"میں سلطان سے پوچھ کر آپ کو کچھ بتا سکوں گا" — برکیارق نے کہا — "اس وقت تو وہ سوئے ہوئے ہیں"۔

"انہیں بے آرام نہیں کرنا" — درویش نے کہا — "میں ایک بات کہنا چاہتا ہوں۔ آپ کو مجھ پر اتنی جلدی اعتماد نہیں کرنا چاہئے۔ میں آپ کے لئے اجنبی ہوں۔ اپنے متعلق یہ بتا دوں کہ میں آگے جا رہا ہوں' یہاں کچھ دنوں کے لئے رکا ہوں اور

سرائے میں ٹھہرا ہوں۔ اگر آپ چاہیں تو سرائے میں آجائیں اور میری کچھ باتیں سنیں اور کچھ باتیں میں آپ سے پوچھوں گا۔ پھر آپ مجھ پر اعتماد کر لیں گے۔ مجھے کوئی لالچ نہیں۔ آپ میرے پاس آئیں"۔

"میں ابھی نہ چلا چلوں؟" — برکیارق نے پوچھا۔

"یہ تو اور زیادہ اچھا رہے گا" — درویش نے کہا — "آیئے!"

راستے میں درویش باتیں کرتا گیا۔ برکیارق کو بولنے کا موقع نہ ملا لیکن درویش کی باتوں سے وہ متاثر ہو گیا تھا۔

چلتے چلتے وہ سرائے میں جا پہنچے۔ درویش برکیارق کو بالائی منزل پر لے گیا۔ اس کا کمرہ اوپر تھا۔

وہ جب کمرے میں داخل ہوئے تو ایک نوجوان لڑکی نے ان کا استقبال کیا۔

"یہ سلطانِ مکرّم کے بڑے فرزند برکیارق ہیں" — درویش نے لڑکی سے کہا — "سلطان سوئے ہوئے تھے۔ ان سے ملاقات ہو گئی اور یہ میرے ساتھ ہی آگئے ہیں"۔

"خوش آمدید!" — لڑکی نے ذرا جھک کر کہا — "سلطان کی بیماری نے ہمارے دلوں پر بہت اثر کیا ہے۔ میں ان کے لئے دعا کرتی رہتی ہوں۔ اگر یہ ممکن ہو تو میں اپنی زندگی سلطان کو دے دوں۔ سلطان ملک شاہ ہی ہیں جو اسلام کے ایک بڑے ہی مضبوط ستون ہیں۔ اللہ انہیں سلامت رکھے"۔

"یہ میری چھوٹی بہن روزینہ ہے" — درویش نے کہا — "فرزندِ سلطان! یہ میرے کندھوں پر بہت بڑی اور بڑی ہی نازک ذمہ داری ہے۔ میں اس ذمہ داری سے فارغ ہونا چاہتا ہوں لیکن کوئی موزوں آدمی نظر نہیں آتا۔ اگر کوئی آدمی ٹھیک ملتا بھی ہے تو اس کا خاندانی پس منظر ٹھیک نہیں ہوتا۔ نظریات اور عقیدوں کا فرق بھی ہوتا ہے۔ میں اس بہن کو پھینکنا یا ضائع نہیں کرنا چاہتا"۔

برکیارق سلطان زادہ تھا' حکمران خاندان کا چشم و چراغ تھا اور وہ جوان بھی تھا۔ وہ تھا تو پکا مسلمان لیکن اپنے باپ کی طرح مومن نہ تھا۔ وہ عیش پرست اور مے نوش تو نہ تھا لیکن اتنی نوجوان اور حسین لڑکی کو دیکھ کر متاثر نہ ہونا اس کی فطرت میں نہیں تھا۔ کچھ دیر کے لئے تو وہ یہ بھول ہی گیا کہ لڑکی کا بڑا بھائی درویش کمرے میں موجود ہے۔ برکیارق کی نظریں اس لڑکی کی زلفوں میں الجھ کے رہ گئیں۔ برکیارق کی نظروں سے ایک

سے بڑھ ایک لڑکی گزری تھی۔ بعض کو تو وہ کچھ دیر بعد بھول جاتا تھا' کچھ اسے ایک دو دن یاد رہتی تھیں اور کبھی کوئی لڑکی اسے اپنے حسن و جوانی کی وجہ سے کئی کئی دن یاد رہتی تھی۔ وہ شہزادوں کی طرح لڑکیوں میں دلچسپی رکھنے والا آدمی نہیں تھا۔ اس پر اپنے باپ کا کم از کم یہ اثر ضرور تھا کہ وہ لڑکیوں کا شیدائی نہیں تھا لیکن آخر وہ جواں سال آدمی تھا۔ اس لڑکی سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ روزینہ حسین تو تھی ہی لیکن برکیارق نے اس میں کوئی ایسی کشش' ایسی جاذبیت یا کوئی ایسا طلسماتی تاثر دیکھا کہ اس کے جی میں یہی آتی تھی کہ کچھ وقت اس کمرے میں اس لڑکی کے ساتھ گزارے۔ لڑکی کے چہرے کے نقش و نگار کوئی غیر معمولی طور پر پُرکشش نہیں تھے' لڑکی کا انداز کچھ ایسا تھا جس کے اثر سے برکیارق اپنے آپ کو بچا نہ سکا۔ برکیارق لڑکی کی طرف دیکھتا تو وہ نظریں جھکا لیتی تھی۔ جب برکیارق درویش کی طرف متوجہ ہوتا تو لڑکی برکیارق کے چہرے پر نظریں گاڑ دیتی تھی۔

"میں حج کے لئے جا رہا ہوں" — درویش نے کہا — "لیکن معلوم ہوتا ہے کہ اس سال بھی میں حج نہیں کر سکوں گا۔ میں حج پر اُس وقت جاؤں گا جب روزینہ کا ہاتھ کسی معزّز انسان کے ہاتھ میں دے دوں گا۔ یہ میرے مرحوم ماں باپ کی امانت ہے۔ اسے بچا بچا کر اور سینے سے لگا کر رکھ رہا ہوں"۔

برکیارق نے ابھی شادی نہیں کی تھی۔ وہ یہ تو بھول ہی گیا کہ وہ اس درویش کے ساتھ کیوں آیا تھا' وہ اس سوچ میں گم ہو گیا کہ وہ اس لڑکی کے ساتھ شادی کرنا چاہے تو کیا سلطان ملک شاہ اُسے اس کی اجازت دے دے گا۔ اس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ شادی کرے گا تو اس لڑکی کے ساتھ کرے گا۔ مشکل یہ تھی کہ سلطان ملک شاہ اعصاب زدگی میں پڑا تھا۔ اس حالت میں برکیارق اس سے یہ نہیں پوچھ سکتا تھا کہ وہ اس لڑکی کے ساتھ شادی کرنا چاہتا ہے' کیا اسے اجازت مل سکتی ہے یا نہیں۔

"میں سلطان ملک شاہ کا معتقد اور مرید ہوں" — درویش نے کہا — "یہاں آکر پتہ چلا کہ وہ تو بیمار پڑے ہیں۔ میں نے ان کے مرض کی علامات اِدھر اُدھر سے معلوم کیں۔ میرا باپ علمِ روحانیت میں مہارت رکھتا تھا۔ اس نے دو تین کرامات مجھے ورثے میں دی تھیں۔ مجھے جب سلطان کی علامات معلوم ہوئیں تو میرا دھیان حسن بن صباح اور اس کے باطنی فتنے کی طرف چلا گیا۔ مجھے اچھی طرح معلوم ہے کہ آپ کے پدرِ محترم

نے اس فتنے کی سرکوبی کے لئے کیا کیا جتن کئے ہیں۔ مجھے یہ بھی خیال آیا کہ حسن بن صباح اور اس کا استاد سفلی علم کے ماہر ہیں۔ نظام الملک تو قتل ہو گئے ہیں لیکن سلطان کو یہ باطل پرست سفلی علم سے مفلوج کر دینا چاہتے ہیں یا اُنہیں ہمیشہ کے لئے ختم کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ میں گذشتہ رات نفل پڑھ کر مراقبے میں گیا' مجھے جو صورت حال نظر آئی اس سے میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ سلطان پر کوئی دوائی اثر نہیں کرے گی لیکن دوائی روکنی بھی نہیں کیونکہ یہ دوائی انہیں سلا دیتی ہے اور ان کے لئے سوئے رہنا ہی اچھا ہے۔ میں ان کا روحانی علاج کرنا چاہتا ہوں اور اس کے سوا کوئی ذریعہ نہیں جو انہیں سفلی اثرات سے نجات دلا دے۔"

اُس کے بعد درویش نے ایسی طلسماتی اور پُراسرار سی باتیں کیں کہ برکیارق نے شدت سے محسوس کیا کہ ابھی اس درویش کو اپنے باپ کے پاس لے جائے اور انہیں کہے کہ وہ اس درویش کا علاج فوراً شروع کر دیں۔

"ایک بات بتائیں" ــــ برکیارق نے درویش سے پوچھا ــــ "کیا سفلی عمل سے کوئی ہماری پوری سلطنت کو تباہ کر سکتا ہے؟"

"نہیں!" ــــ درویش نے جواب دیا ــــ "ایسا نہیں ہو سکتا۔ ذرا تصور میں لائیں کہ ایک گھر کے ذمہ دار افراد کو ذہنی طور پر مفلوج کر دیا جائے یا ان پر اعصابی مرض طاری کر دیا جائے تو اس کا نتیجہ کیا ہو گا؟..... وہ گھر تباہ حال ہو جائے گا۔ یہی مثال ایک سلطنت کی ہوتی ہے۔ سلطان ملک شاہ کو دماغی اور جسمانی لحاظ سے معذور کر دیا گیا ہے۔ اگر آپ ان کے جانشین ہوں گے تو آپ کا بھی یہی انجام ہو گا' پھر سلطنت نے تو تباہ ہونا ہی ہے۔"

"آپ کا طریقۂ علاج کیا ہو گا" ــــ برکیارق نے پوچھا ــــ "کیا آپ ان کے لئے دعا کریں گے یا کوئی اور طریقہ اختیار کریں گے؟"

"میں دعا بھی کروں گا" ــــ درویش نے کہا ــــ "اور میں کلام اللہ کے تعویذ لکھ کر بھی دوں گا لیکن میرا طریقۂ علاج اُس وقت کامیاب ہو گا جب میں سلطان کو دیکھ لوں گا..... آپ مجھے ان سے جلدی ملوا دیں۔ میں اپنے پیرو مرشد کو اُس روحانی اذیت میں پڑا ہوا نہیں دیکھ سکتا۔"

"میں خود بھی تو انہیں اس حالت میں نہیں دیکھ سکتا" ــــ برکیارق نے کہا ــــ

"وہ آپ کے پیرو مُرشد ہیں اور میرے باپ ہیں۔ میں جاتا ہوں۔ وہ جونہی جاگے میں یہاں آجاؤں گا اور آپ کو ساتھ لے جاؤں گا..... کیا آپ سارا دن یہیں ہوں گے؟"

"ہاں!" ــــ درویش نے جواب دیا ــــ "میں جب تک سلطان کو دیکھ نہ لوں یہیں رہوں گا۔"

"بھائی جان!" ــــ روزینہ نے درویش سے کہا ــــ "آپ وہ کام کر آئیں لیکن ذرا جلدی آجانا۔"

"ہاں!" ــــ درویش نے کہا ــــ "تم نے یاد دلا دیا ہے۔ میں وہ کام کر آتا ہوں۔ اتنی دیر فرزندِ سلطان تمہارے ساتھ رہیں گے" ــــ درویش نے برکیارق سے کہا ــــ "یہ اکیلے ڈرتی ہے۔ میرا چھوٹا سا ایک کام ہے۔ آپ اس کے پاس بیٹھیں' میں ابھی آتا ہوں۔"

درویش باہر نکل گیا۔

"آپ تو شادی شدہ ہوں گے؟" ــــ روزینہ نے برکیارق سے کہا۔

"نہیں روزینہ!" ــــ برکیارق نے کہا ــــ "ہمارے خاندان کا یہ دستور ہے کہ اولاد کی شادی اُس وقت کرتے ہیں جب وہ ذہنی طور پر پوری طرح بالغ ہو جاتی ہے۔ میں نے ابھی تک فیصلہ نہیں کیا کہ میں کس کے ساتھ شادی کروں گا۔"

"کیا آپ کسی خاص لڑکی کو چاہتے ہیں؟" ــــ روزینہ نے شرماتے ہوئے پوچھا۔

"لڑکیاں بہت دیکھی ہیں" ــــ برکیارق نے کہا ــــ "ایک سے بڑھ کر ایک لڑکی دیکھی ہے لیکن میرے دل نے کسی ایک کو بھی پسند نہیں کیا۔"

"کیا آپ لڑکی میں کوئی خاص وصف دیکھنا چاہتے ہیں؟" ــــ روزینہ نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں!" ــــ برکیارق نے جواب دیا ــــ "میں خاص وصف ہی ڈھونڈ رہا ہوں"۔

"کیا وہ کسی ایک بھی لڑکی میں نظر نہیں آیا؟" ــــ روزینہ نے پوچھا۔

"آج نظر آگیا ہے" ــــ برکیارق نے کہا ــــ "وہ وصف تم میں نظر آیا ہے"۔

"لیکن میں شاہی خاندان کے قابل تو نہیں" ــــ روزینہ نے کہا ــــ "میں اپنی حیثیت کو اچھی طرح پہچانتی ہوں"۔

"دیکھو روزینہ!" ــــ برکیارق نے کہا ــــ "تھوڑی سی دیر کے لئے بھول جاؤ کہ

میں سلطان زادہ ہوں۔ مجھے اپنے ساتھ کا ایک آدمی سمجھو اور دیانتداری سے بتاؤ کہ میں تمہیں اچھا لگتا ہوں یا نہیں؟"

"آپ نے بڑا ہی مشکل سوال کیا ہے" ــــ روزینہ نے کہا ــــ "اگر میں نے کہا کہ آپ مجھے بہت ہی اچھے لگتے ہیں تو آپ کہیں گے کہ آپ شاہی خاندان کے فرد ہیں اس لئے مجھے اچھے لگتے ہیں۔ اگر میں نے کہا کہ میں نے آپ میں اچھا لگنے والا کوئی وصف نہیں دیکھا تو آپ ناراض ہو جائیں گے۔ دانشمند کہتے ہیں کہ بادشاہوں سے دُور رہو۔ خوش ہوتے ہیں تو اشرفیوں سے جھولی بھر دیتے ہیں۔ ناراض ہو جائیں تو سُولی پر کھڑا کر دیتے ہیں"۔

"میں تم میں ایک اور وصف دیکھنا چاہتا ہوں" ــــ برکیارق نے کہا ــــ "میں یہ دیکھنا چاہتا ہوں کہ تم میں جرأت بھی ہے یا نہیں۔ میں ایسی لڑکی کی تلاش میں ہوں جو اللہ کے سوا کسی سے نہ ڈرے"۔

"یہ وصف بھی مجھ میں ہے" ــــ روزینہ نے کہا ــــ "میں سچّی بات کہہ چکی ہوں۔ وہ ایک بار پھر کہہ دیتی ہوں۔ اگر میں نے کہا کہ آپ میرے دل کو بہت ہی اچھے لگتے ہیں تو آپ کے دماغ میں سلطانی بیدار ہو جائے گی اور آپ شک کریں گے کہ مجھے آپ کے ساتھ نہیں آپ کے رتبے کے ساتھ محبت ہے۔ آپ نے بہت سی لڑکیاں دیکھی ہیں اور کسی ایک کو بھی اپنے قابل نہیں پایا۔ میں نے بھی بہت لڑکے دیکھے ہیں نوجوان بھی اور پکی عمر کے جوان بھی۔ آپ کی طرح مجھے بھی کسی میں وہ وصف نظر نہیں آیا جو آپ ڈھونڈتے پھر رہے ہیں"۔

"کیا وہ وصف مجھ میں نہیں؟" ــــ برکیارق نے پوچھا ــــ "اب میں توقع رکھوں گا کہ تم جرأت سے سچ بولو گی"۔

"ہاں، آپ میں مجھے وہ خوبی نظر آگئی ہے"۔

"کیا ہے وہ خوبی؟" ــــ برکیارق نے پوچھا۔

"آپ سلطان کے بیٹے ہیں" ــــ روزینہ نے جواب دیا ــــ "لیکن میں نے آپ کے انداز میں سلطانی نہیں دیکھی۔ آپ نے میرے درویش بھائی سے کہا تھا کہ آپ نے لڑکیوں میں کبھی دلچسپی نہیں رکھی۔ اگر آپ نے سچ بولا تھا تو آپ وہ آدمی ہیں جسے میں اپنے خاوند کی حیثیت سے پسند کروں گی لیکن میں اتنی کمتر ہوں کہ آپ سے یہ

درخواست کروں گی ہی نہیں کہ آپ مجھے قبول کرلیں اور میرا بھائی میرے فرض سے فارغ ہو کر حج کے لئے چلا جائے"۔

تاریخ گواہی دیتی ہے کہ برکیارق لڑکیوں کا شیدائی نہیں تھا جس طرح کہ شہزادے ہُوا کرتے ہیں۔ یہ پہلی لڑکی تھی جو اس کے دل میں اُتر گئی تھی۔ تھوڑی ہی دیر میں روزینہ اس کے دل پر ہی نہیں بلکہ دماغ پر بھی غالب آگئی۔ اس نے روزینہ کو اپنا فیصلہ سنا دیا لیکن روزینہ نے پھر بھی یہ کہا کہ وہ ڈرتی ہے کہ برکیارق کے دماغ میں سلطانی بیدار ہو گئی تو وہ روزینہ کو اٹھا کر باہر پھینک دے گا۔

"نہیں..... نہیں!" ــــ روزینہ نے کہا ــــ "یہ شادی نہیں ہو سکے گی۔ سلطان ملک شاہ آپ کو اجازت نہیں دیں گے کہ آپ ایک ایسی لڑکی سے شادی کرلیں جس کا نہ کوئی گھر گھاٹ ہے اور نہ اس کا کوئی ٹھکانہ ہے"۔

برکیارق نے اسے قسمیں کھا کھا کر یقین دلانا شروع کر دیا کہ اسے اگر سلطان نے شادی کی اجازت نہ دی تو وہ روزینہ کو ساتھ لے کر یہاں سے چلا ہی جائے گا۔

"میں تمہاری محبت پر سلطنت کی جانشینی اور وراثت قربان کر دوں گا" ــــ برکیارق نے کہا ــــ "اللہ گواہ ہے کہ تم پہلی لڑکی ہو جسے میں یہ الفاظ کہہ رہا ہوں"۔

"آپ میری محبت پر سلطنت کی وراثت قربان کر رہے ہیں" ــــ روزینہ نے کہا ــــ "اور میں آپ کی سلطانی پر اپنی محبت قربان کرتی ہوں..... آپ سلطان کے بڑے بیٹے ہیں۔ ان کے بعد آپ سلطان بنیں گے۔ میں آپ کو سلطان کے روپ میں دیکھنا چاہتی ہوں۔ آپ مجھے زیادہ مجبور نہ کریں"۔

"تمہارے بھائی جان آرہے ہوں گے" ــــ برکیارق نے کہا اور اس سے پوچھا ــــ "اگر میں تمہیں تنہائی میں ملنا چاہوں تو کیسے مل سکتا ہوں؟"

"میں آپ کو تنہائی میں بھی مل سکتی ہوں" ــــ روزینہ نے کہا ــــ "لیکن میں آپ کو یہ بتا دیتی ہوں کہ آپ سلطان کے بیٹے کی حیثیت سے مجھے ملنے آئے تو وہ ہماری آخری ملاقات ہو گی۔ میرے پاس کوئی دولت نہیں۔ میرا بھائی درویش ہے۔ اس کے پاس اتنی سی پونجی ہوتی ہے کہ ہم دو وقت عزت کی روٹی کھا لیتے ہیں اور سفر کے اخراجات ادا کر سکتے ہیں لیکن میرے پاس جو دولت ہے وہ میری آبرو، میری عصمت ہے۔ میں جان دے دوں گی، اس دولت سے دست بردار نہیں ہوں گی۔ آپ میرے

قدموں میں اشرفیوں کا انبار لگا دیں۔ آپ مجھے خرید نہیں سکیں گے"۔

"کیا تم میری محبت کو بھی قبول نہیں کرو گی؟" ــــ برکیارق نے پوچھا ــــ "کیا تم اس روحانی محبت کو نہیں پہچان سکو گی جس کا تعلق جسموں کے ساتھ نہیں ہوتا؟"

"میں اسی محبت کی جستجو میں ہوں" ــــ روزینہ نے کہا ــــ "لیکن سنا ہے شاہی خاندانوں میں ایسی محبت نہیں ملا کرتی جس کا تعلق روح کے ساتھ ہوتا ہے جسموں کے ساتھ نہیں"۔

"میں تمہاری بات سمجھ گیا ہوں" ــــ برکیارق نے کہا ــــ "تم یہ بتاؤ کہ تنہائی میں کہاں اور کس وقت مل سکو گی؟"

"رات کو میرا بھائی بڑی ہی گہری نیند سویا کرتا ہے" ــــ روزینہ نے کہا ــــ "اس کے سر پر ڈھول بجتے رہیں' اس کی آنکھ نہیں کھلتی۔ سرائے کے پچھواڑے بڑا خوبصورت باغ ہے۔ آپ نے دیکھا ہو گا درخت بے شمار ہیں۔ آپ آدھی رات کے وقت یہاں آجائیں۔ میں آپ کے ساتھ باغ تک چلی چلوں گی"۔

"میں آج رات باغ میں آجاؤں گا" ــــ برکیارق نے کہا ــــ "آدھی رات کے وقت آؤں گا اور تمہارا انتظار کروں گا"۔

برکیارق تو جیسے بھول ہی گیا تھا کہ وہ اتنی بڑی سلطنت کے سلطان کا بیٹا ہے۔ اس نے یہ بھی دیکھ لیا تھا کہ روزینہ صرف خوبصورت ہی نہیں' اس میں خود اعتمادی اور جرأت بھی ہے۔ ان اوصاف نے روزینہ کے حسن کو دوبالا کر دیا تھا۔ کچھ دیر پہلے برکیارق اس سے محبت کی بھیک مانگ رہا تھا۔ یہ لڑکی اس پر طلسم ہوشربا بن کر غالب آگئی تھی اور برکیارق یوں محسوس کر رہا تھا جیسے اس پر کوئی نشہ طاری ہو گیا ہو۔

درویش آگیا۔ وہ خاصا وقت لگا کر آیا تھا لیکن برکیارق نے یوں محسوس کیا جیسے وہ صرف ایک لمحہ باہر رہا ہو۔ اس نے برکیارق کا شکریہ ادا کیا کہ اس کی غیر حاضری میں وہ اس کی بہن کے پاس بیٹھا رہا تھا۔

برکیارق وہاں سے اٹھنا ہی نہ چاہتا تھا لیکن اسے اٹھنا پڑا۔ وہ اٹھا اور قدم گھسیٹنے کے انداز سے چلتا کمرے سے باہر نکل آیا۔

⊙

اُس روز برکیارق دن بھر کے کام کاج بھول گیا تھا۔ وہ سرائے سے سیدھا اپنے گھر

گیا۔ اس نے باپ کو جا کر دیکھا۔ باپ جاگ اٹھا تھا۔ وہ باپ کے پاس بیٹھ گیا۔

"برکیارق بیٹا!" ــــ سلطان ملک شاہ نے بڑی ہی نحیف آواز میں کہا ــــ "میری زندگی کا اب کوئی بھروسہ نہیں۔ اس حقیقت کو قبول کر لو کہ میں دو چار دنوں کا ہی مہمان ہوں۔ سلطنت کی ساری ذمہ داریاں تمہارے کندھوں پر آ رہی ہیں۔ تم نے صرف اتنی بڑی اسلامی سلطنت کو ہی نہیں سنبھالنا بلکہ اسلام کی پاسبانی بھی کرنی ہے اور اولیت دینِ اسلام کو دینا....."

"اتنی مایوسی؟" ــــ برکیارق نے سلطان ملک شاہ سے کہا ــــ "ابھی تو اللہ نے آپ سے بہت کام لینے ہیں۔ خدا کے لئے اس مایوسی کو اپنے ذہن سے جھٹک ڈالیں۔ میں نے طبیب سے پوچھا ہے۔ وہ کہتا ہے سلطان کو کوئی جسمانی مرض لاحق نہیں۔ انہوں نے اپنے ذہن اور دل پر خود ہی بوجھ ڈال لیا ہے..... اب آپ میری ایک بات غور سے سنیں۔ میں آپ کا روحانی علاج کرانا چاہتا ہوں"۔

"میں خود روحانیت کا قائل ہوں" ــــ سلطان ملک شاہ نے کہا ــــ "لیکن مجھے کوئی علمِ روحانیت کا عالم نظر نہیں آتا"۔

"مجھے ایک عالم اور روحانی علاج کا ماہر نظر آگیا ہے" ــــ برکیارق نے کہا ــــ "اس نے یہی بتایا ہے کہ آپ کو کوئی جسمانی عارضہ لاحق نہیں۔ آپ پر کوئی عمل کیا گیا ہے۔ یہ تو آپ جانتے ہیں کہ یہ عمل کس نے کیا ہو گا..... حسن بن صباح کے سوا اور کوئی نہیں ہو سکتا..... اس عالم نے مجھے بتایا ہے کہ آپ نے بڑی لمبی عمر پائی ہے"۔

برکیارق نے سلطان ملک شاہ کو وہ ساری باتیں سنائیں جو درویش نے اس کے ساتھ کی تھیں۔ جوں جوں وہ درویش کی باتیں سنتا جا رہا تھا' اس کے مُرجھائے ہوئے چہرے پر رونق عود کرتی آ رہی تھی۔ طبیب نے اسے کئی بار بتایا تھا کہ وہ ذہنی طور پر بیدار ہو جائے اور یقین کر لے کہ وہ کسی جسمانی مرض میں مبتلا نہیں۔ طبیب نے اسے الگ الگ کر کے بتایا تھا کہ اس کے ذہن پر کون کون سی باتیں اثر انداز ہو رہی ہیں اور اس کا علاج یہ نہیں کہ انسان ہتھیار ڈال کر لیٹ ہی جائے اور اپنے آپ کو مُردہ سمجھ لے لیکن سلطان ملک شاہ طبیب کی کسی بات کو قبول نہیں کرتا تھا۔ وہ اس کی صرف دوائیاں قبول کر رہا تھا۔ اس کے اپنے بڑے بیٹے برکیارق نے اس درویش کا تفصیلی ذکر کیا تو وہ فوراً مان گیا اور اس نے بیٹے سے کہا کہ وہ اس درویش کو ساتھ لے آئے۔

برکیارق اٹھ دوڑا۔ اسے اپنے باپ کی صحت کے ساتھ تو دلچسپی تھی ہی، لیکن اس
سے زیادہ دلچسپی روزینہ کے ساتھ تھی۔ وہ یہ سوچ کر سرائے کی طرف جا رہا تھا کہ
درویش سے کہے گا کہ روزینہ کو کمرے میں اکیلی نہ چھوڑے اور اسے اپنے ساتھ لے
چلے۔

ایسے ہی ہُوا جیسا اس نے سوچا تھا۔ وہ درویش کو شاہی بگھی میں بٹھا کر لے آیا۔
روزینہ بھی اس کے ساتھ تھی۔ اپنے محل جیسے گھر میں آکر برکیارق نے روزینہ کو اپنی
ماں اور بہنوں کے پاس بھیج دیا اور درویش کو اپنے باپ کے پاس لے گیا۔

درویش نے سلطان ملک شاہ کو اپنے سامنے بٹھالیا اور اس کی آنکھوں میں جھانکنے
لگا۔ وہ کچھ بڑبڑا رہا تھا۔ اس نے آنکھیں بند کرلیں اور مراقبے میں چلا گیا۔ اس دوران
تسبیح جو اس کے ہاتھ میں تھی اس کے دانے وہ انگلیوں سے آگے چلاتا رہا۔ تھوڑی دیر
بعد اس نے آنکھیں کھولیں اور تسبیح کے دانوں کو دیکھنے لگا پھر اس نے تسبیح الگ رکھ دی
اور سلطان ملک شاہ کے چہرے کو غور سے دیکھنے لگا۔

"قابلِ صد احترام سلطان!" — درویش نے کہا — "بات وہی نکلی ہے جو میں
پہلے ہی دیکھ چکا تھا۔ دشمن نے گھر بیٹھے وار کیا ہے۔ اس محل کے احاطے کے اندر کہیں
نہ کہیں کالی بلّی کا سر دفن ہو گا۔ میں ابھی یہ نہیں بتا سکتا کہ وہ سر کہاں دفن کیا گیا ہے۔ یہ
بعد کی بات ہے۔ میں وہ سر نکال کر آپ کو دکھادوں گا۔ فوری طور پر کرنے والا کام یہ ہے
کہ آپ پر اس سفلی عمل کے جو اثرات ہیں وہ اُتر جائیں اور آپ کا دماغ پہلے کی طرح
کام کرنے لگے"۔

"آپ یہ علاج کس طرح کریں گے؟" — سلطان ملک شاہ نے پوچھا — "کیا
مجھے بھی کچھ کرنا پڑے گا؟"

"میں آپ سے نماز پڑھواؤں گا" — درویش نے کہا — "ایک وظیفہ بتاؤں گا جو
آپ نے ہر نماز کے بعد کرنا ہو گا۔ باقی سارا کام میں خود کروں گا۔ میں نے دیکھ لیا ہے کہ
مجھے کیا عمل کرنا ہے۔ آپ سات دنوں بعد پہلے کی طرح ترو تازہ ہو جائیں گے"۔

"ایک اور بات بتائیں" — سلطان ملک شاہ نے پوچھا — "کیا آپ کے پاس کوئی
ایسا عمل یا وظیفہ ہے جو کیا جائے تو طاقتور دشمن بھی زیر ہو جائے؟"

"بہت کچھ ہو سکتا ہے" — درویش نے کہا — "لیکن ایک سے زیادہ کام ایک

ہی بار شروع نہیں ہوں گے۔ سب سے پہلے تو آپ کو زندگی کے راستے پر رواں کرنا ہے
جیسا کہ آپ پہلے ہُوا کرتے تھے۔ اس کے بعد اگلا کام ہو گا"۔

داستان گو جس دَور کی داستان سنا رہا ہے اُس دور میں انسانی فطرت کی کمزوریاں
عروج پر پہنچی ہوئی تھیں۔ یوں کہیں تو زیادہ صحیح ہو گا کہ انسان کی فطرت میں کمزوریاں تو
ہر وقت رہی ہیں لیکن حسن بن صباح کی ابلیسی فطرت نے ان کمزوریوں کو اس طرح
ابھارا اور لوگوں کو یقین دلادیا کہ یہی کمزوریاں ان کی خوبیاں ہیں جنہیں اللہ زیادہ پسند کرتا
ہے۔ اِدھر حسن بن صباح تھا اور اُدھر سُلطان ملک شاہ کو ایک روحانی عامل مل گیا۔ اُس
سلطان کی اپنی فطری کمزوریاں تھیں۔ یہی وہ شخص تھا جو جنگی قوت سے یا کسی بھی طریقے
سے ابلیسیّت کے اس طوفان کو اور اس سیلاب کو روک سکتا تھا اور روکنے کی پوری
پوری کوشش کر بھی رہا تھا۔ اس کی فطرت کی کمزوریاں ابھریں تو اس نے اپنے آپ کو
ایک ایسے شخص کے حوالے کر دیا جو یہ دعویٰ کرتا تھا کہ وہ پردوں کے پیچھے کی باتیں بتا
سکتا ہے۔ چاہئے تو یہ تھا کہ سلطان پہلے یہ دیکھتا کہ یہ شخص ہے کون اور کیا اس میں اتنی
بڑی طاقت ہے بھی یا نہیں کہ یہ غیب کی باتیں بتا سکے۔

اِدھر اس کے بڑے بیٹے برکیارق میں ایک فطری کمزوری ایک حسین اور نوجوان
لڑکی نے ابھار دی۔ وہ جو کہتا تھا کہ اس نے لڑکیوں میں کبھی دلچسپی نہیں لی، اس نے اس
لڑکی کو اپنے اعصاب بلکہ اپنی عقل پر غالب کر لیا۔ یہ ذمہ داری برکیارق کی تھی کہ وہ
پہلے دیکھ لیتا کہ اس درویش کے پاس کوئی علم یا کسی عمل کی کوئی طاقت ہے بھی یا نہیں یا
یہ سلطان کو خوش کر کے انعام و اکرام حاصل کرنے کے چکر میں ہے۔

اُس وقت ضرورت یہ تھی کہ سُلطان ملک شاہ کو بیدار کیا جاتا اور اُس کی جو ذمہ
داریاں تھیں وہ اس کے آگے رکھی جاتیں اور اسے کہا جاتا کہ ان ذمہ داریوں کو نبھانے
کے لئے تیار ہو جاؤ اور میدانِ عمل میں کود پڑو۔

یہاں تک تو بات بالکل ٹھیک تھی کہ اس درویش نے اسے کہا تھا کہ وہ نماز باقاعدگی
سے پڑھے اور ایک وظیفہ بھی کرے۔ سلطان ملک شاہ ویسے بھی عبادت کا قائل تھا اور
صوم و صلوٰۃ کا پابند بھی تھا لیکن درویش نے اسے یہ جو کہا تھا کہ باقی عمل وہ خود کرے گا تو
اس کا مطلب یہ تھا کہ سلطان کے ہاتھ میں روحانیت کی لاٹھی دے دی گئی تھی کہ وہ اس
کے سہارے چلے گا۔ یہ درویش بھی مخلص ہو سکتا تھا اور اس کی بہن روزینہ بھی سچے دل

سے برکیارق کے ساتھ محبت کر سکتی تھی لیکن اس وقت کی صورتِ حال ایسی تھی کہ سلطان کو خود بھی اور اس کے بیٹوں کو بھی بیدار اور ذہنی طور پر چوکس رہنا تھا اور ہر وقت اللہ سے مدد مانگنی تھی۔

"سلطانِ عالی مقام!" ـــ درویش نے کہا ـــ "میں نے غیب کے پردے اٹھا کر دیکھ لیا ہے۔ حسن بن صباح نے جو سِفلی عمل آپ پر کروایا ہے وہ اُلٹا ہو کر اُسی پر جا پڑے گا۔ اس کی وہی حالت ہو جائے گی جو آپ کی ہو رہی تھی۔ میں آپ کو یہ بھی بتا دیتا ہوں کہ جب کسی کا کیا ہُوا عمل اُلٹا ہو کر اس پر جاتا ہے تو بہت ہی زیادہ نقصان کرتا ہے۔ میں ابھی یقین سے تو نہیں کہہ سکتا لیکن دھندلی سی ایک بات ہے جو میں آپ کو بتا دیتا ہوں۔ امکان موجود ہے کہ حسن بن صباح اس اثر کو برداشت ہی نہ کر سکے اور مر جائے۔ وہ مر گیا تو اس نے جو فتنہ کھڑا کیا اور اسے پھیلایا ہے' وہ خود ہی ختم ہو جائے گا۔ میں آپ کو باداموں کی سات گریاں اور سات ہی چھوہارے دوں گا۔ آپ نے یوں کرنا ہے کہ بادام کی ایک گری ہر صبح نہار منہ کھا لینی ہے اور رات سونے سے پہلے ایک چھوہارا کھانا ہے۔ یہ خیال رکھیں کہ بادام کی گری اور چھوہارا بہت دیر چباتے رہنا ہے اور جب یہ لعاب کی صورت اختیار کر لے تو نگل لینا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ ان سات دنوں میں آپ یوں محسوس کریں جیسے آپ کی تکلیف بڑھ گئی ہے تو پریشان نہیں ہونا۔ آٹھویں روز آپ اچھل کر پلنگ سے اٹھیں گے اور زندگی کے اُس راستے پر چل پڑیں گے جو خدا' نے آپ کو دکھایا ہے"۔

درویش نے اپنے تھیلے میں سے باداموں کی سات گریاں اور سات چھوہارے نکالے اور سلطان ملک شاہ کے ہاتھ میں دے دیے۔

"یہ الگ رکھ دیں" ـــ درویش نے کہا ـــ "میں نے ان پر اپنا عمل کر دیا ہے۔ اس عمل کے لئے میں گذشتہ رات سویا بھی نہیں۔ یہ رات بھر کا عمل تھا"۔

درویش نے اپنے مخصوص انداز سے باتیں شروع کر دیں۔ ان باتوں میں امید کی چمکتی ہوئی کرنیں تھیں اور یہ کرنیں دلفریب رنگوں والی تھیں جن میں سلطان ملک شاہ کو مستقبل دَرخشاں نظر آ رہا تھا۔ درویش کی باتیں جو تھیں وہ اپنی جگہ پُراثر تھیں لیکن درویش کے بولنے کا جو انداز تھا' اصل اثر تو اس کا تھا۔ یہ اثر ایسا تھا جیسے کسی کو ہپناٹائز کیا جا رہا ہو۔ یہ اثرات سلطان ملک شاہ کے چہرے پر صاف نظر آنے لگے تھے۔ اس کی

آنکھوں میں چمک آتی جا رہی تھی اور اس کا چہرہ جو زردی مائل ہو گیا تھا' اپنے قدرتی رنگ میں نظر آنے لگا تھا۔

سلطان مکمل طور پر بلکہ کچھ غیر قدرتی طور پر بیدار ہو گیا اور اس نے درویش سے اس کے متعلق کچھ ذاتی سوالات پوچھنے شروع کر دیے۔ درویش نے سلطان کو وہی باتیں بتائیں جو وہ برکیارق کو بتا چکا تھا۔

"سلطانِ عالی مقام!" ـــ درویش نے کہا ـــ "میرے سر پر صرف ایک ذمہ داری ہے جس سے میں فارغ ہو گیا تو باقی عمر خانۂ کعبہ میں اللہ اللہ کرتے گزار دوں گا..... میرے ساتھ میری چھوٹی بہن ہے۔ میں اس کی شادی کسی ایسے آدمی کے ساتھ کرانا چاہتا ہوں جو مخلص اور دردمند ہو اور صحیح معنوں میں مسلمان ہی نہ ہو بلکہ مردِ مومن ہو"۔

"تمہاری بہن کہاں ہے؟" ـــ سلطان نے پوچھا۔

"میرے ساتھ ہے" ـــ درویش نے جواب دیا ـــ "اسے اپنے ساتھ لایا ہوں۔ میں اسے اکیلی نہیں چھوڑتا"۔

"پدرِ محترم!" ـــ برکیارق بولا ـــ "میں نے ان کی بہن کو دیکھا ہے۔ اتفاق ایسا ہُوا کہ مجھے اس کے پاس کچھ دیر بیٹھنا پڑا۔ میں نے اس کے ساتھ باتیں کیں تو میں نے محسوس کیا کہ ان کی بہن صرف خوبصورت ہی نہیں بلکہ ان میں عقل بھی ہے اور فہم و فراست بھی ہے۔ اگر آپ اجازت دیں گے تو میں ان کی بہن کے ساتھ شادی کر لوں گا"۔

"لڑکی کو یہاں لاؤ" ـــ سلطان ملک شاہ نے کہا۔

لڑکی آ گئی۔ اس کے ساتھ برکیارق کی ماں بھی تھی۔ سلطان ملک شاہ پر درویش نے ایسا تاثر پیدا کر دیا تھا کہ اس نے کچھ زیادہ سوچنے اور سمجھنے کی ضرورت ہی محسوس نہ کی۔ اس نے لڑکی کو سر سے پاؤں تک غور سے دیکھا' ایک دو رسمی سی باتیں کیں۔ لڑکی نے ان باتوں کے معقول جواب دیے۔

"برکیارق!" ـــ سلطان ملک شاہ نے ایسے لہجے میں کہا جیسے کوئی فرمان جاری کر رہا ہو ـــ "تم اس لڑکی کے ساتھ شادی کرو گے"۔

برکیارق کی ماں بھی اس لڑکی سے متاثر ہو گئی تھی۔ اس نے خندہ پیشانی سے اپنے

خاوند کے فرمان کی تائید کردی۔

"نہیں سلطانِ عالی مقام!" —— درویش نے ہاتھ جوڑ کر کہا —— "میں اس قابل نہیں ہوں کہ اتنی اونچی پرواز کی توقع رکھوں۔ فیصلہ سوچ سمجھ کر کریں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ اس محل میں میری بہن کو یہ طعنے ملنے شروع ہو جائیں کہ تُو ایک بے گھر اور بے ٹھکانہ درویش کی بہن ہے"۔

"میں نے فیصلہ دے دیا ہے" —— سلطان نے کہا —— "یہ اسلام کے شیدائیوں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عاشقوں کا خاندان ہے۔ یہاں لڑکی کو سر آنکھوں پر بٹھایا جائے گا۔ جو خدشہ تم نے ظاہر کیا ہے وہ ان دیواروں کے اندر ایک گناہِ کبیرہ سمجھا جاتا ہے"۔

"سلطان!" —— برکیارق کی ماں نے کہا —— "آپ پہلے صحت یاب ہو لیں۔ جونہی آپ اٹھ کر باہر نکلیں گے، برکیارق کی شادی اس لڑکی کے ساتھ کردی جائے گی"۔

برکیارق کی ماں تو بہت ہی خوش تھی کیونکہ وہ سلطان کے چہرے پر تندرستی اور بشاشت کے آثار دیکھ رہی تھی۔ وہ بھی درویش سے متاثر ہوئی اور اس نے انعام و اکرام کا اشارہ کیا لیکن درویش نے اسے یہ کہہ کر روک دیا کہ وہ کسی انعام کے لالچ میں سلطان کو زندگی کی گہما گہمی میں واپس نہیں لا رہا بلکہ ایک سچے مسلمان کی حیثیت سے اپنا فرض ادا کر رہا ہے۔

کچھ دیر بعد درویش روزینہ کو ساتھ لے کر رخصت ہو گیا۔

○

سلطان ملک شاہ کا معمول بن گیا کہ صبح جاگتا تو پہلا کام یہ کرتا کہ درویش کی دی ہوئی بادام کی ایک گری منہ میں ڈال کر چبانے لگتا۔ اس کے بعد وہ نہا کر نماز پڑھتا اور پھر درویش کا بتایا ہُوا وظیفہ کرنے لگتا۔ عشاء کی نماز کے بعد بھی وہ وظیفہ کرتا اور اس کے بعد ایک چھوہارا منہ میں ڈال کر چبانے لگتا۔

برکیارق ہر روز روزینہ سے ملنے چلا جاتا تھا۔ روزینہ نے اسے کہا تھا کہ وہ اسے سرائے کے پچھواڑے والے باغ میں آدھی رات کے وقت ملا کرے گا لیکن اب اس احتیاط اور خفیہ ملاقات کی ضرورت نہیں رہی تھی کیونکہ چند دنوں بعد برکیارق اور روزینہ نے میاں بیوی بن جانا تھا۔ برکیارق سرائے میں درویش کے کمرے میں چلا جاتا

اور درویش کسی نہ کسی بہانے سے باہر نکل جاتا۔ روزینہ اس پر ایک بڑے ہی حسین طلسم کی طرح طاری ہو جاتی اور برکیارق خود فراموشی کی کیفیت میں گم ہو جاتا۔

درویش ہر روز کچھ دیر کے لئے سلطان کے پاس جا بیٹھتا، اس کی آنکھوں میں جھانکتا اور پھر آنکھوں میں پھونکیں مار کر کچھ باتیں کرتا اور وہاں سے چلا آتا۔

پانچواں یا چھٹا روز تھا کہ سلطان نے اپنے سینے میں بے چینی سی محسوس کرنی شروع کردی۔ اس نے کہا کہ درویش کو فوراً بلایا جائے۔ کچھ دیر بعد درویش آگیا۔ اس کے آنے تک سلطان ملک شاہ کی یہ حالت ہو گئی تھی کہ سینے کی بے چینی بڑھ گئی اور ایسی ہی بے چینی کھوپڑی کے اندر دماغ میں بھی شروع ہو گئی تھی۔

"ایسا ہونا تھا" —— درویش نے کہا —— "یہ تکلیف برداشت کریں۔ کل اس وقت تک یہ تکلیف کم ہونے لگے گی اور اس کے بعد آپ بالکل قدرتی حالت میں آجائیں گے"۔

وہ دن اور وہ رات سلطان ملک شاہ سو بھی نہ سکا۔ اگلی صبح اس نے اپنی سانسیں رُکتی ہوئی محسوس کیں۔ اس نے ایک بار پھر درویش کو بلایا۔ درویش نے آکر پھر کل جیسی تسلیاں دیں اور مسرت کا اظہار کیا کہ جو عمل سلطان پر کیا گیا تھا وہ نکل رہا ہے اور یہ اس کے اثرات ہیں۔

اگلے روز سلطان نے صبح اٹھ کر بادام کی آخری گری کھائی۔ سارا دن تڑپتے گزرا اور سورج غروب ہو گیا۔ سلطان نے کہا کہ درویش کو بلاؤ اور اسے کہو کہ آج کی رات وہ اُس کے ساتھ گزارے۔ تکلیف اُس کی برداشت سے باہر ہوئی جا رہی تھی۔

مزمل آفندی بہت دنوں سے سلطان کو نہیں دیکھ سکا تھا۔ اسے یہی بتایا جاتا رہا کہ طبیب نے اور اب درویش نے سختی سے کہا ہے کہ سلطان کے پاس کوئی ملاقاتی نہ آئے۔ اس شام جب سلطان کی تکلیف بہت ہی بڑھ گئی تھی، مزمل بیتاب سا ہو گیا اور سلطان کو دیکھنے چلا گیا۔ برکیارق سے تو اس کی ملاقات ہر روز ہی ہوتی تھی اور برکیارق اسے بتاتا رہتا تھا کہ درویش نے کیا کہا ہے اور سلطان کی حالت کیا ہے لیکن اُس شام وہ اس قدر بے چین ہُوا کہ وہ سلطان کے محل میں چلا گیا۔ اسے برکیارق ملا۔ مزمل نے برکیارق سے کہا کہ وہ سلطان کو دیکھنا چاہتا ہے۔ اس نے ایسی بیتابی کا اظہار کیا کہ برکیارق اسے سلطان کے کمرے میں لے ہی گیا۔

وہ سلطان کے کمرے میں داخل ہُوا تو دیکھا کہ سلطان پلنگ پر لیٹا ہوا اپنے سینے پر ہاتھ پھیر رہا تھا اور اس کے چہرے کا رنگ لاش کی طرح سفید تھا۔ مزمل تو سلطان ملک شاہ کا مرید تھا اور سلطان کو بھی مزمل سے بہت پیار تھا۔ مزمل کی نظر درویش کے چہرے پر پڑی جو قریب ہی بیٹھا ہُوا تھا۔ اس کا چہرہ دیکھتے ہی مزمل کو دھچکا سا لگا جیسے اس کے پاؤں فرش سے اکھڑ رہے ہوں..... مزمل نے درویش کی آنکھ کے قریب گال کی ابھری ہوئی ہڈی پر کالا تِل دیکھا جو مٹر کے دانے کے برابر تھا۔

ایسے تِل والا آدمی اسے گھوڑ دوڑ کے میدان میں ملا تھا اور مزمّل نے اسے پہچاننے کی کوشش کی تھی اور اسے کہا بھی تھا کہ وہ کہیں مل چکے ہیں۔ مزمّل کو یاد آیا کہ اس تِل والے آدمی کی داڑھی بڑے سلیقے سے تراشی ہوئی اور چھوٹی چھوٹی تھی اور وہ جوان تھا لیکن اس درویش کی داڑھی لمبی اور خشخشی تھی اور اس کی عمر کا اندازہ چالیس سال کے لگ بھگ تھا۔ اچانک مزمل کو یاد آگیا کہ اس نے اس تل والا آدمی خلجان میں دیکھا تھا اور یہ آدمی اس کے ساتھ المُوت تک گیا تھا۔ اب اسے خیال آیا کہ یہ تو حسن بن صباح کا آدمی ہے۔

مزمل کی کھوپڑی کے اندر جیسے دھماکہ ہُوا ہو۔ اس نے کچھ سوچے بغیر لپک کر بلکہ جھپٹ کر اپنا ہاتھ درویش کی لمبی داڑھی پر رکھا اور زور سے جھٹکا دیا۔ لمبی داڑھی مزمل کے ہاتھ میں آگئی اور درویش کے چہرے پر چھوٹی چھوٹی کالی داڑھی رہ گئی۔ یہ وہ آدمی تھا جو اسے خلجان میں ملا تھا اور المُوت تک اس کے ساتھ گیا تھا اور یہی آدمی اسے گھوڑ دوڑ کے میدان میں ملا تھا۔ مزمل نے اس کی پگڑی اتار دی۔ دیکھا کہ اس کے لمبے بال جو اس کے کندھوں تک پہنچتے تھے مصنوعی تھے۔ سلطان چونک کر اٹھ بیٹھا۔ برکیارق کھڑا ہو گیا۔

"سلطانِ محترم!" — مزمل آفندی نے کہا — "اس شخص نے آپ کو باداموں کی گریوں اور چھوہاروں میں زہر کھلا دیا ہے..... فوراً" طبیب کو بلائیں"۔

سلطان کی تلوار دیوار کے ساتھ لٹک رہی تھی۔ مزمل نے لپک کر وہ تلوار نیام سے نکالی اور اس کی نوک درویش کی شہ رگ پر رکھ دی۔

"سچ بتاؤ تم کون ہو؟" — مزمل نے پوچھا — "اور تمہارے ساتھ جو لڑکی ہے وہ کون ہے؟..... وہ تمہاری بہن نہیں..... اور تم حسن بن صباح کے بھیجے ہوئے آدمی ہو"۔

"میرے دوست!" — درویش نے مسکرا کر کہا — "تم مجھے قتل کر سکتے ہو۔ میں نے اپنا کام کر دیا ہے۔ یہ لڑکی جو میرے ساتھ ہے' اسے مشکوک یا مجرم نہ سمجھنا۔ یہ میری بہن ہے۔ یہ میری خفیہ زندگی سے لاعلم ہے۔ میں سلطان کا قاتل ہوں اس لئے میں اس حق سے محروم ہو گیا ہوں کہ سلطان سے درخواست کروں کہ میری بہن کو پناہ دی جائے اور میرے جرم کی سزا اسے نہ دی جائے"۔

سلطان ملک شاہ نے سنا کہ اس شخص نے درویشی کے بہروپ میں اسے زہر دے دیا ہے تو اسے موت سر پر کھڑی نظر آنے لگی۔

"او ظالم انسان!" — سلطان نے اس جعلی درویش سے کہا — "اگر تُو اس زہر کا اثر اتار دے تو میں تیرا یہ جرم معاف کر کے عزت سے رخصت کروں گا اور تیری بہن کی شادی اپنے بیٹے کے ساتھ کر دوں گا..... اور جو انعام مانگو گے دوں گا"۔

"نہیں بدنصیب سلطان!" — اس شخص نے کہا — "اس زہر کا کوئی تریاق نہیں جو میں نے باداموں اور چھوہاروں میں ملا کر آپ کو دیا ہے۔ مجھے مرنے کا ذرا سا بھی غم نہیں۔ مجھے انعام نہیں چاہئے۔ میں امام حسن بن صباح کا فدائی ہوں۔ میرے لئے یہی انعام کافی ہے کہ میں نے امام کی خوشنودی حاصل کر لی ہے اور میں سیدھا جنّت میں جا رہا ہوں۔ امام نے مجھے جس کام کے لئے بھیجا تھا' وہ میں نے کر دیا ہے"۔

طبیب آگیا تھا۔ اُس نے سلطان کی نبض دیکھی' ایک دوائی بھی دی لیکن اُس کے چہرے پر مایوسی کا جو تاثر آگیا تھا اسے وہ چھپا نہ سکا۔

برکیارق کی ماں اور روزینہ بھی سلطان کے کمرے میں آگئی تھیں۔ ماں نے تو رونا اور چلّانا شروع کر دیا تھا۔ برکیارق کے دونوں بھائی' محمد اور سنجر' بھی وہاں موجود تھے۔

"سلطان محترم!" — مزمل آفندی نے کہا — "اس شخص کو میرے حوالے کر دیا جائے۔ اسے میں اپنے ہاتھوں قتل کروں گا"۔

"اسے لے جاؤ" — سلطان نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا — "اسے کمر تک زمین میں گاڑ کر اس پر خونخوار کُتے چھوڑ دو..... اور ایک قبر کھود کر اس کی بہن کو زندہ دفن کر دو"۔

روزینہ نے خوفزدہ نظروں سے برکیارق کو دیکھا۔ برکیارق روزینہ کے آگے جا کھڑا

ہُوا۔

"نہیں!" — اُس نے کہا — "بے گناہ کو سزا نہیں ملے گی"۔

"بیوقوف نہ بنو برکیارق!" — مزمل نے کہا — "یہ ناگن ہے جسے تم اپنی پناہ میں لے رہے ہو"۔

"خبردار!" — برکیارق نے کہا — "اس لڑکی کے قریب نہ آنا' اور سب یہ بھی سوچ لو کہ سلطان زندہ نہ رہے تو میں ان کا جانشین ہوں۔ میں سلطان ہوں۔ اب میرا حکم چلے گا" — اس نے حسن بن صباح کے فدائی کی طرف اشارہ کر کے کہا — "اسے اسی طرح ہلاک کیا جائے جس طرح سلطانِ معظّم نے حکم دیا ہے"۔

یہ ہنگامہ جاری ہی تھا کہ سلطان ملک شاہ نے آخری ہچکی لی اور فوت ہو گیا۔

جعلی درویش کو قید خانے میں بھیج دیا گیا۔ اسے اگلے روز کتوں سے مروانا تھا۔

اب برکیارق سلطنتِ سلجوقیہ کا سلطان تھا۔

یہ دوسری بڑی شخصیت تھی جسے حسن بن صباح نے نظام الملک کے بعد قتل کروایا۔